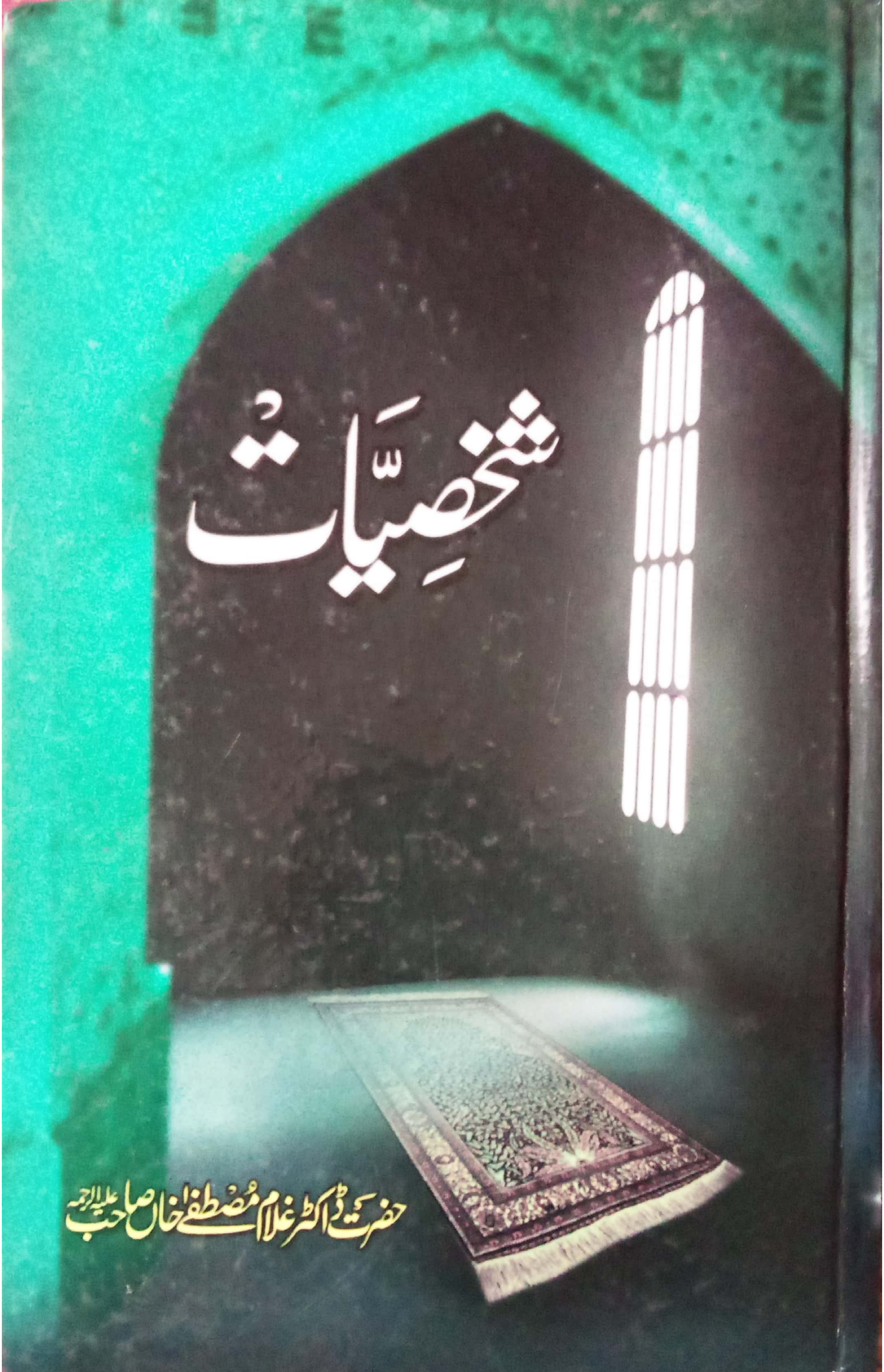


شخصیات

حضرت ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب علیہ الرحمہ

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ۝

شخصیات

مولف

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاںؒ

مرتب

سید عزیز الرحمٰن

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز
ناظم آباد نمبر ۴، کراچی ۔ پوسٹ کوڈ: ۷۴۶۰۰ ۔ فون: ۶۶۸۴۷۹۰
E-mail:sarahman@rahet.org

نام کتاب:	شخصیات
مؤلف:	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاںؒ
مرتب:	سید عزیز الرحمٰن
صفحات:	۳۰۴
تعداد:	گیارہ سو
اشاعت اول:	صفر المظفر ۱۴۳۰ھ۔ فروری ۲۰۰۹ء
قیمت:	۲۲۰ روپے

تقسیم کنندہ

خواجہ حسن ناصر: ڈی۔۱۰۷۔ فرحان ٹاور۔ گلستان جوہر، فون ۲۹۲۳۲۲۹۔۰۳۰۱

﴿ملنے کے پتے﴾

دارالاشاعت	:	اردو بازار، کراچی
فضلی بک سپر مارکیٹ	:	اردو بازار، کراچی، فون: ۲۲۱۲۹۹۱
مکتبۃ الانور	:	بنوری ٹاؤن، کراچی
اسلامی کتب خانہ	:	بنوری ٹاؤن، کراچی، فون ۴۹۲۷۱۵۹
بیت الکتب	:	نزد جامعہ اشرف المدارس۔ گلشن اقبال کراچی
کتاب سرائے	:	فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۳۲۰۳۱۸
ادارۂ اسلامیات	:	۱۹۰، انارکلی۔ لاہور، فون: ۷۲۴۳۹۹۱، ۷۳۵۳۲۵۵
مکتبہ مجیدیہ	:	بیرون بوہڑ گیٹ۔ ملتان

ناشر

زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز

اے۔۴/۱۷، ناظم آباد نمبر۴، کراچی۔ پوسٹ کوڈ: ۷۴۶۰۰۔ فون: ۶۶۸۴۷۹۰

E-meal:sarahman@rahet.org

فہرست

پیش گفتار

حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ رحمہ اللہ کی شخصیت کثیر الجہت تھی۔ مگر آپ کی تین جہتیں بہت نمایاں ہیں۔ آپ ایک صوفی بزرگ تھے اور نقشبندی سلسلے کے شیخ طریقت تھے۔ آپ ایک اردو ادب کے نہایت اہم محقق و نقاد تھے۔ اور آپ کا چھوڑا ہوا ذخیرہ مذہبی حوالے سے بھی نہایت اہم ہے۔ ان تینوں پہلوؤں سے آپ کی خدمات اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ پھر آپ اس حوالے سے بھی نہایت خوش قسمت رہے کہ آپ کی حیات وخدمات پر کئی کتب گزشتہ تین برسوں میں سامنے آچکی ہیں۔ مثلاً

۱۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، حالات، علمی و ادبی خدمات: ڈاکٹر مسرور احمد زئی، ۹۳۶ص۔ حیدر آباد

۲۔ عصر حاضر کے غلام مصطفیٰ، شخصیت، کردار اور تعلیمات: مرتب محمد موسیٰ بھٹو، ۲۴۷ص۔ حیدر آباد

۳۔ گوہر آب دار: مرتبہ ڈاکٹر آفتاب احمد خاں، ۱۲۰ص۔ حیدر آباد

۴۔ میرے حضرت صاحب: ڈاکٹر اقبال علی، ۱۵۰ص۔ کراچی

۵۔ فیض روحانی: حبیب مصطفائی، ۱۶۰ص۔ حیدز آباد

آپ کی یہ بھی خوش قسمتی رہی کہ آپ کی تحریریں وقتاً فوقتاً رسائل میں اور کتب کی صورت میں شائع ہوتی رہیں۔ آپ کی تحریروں کے مختلف مجموعے ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن ان مجموعوں میں آپ کی ہر طرح کی تحریریں شامل ہیں، جو موضوعاتی تقسیم کے بغیر شائع ہوئی ہیں، پھر چوں کہ یہ مجموعے مختلف اداروں سے مختلف اوقات میں شائع ہوئے ہیں، اس لئے

ان میں خاصی تکرار بھی موجود ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ان مجموعوں میں سے زیادہ تر اب دست یاب بھی نہیں ہیں۔ اس بنا پر عرصے سے راقم کا خیال تھا کہ آپ کی مستقل بالذات کتب کو چھوڑ کر ان مجموعہ ہائے مضامین کو از سر نو مرتب کیا جائے، اور آپ کے علمی، دینی، تحقیقی، تنقیدی اور شخصی مضامین کو علیحدہ علیحدہ جلدوں میں مرتب کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں راقم نے ڈاکٹر صاحب کی حیات ہی میں ان سے دینی مقالات کو یک جا مرتب کرنے کی اجازت لی تھی، جو آپ نے بہ خوشی مرحمت فرما دی تھی، اور راقم کی درخواست پر اس کا عنوان بھی ''دینی مقالات'' تجویز فرمایا تھا۔ مگر جب کام آگے بڑھا تو اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے بہت سے مقالات اب بھی رسائل کی فائلوں میں موجود ہیں، جنھیں تلاش کرنا ضروری ہے، اس لئے آپ کے دینی مقالات پر کام ابھی جاری ہے۔

راقم سر دست ڈاکٹر صاحب کے وہ مضامین ''شخصیات'' کے عنوان سے پیش کر رہا ہے، جو آپ نے مختلف اوقات میں مختلف شخصیات کے حوالے سے تحریر فرمائے ہیں، اور جن میں سے اکثر مختلف مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ شخصیات پر آپ کے قلم سے نکلنے والے تمام مضامین کو اس مجموعے کا حصہ بنا دیا جائے، کوئی مضمون اگر مرتب کی نظر سے نہیں گزر سکا ہو تو قارئین سے التماس ہے کہ اس سلسلے میں مرتب کی رہنمائی فرمائیں۔

اس مجموعے کی ترتیب مرتب کی اپنی ہے، البتہ ''انعمت علیہم'' میں خود صاحب کتاب نے بارہ مضامین کو چار ابواب کے تحت جمع فرمایا ہے، راقم نے ان عنوانات کو اس کتاب کی ترتیب میں پیش نظر رکھا ہے، چنانچہ اس کتاب کے ابواب میں علما، زعما، ادبا، اقربا کے عنوانات اسی سے ماخوذ ہیں۔ البتہ ان عنوانات کے تحت دوسرے مضامین کا بھی اضافہ کیا گیا ہے، جو دیگر کتب و رسائل میں محفوظ تھے۔ اس کے علاوہ باقی عنوانات راقم کے قائم کردہ ہیں۔

راقم نے ہر مضمون کے آخر میں ان کتب و رسائل کی نشان دہی بھی کر دی ہے، جہاں یہ شائع ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں جن کتب کو پیش نظر رکھا گیا ہے، ان کے اسما ہیں:

۱۔ اوراقِ گم گشتہ: غلام مصطفیٰ اکادمی۔ پاکستان، ۱۹۹۷ء۔ ۱۹۲ص
۲۔ انعمت علیہم: رائل بک ڈپو، حیدر آباد، ۱۹۹۷ء۔ ۸۴ص
۳۔ باقیات: مرتبہ حافظ منیر احمد خان، المصطفیٰ پبلی کیشنز، اولڈ یونی ورسٹی کیمپس،

حیدرآباد، ۷۷ اص

۴۔ بھولی ہوئی کہانیاں: گابا ایجوکیشنل بکس، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۵ء، ۱۱۶ص

۶۔ سراج البیان: گابا سنز، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۲ء، ۲۵۹ص

۵۔ طوبیٰ لہم: رائل بک ڈپو، فوجداری روڈ، حیدرآباد، ۱۹۹۵ء، ۸۱ص

۷۔ متفرقات: مرتبہ پروفیسر انوار احمد زئی، ادارہ انوار ادب، حیدرآباد ۲۰۰۲ء، ۱۲۰ص

۸۔ نورالقمر: غلام مصطفیٰ اکادمی (پاکستان)، حیدرآباد۔ کراچی ۲۰۰۳ء، ۹۶ص

کتاب میں شامل تمام مضامین معروف معنیٰ میں نا تو خاکے ہیں، نا ایسے شخصی مضامین جن میں کسی شخصیت کی حیات اور خدمات کا مکمل احاطہ کیا گیا ہو، عام طور پر یہ تاثراتی مضامین ہیں، جو مختلف اوقات میں تحریر کیے گئے اور مختلف مقامات پر شائع ہوئے۔ اسی طرح اس کتاب میں شامل بعض مضامین وہ نشری تقاریر ہیں جو ریڈیو سے نشر ہوئیں۔ اسی وجہ سے بعض اہم شخصیات پر مضامین اس مجموعے کا حصہ نہیں ہیں، مثال کے طور پر خلفائے راشدین میں سے صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے مضامین اس مجموعے کا حصہ ہیں، یہ دونوں مضامین بھی درحقیقت ریڈیو سے نشر ہونے والی تقاریر ہیں۔

اس قسم کے مجموعوں میں تکرار کا ہونا بالعموم ناگزیر ہوتا ہے، البتہ اس مجموعے میں تکرار سے بچنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی گئی ہے، اور بعض مکرر آنے والے جملوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔

اس مجموعے کا آخری باب ان چند مضامین پر مشتمل ہے جن میں آپ نے اپنے دور طالبِ علمی سے لے کر تادم تحریر پیش آنے والے چند واقعات اور لطائف کا ذکر کیا ہے، ان میں بھی چونکہ کے بہت سے واقعات کسی نہ کسی شخصیت سے تعلق رکھتے ہیں گو ان شخصیات کا نام ان مضامین میں موجود نہ ہو، اس بنا پر ان مضامین کو بہ طور ضمیمہ اس مجموعے کا حصہ قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ آپ کے مقالات اور مضامین کے دیگر مجموعوں سے موضوعاتی اعتبار سے ان مضامین کی مناسبت موجود نہیں تھی۔

حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں رحمہ اللہ کے دیگر مقالات اور مضامین کی موضوعات

کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ جلدوں میں تدوین وترتیب کا کام جاری ہے، جو حضرات اس سلسلے میں تعاون فرمانا چاہیں، یا کسی قسم کی معلومات رکھتے ہوں تو شکریے کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

راقم کو کتاب کی ترتیب وتدوین اور اشاعت میں صاحب کتاب حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں رحمہ اللہ کے پوتے اور جانشین برادرم ڈاکٹر حافظ منیر احمد خاں کے مشورے اور تعاون حاصل رہا، کتاب کی پروف خوانی میں حسب سابق ہمارے دیرینہ کرم فرما ملک نواز احمد اعوان نے تعاون فرمایا۔

راقم سب حضرات کا شکرگزار ہے اور سب کے لئے دعا گو ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین

سید عزیز الرحمٰن

۸ صفر المظفر ۱۴۳۰ھ/ ۴ فروری ۲۰۰۹ء

باب اول

اکابرین

رفیق رسول ﷺ

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

آپ کا اسم گرامی عبداللہ اور لقب صدیق اور عتیق ہے۔ اور یہ دونوں لقب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عنایت فرمائے تھے۔ آپ کی کنیت ابو بکر ہے اور آپ کا نسب آٹھویں پشت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے دو سال اور قریب تین ماہ بعد آپ پیدا ہوئے۔ اسلام سے پہلے آپ قریش کے اشراف میں بڑی عزت وثروت رکھتے تھے۔ دیت اور تاوان کے فیصلے آپ ہی کے ذمے تھے، جب آپ کسی کی ضمانت کر لیتے تو وہ قابل اعتبار سمجھی جاتی۔ علم انساب میں بڑی مہارت رکھتے تھے، فن شعر میں بھی کمال حاصل تھا، لیکن اسلام لانے کے بعد آپ نے شعر وشاعری چھوڑ دی تھی، بچپن ہی سے آپ کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی محبت تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب صغر سنی میں اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ ملک شام جانے لگے تو آپؓ نے حضرت بلالؓ کو کرائے پر لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لئے ساتھ کر دیا تھا اور راستے کے لئے توشہ بھی ساتھ کر دیا تھا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہوتے ہی آپ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے اور آپؓ کی وجہ سے دوسروں کے دلوں میں بھی اسلام کی رغبت پیدا ہوئی۔ آپ نے اسلام لاتے ہی مال تجارت کے علاوہ چالیس ہزار دینار اسلام کی اشاعت کے لئے پیش کئے۔ اور سات غلاموں کو خرید کر آزاد کرایا، جن کو اسلام لانے کی وجہ سے ایذائیں دی جا رہی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے راہ خدا میں کچھ مال

دینے کا حکم دیا۔ اس وقت میرے پاس بہت مال تھا، میں نے آدھا مال راہ خدا میں دے دیا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اپنے اہل وعیال کے لئے کچھ مال چھوڑ کر آئے ہو؟ تو عرض کیا کہ آدھا مال چھوڑ آیا ہوں، پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اہل وعیال کے لئے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کافی چھوڑا ہے۔

صدیق کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

جب شروع بعثت میں یہ آیت نازل ہوئی کہ:

اے نبی (ﷺ) احکام خداوندی کے لئے تکلیف برداشت کیجئے۔

تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ابتدا نہ کریں کہیں قریش مشتعل ہو کر حملہ نہ کریں، اس لئے مجھے اجازت دیجئے کہ میں ابتدا کروں۔

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ قریش کے سامنے پڑھا، جس میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت، پھر شرک و بت پرستی کی مذمت تھی۔ خطبہ بہت موثر تھا لیکن کفار نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بہت زیادہ ایذائیں پہنچائیں، جو انہوں نے خوشی کے ساتھ قبول فرمائیں۔

حضرت ابوبکر صدیق نے اسلام لانے کے بعد اپنے گھر کے سامنے ایک مسجد بنائی جو اسلام میں پہلی مسجد تھی۔ وہاں آپ ہر روز قرآن پاک (جتنا نازل ہو جاتا تھا) تلاوت فرماتے، اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔

ایک مرتبہ جب صحن کعبہ میں کفار قریش بیٹھے ہوئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا ذکر کر رہے تھے، اور اتفاق سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں پہنچ گئے تو ان لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا اور گلے کی چادر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لپیٹ کر کھینچنا شروع کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو وہ حضور کو بچانے کے لئے دوڑے۔ ان لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر حملہ کر دیا جس سے کئی دن آپ بے ہوش رہے اور جب کبھی تھوڑا ہوش آتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت دریافت کرتے۔

نبوت کے ساتویں سال جب کفار قریش نے شعب ابی طالب میں حضور انور صلی

اللہ علیہ وسلم اور ان کے خاندان کو تین سال تک محصور رکھا تو آپؓ بھی ان کے ساتھ رہے۔ اسی طرح ہر مشکل اور ہر جہاد میں بھی آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔

حضرت خدیجہؓ کا نکاح جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا تھا اس وقت بھی آپؓ نے کوشش کی تھی اور جب حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا تو آپؓ نے بہت ادب و اخلاص کے ساتھ اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں پیش کیا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معراج ہوئی تو سب سے پہلے آپ ہی نے تصدیق کی، اسی وجہ سے آپؓ کا لقب صدیق ہوا۔ پھر سفر ہجرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جس طرح ساتھ دیا اس کی تفصیل احادیث میں آتی ہے کہ کس کس طرح آپؓ نے ہر وقت کا سامنا کیا۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک چلنے سے زخمی ہو گئے تو آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شانے پر سوار کر کے غار ثور تک پہنچایا۔ اور جب کفار اس غار کے دہانے کے قریب پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو سورۃ توبہ میں بیان فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر آپؓ کو تسکین دی:

لا تحزن ان اللہ معنا(۱)

رنجیدہ نہ ہو، اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے انیس غزوات میں حصہ لیا۔ سب سے پہلا غزوہ بدر کا تھا اور آخری تبوک کا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہر غزوہ اور ہر موقع پر ساتھ رہے اور جاں نثاری اور جاں بازی کے جو کارنامے پیش کئے ہیں وہ اسلامی تاریخ میں بہت اہم ہیں۔ غزوہ بدر میں جو ۱۷ رمضان ۲ھ کو پیش آیا، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے ایک عریش یعنی چادریں تان کر ایک سائبان بنا دیا گیا تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رات بھر تلوار لیے ہوئے عریش کا پہرہ دیتے رہے۔ اخیر رات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم دعا کر رہے تھے:

اے اللہ اپنا وعدہ پورا کر، اگر یہ تیرے فرماں بردار بندے یہاں شکست کھا جائیں گے تو پھر روئے زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے قراری دیکھی تو

۱۔ التوبہ: ۴۰

عریش کے اندر آ کر عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ، بس اتنی دعا آپ کی کافی ہے''۔ اس بات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جونہی سر اٹھایا تو جبریل علیہ السلام وحی لے آئے کہ ان کافروں کو جلد ہی شکست دی جائے گی اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ دوسرے غزوات میں بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہمیشہ اور ہر حال میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سینہ سپر ہو کر رہتے تھے۔

پھر جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی ہوئیں، بعض لوگ نبوت کے مدعی بن بیٹھے۔ ان میں مسیلمہ کذّاب، عنسی اور سجاح وغیرہ کے قتل کا حکم حضرت صدیق ابوبکر رضی اللہ نے ہی نافذ فرمایا۔

ایک اور اہم واقعہ یہ تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری وصیت میں فرمایا تھا کہ اسامہ کا لشکر ملک شام کی طرف روانہ کیا جائے، لیکن پرآشوب حالات کی وجہ سے تمام جلیل القدر صحابہؓ فی الحال اس لشکر کے بھیجنے میں پس وپیش کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ میری اونٹنی لاؤ میں خود مرتدوں کے قتال کے لئے جاتا ہوں اور اسامہ کا لشکر ابھی روانہ ہوگا، خدا کی قسم اگر چیل کوے میرا گوشت نوچ ڈالیں تب بھی میں اس لشکر کو نہ روکوں گا جس کی روانگی کا حکم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دے گئے تھے۔ چنانچہ وہ لشکر فوراً روانہ ہوا، اور فتح ونصرت حاصل کر کے واپس ہوا۔ پھر بحرین، عراق، شام اور روم وغیرہ کی جنگوں کے لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بلا تکلف حکم دیا اور ہر جگہ فتح حاصل ہوئی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں قرآن پاک میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں ان میں سے ایک تو وہی سورۃ التوبہ کی آیت ہے جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور پر کافروں کے غلبے کے وقت فرمایا تھا:

لَا تَحْزَنْ اَنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۲)

رنجیدہ نہ ہو، اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے۔

دوسری آیت سورۃ الفتح کی ہے جس میں وہ اوران کے ساتھیوں کے متعلق فرمایا ہے:

۲۔ التوبہ: ۴۰

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (۳)

وہ کافروں پر بہت سخت اور آپس میں بہت نرم ہیں۔

تیسری آیت سورۃ الیل کی ہے:

وَسَیُجَنَّبُھَا الْاَتْقَی الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰیO (۴)

وہ بچایا جائے گا دوزخ کی آگ سے جو سب سے بڑا متقی ہے، جو اپنا مال دیتا ہے کہ ستھرا ہو۔

چوتھی آیت سورۃ الحجرات کی ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ (۵)

تم میں خدا کے نزدیک زیادہ بزرگ وہ ہے جو متقی ہو۔

مفسرین کے نزدیک یہ آیت بھی آپؓ کی شان کو ظاہر کرتی ہے۔

پانچویں آیت سورۃ النور کی ہے:

وَلَا یَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْآ اُولِی الْقُرْبٰی (۶)

جو تم میں بزرگی اور وسعت والے ہیں وہ اپنے قرابت والوں کو دینے سے انکار نہ کریں۔

احادیث بھی بہ کثرت ہیں جن میں آپؓ کی فضیلتیں مذکور ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایسے صحابی ہیں جن کی چار پشتیں صحابی ہیں۔ یعنی ماں باپ بھی، بیٹے بھی اور پوتے بھی۔

۲۲ جمادی الاخر ۱۳ھ کو آپؓ کا وصال ہوا، اسی وقت میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کوئی دردانگیز شعر پڑھا تو آپؓ نے فرمایا:

''ایسا نہ کہو'' بلکہ یہ آیت پڑھو:

۳۔ الفتح:۲۹

۴۔ الیل:۱۸

۵۔ الحجرات:۱۳

۶۔ النور۲۲

وَجَآءَتۡ سَكۡرَةُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنۡتَ مِنۡهُ تَحِيۡدُ ۝ (۷)

آ گئی غفلت موت کی، حق کے ساتھ یہی وہ چیز ہے جس سے اے انسان تو بھاگتا تھا۔

انّا للہ وانا الیہ راجعون ☆

۷۔ ق:۱۹

☆ آہنگ۔ ریڈیو پاکستان۔ مارچ ۱۹۸۴ء۔ اوراق گم گشتہ۔ ص ۹

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان ابن عفانؓ کا نسب پانچویں پشت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپؓ کی ولادت واقعہ فیل سے ۶ سال بعد ہوئی اور آپؓ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رہنمائی سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسلام لانے کے بعد آپؓ کو قریش نے بہت ایذائیں پہنچائیں۔ خود آپؓ کے چچا نے آپ کو رسی سے باندھا اور کہا کہ

'تم نے اپنے باپ دادا کا دین ترک کر کے نیا دین اختیار کیا ہے، میں تم کو اس وقت تک نہ کھولوں گا جب تک کہ تم اس نئے دین کو ترک نہ کردو۔

آپؓ نے فرمایا:

اللہ کی قسم، میں دین اسلام کو ہرگز ترک نہ کروں گا۔

آخر کار وہ ظالم عاجز آ گیا اور پھر آپؓ کو رہائی ملی۔

آپ اسلام لائے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کا نکاح آپؓ کے ساتھ کر دیا۔ اور جب کفار مکہ نے مسلمانوں کی ایذا رسانی پر کمر باندھی تو آپؓ حضرت رقیہ کو لے کر ملک حبش ہجرت کر گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''عثمانؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے بعد اپنے اہل بیت کے ساتھ ہجرت کی ہے''۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ملک حبش سے واپس مدینہ منورہ آ گئے اور حضرت رقیہؓ کی جب وفات ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں اس کی بہن ام کلثوم کا نکاح عثمان

سے کردوں۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں سے نکاح کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ''ذوالنورین'' کہلائے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مالی خدمتیں بہت کی ہیں۔ غزوہ تبوک کے موقع پر سامان جہاد کے علاوہ کھانے کا سامان (راشن) اس قدر دیا کہ کئی اونٹوں پر لادنا پڑا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ایک مرتبہ چار دن سے فاقہ تھا۔ آپؓ کو معلوم ہوا تو کئی بوریاں آٹے اور گیہوں کی، کئی بوریاں کھجوروں کی، بکری کا گوشت، پکا ہوا کھانا اور تین سو دینار بھیجے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سخت قحط پڑا۔ آپؓ نے ایک ہزار اونٹ غلے کے لے کر تمام حاجت مندوں میں تقسیم کر دیے۔ اسی طرح جب مدینہ منورہ میں میٹھے پانی کی سخت ضرورت تھی تو آپؓ نے ایک کنواں جو بیر رومہ کے نام سے اب بھی موجود ہے، ایک یہودی سے خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔ اسی طرح مسجد نبویؐ کی توسیع کے لئے ایک زمین قریب پچیس ہزار دینار میں خرید کر شامل کر دی۔ اسی طرح کی مختلف سخاوتوں کی وجہ سے آپؓ کو غنی کا لقب حاصل ہوا۔

آپؓ کا عہد خلافت بارہ دن کم بارہ سال رہا۔ اس زمانے میں دو قسم کی فتوحات ہوئیں۔ ایک تو وہ کہ بعض ممالک جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتح ہوئے تھے اور ان کے بعد باغی ہو گئے تھے ان کو دوبارہ فتح کیا، دوسرے وہ جو اب فتح ہوئے۔ مثلاً افریقہ کی وہ فتح جو حرب العباد اللہ کہلاتی ہے یعنی جس میں چار عبداللہ رضی اللہ عنہم شریک ہوئے۔ عبداللہ بن سعدؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، اور عبداللہ بن عباسؓ۔ انہوں نے افریقہ کے بہت بڑے علاقے کو فتح کیا۔ اس کے بعد طرابلس، اندلس اور مغرب کے بہت سے شہر قبضے میں آگئے۔ دوسری فتح قیصر روم کے ساحلی مقامات کی تھی جس کے لئے سب سے پہلی بحری جنگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مشورے اور اجازت سے کی۔ قیصر روم اور ایران کا یزدگرد آپؓ ہی کے زمانے میں مارا گیا۔ اور ایران کے مقامات میں سے خراسان، جوین، بیہق، فیروز آباد، شیراز، طوس، ہرات، نیشاپور، اور بلخ وغیرہ فتح ہوئے۔ غرض کہ فارس اور روم کی فتوحات کا تکملہ آپؓ کے ہاتھوں ہوا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں آخری چھ سال فتنہ پردازوں کی نذر ہوئے۔ حاکم مصر عبداللہ بن سراح تھا، اسی کی وجہ سے فتنوں کا آغاز ہوا۔ وہ وہاں بہت مظالم ڈھانے لگا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے تنبیہ کی لیکن وہ باز نہیں آیا تو آپؓ نے اسے معزول کر دیا اور اس کی جگہ محمد بن ابی بکرؓ کو حاکم مقرر کر کے مصر بھیجا اور یہ بھی فرمایا کہ عبداللہ بن سراح نے جو مظالم ڈھائے ہیں ان کی تحقیقات بھی کریں۔

جب وہ مصر کی طرف روانہ ہوئے اور ابھی چوتھی منزل پر ہی تھے کہ دیکھا ایک غلام بھاگا چلا آرہا ہے۔ اس سے پوچھا کہ تو کہاں جا رہا ہے تو اس نے غلط بیانی سے کام لے کر باور کرایا کہ وہ حضرت عثمانؓ کا غلام ہے اور اس کے پاس ایک فرضی تحریر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے منسوب کر کے پائی گئی۔ اس تحریر کا مضمون یہ تھا کہ محمد بن ابی بکرؓ اور ان کے جو ساتھی مصر جا رہے ہیں عبداللہ بن سراح کو چاہئے کہ ان کو قتل کر دے اور خود حاکم بنا رہے۔ دراصل یہ فرضی اور جعلی تحریر مروان کی تھی جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا قرابت دار تھا۔ بہر حال اس جھوٹ اور فریب سے بات بڑھتی گئی اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ٹھیک اس وقت شہید کئے گئے جبکہ قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھے اور ان کا روزہ بھی تھا، بڑی بے دردی سے شہید کئے گئے۔ یہ واقعہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کامل الحیاء والایمان ہیں۔ یعنی حیا اور ایمان میں کامل ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی حیا کی خاص طور پر تعریف فرمائی ہے اور بار بار ان کو جنت کی بشارت دی اور اپنی رفاقت کا مژدہ سنایا ہے۔ ایک موقع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میں اس شخص سے کیوں نہ حیا کروں جس سے فرشتے حیا کرتے ہیں۔

حیا ہی کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی ضرورت کے موقع پر بھی کسی کو تکلیف نہ دیتے۔ کئی کئی لونڈی، غلام آپؓ کے پاس ہوتے لیکن آپؓ کبھی ان سے کوئی خدمت نہ لیتے، پھر اگر کوئی شخص درشت کلامی کرتا تو آپؓ نرمی سے جواب دیتے۔ کسی کو قرض دیتے تو اس سے واپس نہ لیتے۔

آپؓ کے بہ کثرت دیگر فضائل بھی ہیں۔ مثلاً سوائے ممنوعہ ایام کے آپؓ ہمیشہ روزہ

رکھتے تھے۔ شہادت کے دن بھی آپؓ کا روزہ تھا۔ آپ ہر روز تہجد میں پورا قرآن پاک ختم کیا کرتے تھے اور دن میں بھی اکثر تلاوت فرماتے رہتے تھے۔ آپؓ ایک مدت تک کاتب وحی رہے۔ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ سابقین اولین میں سے تھے۔ صدقہ دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ ہر جمعے کو ایک غلام آزاد کرتے تھے۔ اگر کسی جمعے کو غلام نہ ہوتا تو دوسرے جمعے کو دو غلام خرید کر آزاد کرتے۔

جامع القرآن آپؓ اس لئے ہیں کہ شیخینؓ کے زمانے میں جو قرآن جمع کیا گیا تھا اسے آپ نے لغت قریش کے مطابق کتابت کرا کے تمام ملکوں میں بھیجا اور صحیح پڑھنے والے قاریوں کو بھی ساتھ بھیجا تا کہ ہر جگہ ایک ہی طرح پڑھا جائے۔ پھر قرآن پاک میں جو ۵۴۰ رکوع ہیں وہ آپ ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ تا کہ رمضان المبارک کی تراویح کی بیس رکعتوں میں ایک ایک رکوع پڑھا جائے اور آسانی کے ساتھ ستائیسویں شب میں ختم کیا جائے۔

اللہ پاک بے شک آپ سے راضی ہے اور آپ ان سے راضی ہیں۔☆

☆ آہنگ۔ ریڈیو پاکستان۔ اگست ۱۹۸۸ء۔ اوراق گم گشتہ۔ ص ۱۵

ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ

مسلمان مفسرین اور مورخین میں ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔آپ طبرستان کے صدر مقام آمل میں ۲۲۴ھ/ ۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔اور چھوٹی سے عمر یعنی سات سال کی عمر میں حافظ ہوگئے اور دینی علوم بھی اسی زمانے میں حاصل کر لیے۔ لیکن گھر سے خوش حال تھے اس لئے مزید تعلیم کے لئے بلاد اسلامیہ کا سفر اختیار کیا، وہ بغداد بھی گئے تا کہ امام احمد بن محمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کریں لیکن وہ کچھ عرصے کے بعد یعنی ۲۴۱ھ/ ۸۵۵ء میں فوت ہوگئے۔اس لیے طبری نے مصر اور شام کے علماء سے رجوع کرنے کے لئے سفر اختیار کیا۔اور ایک عرصے تک مسلم ممالک کا سفر کرتے رہے آپ کے خاص علوم یہ تھے، تاریخ، تفسیر، فقہ، تجوید وقرأت، عروض، صرف ونحو، ریاضیات اور علم ابدان۔

مصر سے واپسی پر آپ شافعی مذہب کے پیرو رہے اور امام احمد حنبلؒ کے فقہ سے کہیں کہیں اختلاف بھی کرنے لگے جس کی وجہ سے بہت سے حنابلہ ان کے درپے آزار ہوگئے اور مجبوراً آپ گوشہ نشین ہوگئے۔اور آخر بغداد میں ہی ۳۱۰ھ/۹۲۳ء میں آپ نے وفات پائی۔

ابن جریر طبریؒ کا مقام علم تفسیر میں بہت بلند ہوا۔ان کی تفسیر کا پورا نام ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' ہے۔وہ ابن منذر، ابن ابی حاتم، امام حاکم اور ابن حیان وغیرہ سب سے مقدم ہیں۔

اپنی تفسیر میں وہ یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ وہ ایک آیت کو نقل کرکے اس کے ایک ایک لفظ کے معنی لکھتے ہیں۔متقدمین کے جو اختلافات ہیں ان کو اسناد کے ساتھ درج کرتے ہیں۔پھر ان میں سے جو بات خود کے نزدیک قابل ترجیح ہوتی ہے اس کو بیان کرتے ہیں۔پھر

اس کے دلائل قائم کرتے ہیں۔ آیات کے جملہ مفہوم اور مقصد کے لئے بھی ان کا یہی رویہ ہے۔ یعنی وہ متقدمین کے اقوال درج کرتے ہیں، پھر خود ایک مفہوم کو اختیار کر کے اس کے لئے دلائل پیش کرتے ہیں، کہیں کہیں مسائل کے استنباط اور وجوہ اعراب سے بھی بحث کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ان کی تفسیر، اسلام میں پہلی تفسیر ہے جس میں مؤلف نے اپنی دماغی کوشش اور ذہنی کاوش سے بھی کام لیا ہے۔ اسی لئے وہ ہر موقع پر ایک انفرادی حیثیت سے ممتاز ہوتے ہیں۔ ان سے پہلے جو تفسیریں لکھی گئیں ان میں صحابہ کرامؓ تابعین اور ان کے بعد کے علماء کی روایات درج ہیں اور احتیاط کے طور پر ان مفسرین نے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں لکھی۔ لیکن طبریؒ نے اپنا مقام سب سے الگ قائم کیا ہے اور ہر موقع پر تحقیق وتنقید دونوں سے کام لیا ہے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ پوری امت کا اجماع ہے کہ ابن جریر طبری جیسی تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ امام ابو حامد اسفرائینی کا قول ہے کہ اگر کسی نے چین تک کا سفر کر کے صرف تفسیر طبری کو حاصل کر لیا تو وہ بھی بہت غنیمت ہے۔ اور اس نے کوئی زحمت نہیں اٹھائی۔

دراصل یہ تفسیر ہر لحاظ سے جامع اور مکمل ہے۔ اسے اُم التفاسیر بھی کہتے ہیں، کیوں کہ اس کے بعد جتنی بھی تفاسیر لکھی گئی ہیں وہ سب کے سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ تاہم محققین کے نزدیک اس تفسیر میں ایک خامی بھی ہے وہ یہ کہ طبری نے رطب دیابس ہر قسم کی روایات درج کر دی ہیں، لیکن ہر روایات کے ساتھ انہوں نے اس کی سند بھی درج کر دی ہے اس لئے اس کے جانچنے اور پرکھنے میں بڑی مدد مل جاتی ہے۔ امام ابن تیمیہ کے شاگرد ابن کثیر نے اسی تفسیر کا خلاصہ کیا ہے اور اسی کی تنقیح کر کے اپنی تفسیر مرتب کی ہے۔

طبری سے پہلے بھی چند تفسیریں لکھی گئی تھیں مثلاً ''تفسیر ابن جریج''، تفسیر سفیان بن عیینہ، تفسیر وکیع بن الجراح، تفسیر شعبہ، تفسیر ابوبکر بن ابی شیبہ وغیرہ۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے شیوخ سے قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں جو روایتیں سنتے ان کو قلم بند کر لیتے تھے۔ صحاح ستہ میں بھی کتاب التفسیر کے ذیل میں یہی انداز ہے کہ جستہ جستہ الفاظ اور آیات کے متعلق جو روایات مل سکیں ان کو درج کر دیا ہے اور یہ روایتیں بالعموم صحابہ کرامؓ یا ان کے تلامذہ کی ہیں۔ بہت کم ایسی ہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہیں، اور صحاح ستہ کے یہ ابواب اس قدر مختصر

ہیں کہ کسی سورۃ کے ایک یا دو لفظوں یا آیتوں کے متعلق بھی روایات درج ہیں۔ اگر چہ یہ روایات قرآنی تفسیر کے لئے نہایت اہم ہیں لیکن چوں کہ وہ بہت کم ہیں اس لیے تشنگی رہ جاتی ہے۔ ان روایات کے بعد جب مسلمانوں میں مختلف قسم کی تحریکیں شروع ہوئیں اور صرف و نحو بلاغت و معانی، فقہ و اصول، منطق و فلسفہ، کلام و تصوف وغیرہ کا رواج ہوا تو ہر مفسر نے اپنے زاویہ نظر سے الفاظ و آیات کی تشریح میں بحثیں شروع کیں اور روایات کے ساتھ ساتھ اجتہاد کا دروازہ بھی کھول دیا۔ پھر نئے نئے فرقے بھی پیدا ہو رہے تھے اور فنی موشگافیوں میں مصروف تھے اس لئے ان مفسرین نے ان کے اعتراضات کے جوابات بھی اپنی تفسیروں میں شامل کر لیے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تفسیر کے یہ اصول طبری نے ہی قائم کر دیے تھے اور وہ ایک ایسے نہج پر تھے جس کے لئے کم از کم پندرہ علوم کی ضرورت تھی، یعنی لغت، اشتقاق، صرف و نحو، معانی، بیان، بدیع، قرأت، کلام (اصول دین) اصول فقہ، اسباب نزول، قصص، ناسخ و منسوخ، فقہ اور حدیث۔ یعنی ان تمام علوم کی مہارت جو بعد کے مفسرین کے لئے ضروری قرار دی جاتی ہے وہ بہ یک وقت طبری کے یہاں موجود ہے۔ پھر تفسیر نویسی کے لئے سب سے مقدم شرط مفسر کی دیانت ہے کہ جب دنیا کے معاملات میں بھی غیر متدین کی بات تو کیا اس کی شہادت کا اعتبار نہیں کیا جاتا تو پھر دینی امور اور پھر بالخصوص قرآنی مطالب کے لئے ایسے شخص کا کیوں کر اعتبار ہو سکتا ہے۔ طبری کا کمال ہے کہ وہ مذکورہ علوم میں تبحر رکھتے ہوئے اس دیانت کے روشن مینار ہیں۔

منقولات کی اس پابندی کی وجہ سے آج بھی ان کی تفسیر کو بڑی قدر و منزلت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اور روایات کے معاملے میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

طبری کا ذکر نامکمل کہلایا جائے گا اگر ہم ان کی تاریخ کا ذکر نہ کریں۔ انہوں نے تاریخ عالم پر اپنی شہرہ آفاق کتاب تاریخ الرسل والملوک لکھی تھی۔ اس میں پہلے تو انبیاء علیہم السلام اور قدیم بادشاہوں کا ذکر ہے پھر ساسانیوں کی تاریخ ہے اور اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے آل و اصحاب کی تاریخ ہے جو ہر سال کے واقعات کے ذیل میں ہے، جسے توقیت کہتے ہیں۔ خاندان اُمیہ اور خاندان عباسیہ کی تاریخ بھی اسی طرح آتی ہے اور یہ ضخیم تاریخ چار دفتروں میں ختم ہوتی ہے۔ کتاب میں محرم ۳۰۲ھ جولائی ۹۱۵ء تک کے واقعات

درج ہیں۔ یعنی اس کتاب کے سات سال بعد طبری نے بغداد میں وفات پائی۔

طبری کی اس تاریخ کے ذیل میں بطور ضمیمہ ایک اور کتاب تاریخ الرجال شامل ہے۔ یعنی ان محدثین کی تاریخ ہے جن سے طبری نے استفادہ کیا ہے۔ طبری کی اسناد سمجھنے کے لئے اس کتاب سے بڑی مدد مل سکتی ہے اور اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تفسیر اور تاریخ کس حد تک مستند ہے۔☆

☆ آہنگ۔ ریڈیو پاکستان۔ ۱۹۸۰ء۔ اوراق گم گشتہ۔ ص ۱۹

اصطخری

جغرافیہ نگار

ابو اسحاق ابراہیم ابن محمد علی الفارسی ایک مشہور عرب جغرافیہ نگار رہے چوتھی صدی ہجری میں گزرا ہے۔ اس نے تقریباً ۳۴۰ھ میں کتاب الاقالیم تصنیف کی تھی۔ اس میں اس نے ہر ملک کے لئے ایک علیحدہ باب لکھا ہے اور ہر باب میں ایک رنگین نقشہ بھی دیا ہے۔ اس کتاب کو ۱۸۳۹ء میں J.H. Moeller نے Duke of Saxegotha کے کتاب خانے کے ایک قلمی نسخے سے نقل کر کے شائع کیا ہے۔ نقشے سیدھے سادے ہیں لیکن قرأت صاف اور صحیح ہے۔ اصطخری اپنی شہرت اور قابلیت کے باوجود تاریکی کے پردوں میں روپوش ہے De Goege جیسے فاضل مستشرق نے بھی اصطخری کے حالات کے متعلق چند جملے لکھے ہیں اور وہ بھی ظن وتخمین کے لباس میں ہیں۔ اس نے اصل تصنیف کا نام المسالک والممالک لکھا ہے جس کا ذکر Bibliothice Geogra Arab کی پہلی جلد میں ہے اس کا خیال ہے کہ اصطخری نے اپنی کتاب کے لئے ابوزید البلخی کے جغرافیے سے مدد لی تھی۔ لیکن اس عہد کی تصانیف چونکہ موجود نہیں اس لئے اس قول کی صداقت کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اصطخری سے پہلے عربوں میں کئی جغرافیہ نگار گزرے ہیں۔ اور ان کی باقیات الصالحات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ عربوں میں یہ علم غالباً بطلیموس کے جغرافیے سے شروع ہوا تھا۔ یہ شخص تیسری صدی عیسوی میں مصر میں تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ یونان کا باشندہ تھا۔ بہرحال وہ ایک مشہور حساب دان اور ہیت دان تھا۔ اس نے اپنی کتاب جغرافیہ میں روئے زمین اور اس کے شہروں، پہاڑوں،

سمندروں، جزیروں اور دریاؤں کا حال لکھا ہے۔ مزروعہ علاقوں اور آباد شہروں کی تعداد ۴۵۳۰ لکھی ہے۔ مسعودی نے اس کتاب کے حالات میں سمندروں کے متعلق لکھا ہے کہ بطلیموس نے سمندروں کو مختلف رنگوں میں ظاہر کیا ہے جو وسعت اور ہیئت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں سے بعض کی شکل طیلسان جیسی ہے بعض دہن ماہی یا آنت کی طرح ہیں اور بعض مثلث ہیں۔ مسعودی نے دوسری صدی عیسوی کے جغرافیہ نگار مارینوس کی کتاب بھی دیکھی ہے یہ شخص اس فن کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اب اس کی کتاب ناپید ہے۔ تاہم مارینوس سے زیادہ بطلیموس ہی عربوں میں مقبول ہوا۔ ثابت ابن قرہ نے اس کی کتاب جغرافیہ کا ترجمہ تیسری صدی ہجری میں کیا تھا۔ اسی عہد میں یعقوبی اور خرداذبہ مشہور عرب تھے جنہوں نے مستقل طور پر علم جغرافیہ پر تصانیف چھوڑیں۔ یعقوبی کی کتاب البلدان اور خرداذبہ کی المسالک والممالک اب بھی شہرت رکھتی ہیں اور موخرالذکر تو موسیقی کے لئے بھی مشہور ہے۔ ان کے بعد لیکن ان کے نوعمر، معاصرین میں قدامہ اور الجیہانی بھی اس علم کی معرف متوجہ ہوئے۔

بہرحال یہ خیال ہے کہ ان جغرافیہ نگاروں میں سے اکثر کی کتابیں، اصطخری کے پیش نظر رہی ہونگی کیونکہ انہی کے ایک دوست ابن حوقل نے ان کتابوں سے بہت کچھ استفادہ کیا تھا اور استفادے کے بعد ہی وہ ۳۳۱ھ میں دنیائے اسلام کے سفر کے لئے روانہ ہوا تھا۔ دریائے سندھ کی وادی میں جب اس کا گزر ہوا تو وہاں اصطخری سے ملاقات ہوئی۔ فن جغرافیہ کے متعلق تبادلہ خیالات ہوا۔ اصطخری نے اپنی کتاب اصلاح کے لئے ابن حوقل کو دکھائی۔ جس پر ابن حوقل نے کہیں کہیں اصلاح تو کردی لیکن اصطخری سے بہت متاثر ہوا اور اس کی عرق ریزی کی نہ صرف داد دی بلکہ اس کتاب کو اپنی کتاب المسالک والممالک کا ماخذ بنادیا۔ مستشرق Degeoge نے یہی نام اصطخری کی اصل کتاب کا بھی دیا ہے۔ خرداذبہ کی یہ کتاب بھی اسی نام سے تھی اس لئے میرے خیال میں یہ کوئی مستقل نام نہ تھا بلکہ عنوان تھا۔ جس کے تحت جغرافیہ کے متعلق معلومات کو جمع کردیا جاتا تھا۔ کیونکہ اسی نام یا عنوان کے تحت بعد میں مکبری (التوفی ۴۸۷ھ) نے بھی ہسپانیہ اور مغرب کے حالات ایک کتاب میں لکھے تھے بہرحال اصطخری کا سفرنامہ J.H. Meller کی بدولت دستیاب ہوجاتا ہے گو کہ نامکمل ہے۔ یہ سفرنامہ سندھ اور ملتان سے خاص تعلق رکھتا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس میں

سے کچھ ایسے اجزا پیش کیے جائیں جو پاکستان کی قدیم تاریخ پر روشنی ڈال سکیں۔ بزرگ ابن شہریار نے ایک عرب جہاز راں ابو محمد حسن کے حوالے سے اور مسعودی نے خود اپنے چشم دید حالات سندھ کے متعلق تفصیل سے لکھے تھے اصطخری نے بھی اس پر اضافہ کیا ہے۔ ان کے خیالات کا خلاصہ یوں سمجھئے کہ ۲۷۰ھ میں منصورہ یعنی بھکر کا مسلمان بادشاہ عبداللہ تھا اس کے پاس الرا کے راجہ مہر دگ ابن رائق نے جس کی حکومت کشمیر بالا اور کشمیر زیریں کے درمیان واقع تھی ایک پیغام بھیجا کہ وہ اسلام کی شریعت کا حال بتائے۔ عبداللہ نے ایک عراقی کو بھیجا جو بہت تیز طبع اور خوش فہم تھا اور شاعر بھی تھا۔ نیز ہندوستان کی کئی زبانوں سے بھی واقف تھا۔ راجہ نے اس عراقی سے قرآن پاک کا ترجمہ مقامی زبان میں کرایا۔ یہ روایت بزرگ ابن شہریار نے نقل کی ہے اس کے بعد مسعودی کے بیانات ہیں لیکن اصطخری نے منصورہ یعنی موجودہ بھکر کے مسلمان حکمران کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ منصورہ ملتان اور ان کے اطراف کی زبان عربی، اور سندھی ہے اور مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے۔ اصطخری کے دوست ابن حوقل نے بھی یہی لکھا ہے لیکن اصطخری نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ مکران کا علاقہ اکثر سندھ کے حکمرانوں کے زیر تسلط رہا ہے۔ سندھ اور ملتان کے علاقے میں دو مسلم اور دو غیر مسلم ریاستیں تھیں۔ یعنی ملتان میں سامہ ابن لوی کے خاندان کی حکومت تھی اور منصورہ (بھکر) جو خلیفہ عباسی منصور ثانی کے نام پر آباد ہے دوسرے قریشی عربوں کی حکومت کا پایہ تخت تھا۔ ملتان کے متعلق ایک دلچسپ بات اصطخری اور مسعودی نے یہ بتائی ہے کہ وہاں ایک بہت بڑا بت خانہ ہے جہاں دور دور سے غیر مسلم جاتے ہیں اور اگر کوئی غیر مسلم راجہ خصوصاً ارور کے راجہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو وہاں کا حکمراں اس بت خانے کو تباہ کرنے کی دھمکی دیتا ہے اور اس طرح سے خود کو حملے سے محفوظ کر لیتا ہے۔

ملتان سے سندھ جانے کا راستہ بھی سفر نامے میں دیا گیا ہے کہ ملتان سے منصورہ تک جانے میں تین دن کے راستے پر ''دوشاب'' ہے پھر ارور میں دریائے سندھ کو ''سندھ'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ملتان سے منصورہ تک ۷۵ سندھی فرسخ کا فاصلہ ہے تو آج کل کے حساب سے تقریباً ۶۰۰ میل ہوئے۔ اصطخری نے صوبہ مکران کے شہروں کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہاں کے مشہور تیز، کیز، بنجپور، دوک اور راسک ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے شہر بھی ہیں۔ مثلاً

بہ، بند، قصر، قند، اصفقہ، پھل پور، مشکی، قفلبی، ارمائیل اس صوبے کا پایہ تخت پہلے بھنج پور تھا۔ جہاں حاکم رہتا تھا۔ مگر آج کل کنیر (کیچ) میں رہتا ہے اور اس کی مشہور بندرگاہ شہر تیز ہے مکران سے ملا ہوا ایک صوبہ تھا جس کا نام اس زمانے میں طوران تھا۔ اصطخری نے اس کے مشہور شہر محالی، کنیر کا تان یعنی (موجودہ قلات) سورہ اور قصدار بتائے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ علاقہ تھا جسے ''بدھ'' کہتے تھے۔ اصطخری نے کہا ہے کہ (طوران کے) پایہ تخت قصدار کے آس پاس گاؤں اور شہر ہیں۔ اور آج کل یہاں کا حاکم مغیر ابن احمد ہے جو کنیر کا تان (موجودہ قلات) میں رہتا ہے یہ ایک شاداب اور وسیع قطعہ ہے جہاں ارزانی خوب ہے انگور، انار اور دوسرے میوے ہوتے ہیں۔ لیکن کھجور نہیں ہوتا۔ سفرنامے میں سندھ کے پائے تخت منصورہ کے علاوہ مشہور شہروں کے یہ نام ملتے ہیں: دیبل بیرون، قالری، اتری، ملیری، مسور ہی، ابرح، بانیہ، منخا ٹیری (منہاپوری) سدوسان اودر وغیرہ یہاں کے دو پھلوں کا ذکر بھی آیا ہے یعنی ایک کا نام لیموں ہے جو سیب کے برابر ہوتا ہے اور دوسرا آم جو شفتالو کی طرح ہے یہاں کا دریائے سندھ مثل دجلہ کے ہے بلکہ اس سے زیادہ اس کا پاٹ ہے۔ مشرق سے جنوب کی طرف جا کر مغرب کو گھوم کر بحر عرب سے جا ملتا ہے۔ پھر منصورہ کا ذکر ہے کہ وہ ایک گرم شہر ہے جہاں کھجور کے درخت ہیں لیکن انگور، سیب، امرود، شفتالو نہیں ہوتے۔ البتہ نیشکر (گنا) ہوتا ہے، یہاں سیب کے برابر ایک پھل ہوتا ہے جس کو لیموں کہتے ہیں۔ بڑا ترش ہوتا ہے شفتالو کے برابر ایک اور پھل ہوتا ہے۔ جس کو آم کہتے ہیں جو قریب قریب اسی مزہ کا ہوتا ہے پھل بڑے ارزاں ہوتے ہیں ''یہ شہر بہت شاداب ہے۔''

اصطخری نے ملتان کے مندر کا حال تفصیل سے لکھا ہے کہ یہ مندر ملتان کے پر رونق بازار میں ہے جو ٹھٹھیروں اور ہاتھی دانت والے بازار کے درمیان واقع ہے یہ مندر بڑے محل کے وسط میں ہے اس پر ایک قبہ ہے اور اسی قبے میں بت ہے اور اس کے اردگرد پجاریوں کے مکانات ہیں اس بت کی صورت انسان کی طرح ہے جو پالتی مارے کرسی پر بیٹھا ہے۔ یہ کرسی اینٹ اور گچ کی ہے اس کا لباس سرخ چمڑے کا ہے جس سے اس کا تمام بدن بجز آنکھوں کے ڈھکا ہوا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مورتی لکڑی کی ہے اور بعض لوگ کچھ اور کہتے ہیں اس کا بدن ہمیشہ ڈھکا رہتا ہے اس کی آنکھوں میں دو یاقوت ہیں اور سر پر سونے کا تاج ہے

مورتی کرسی پر پالتی مارے بیٹھی ہوئی ہے اور اپنے دونوں ہاتھ گھٹنے کی طرف لمبے کئے ہوئے ہے انگلیاں اس طرح سے ہیں گویا حساب کر رہی ہوں۔ لوگ جو کچھ نذر کے طور پر بھیجتے ہیں اس کو ملتان کا حاکم لے لیتا ہے اور اس کے پجاریوں پر اپنے زیر اہتمام خرچ کرتا ہے۔

آگے چل کر اصطخری لکھتا ہے:

ملتان سے قریب ایک اور شہر ہے جس کو جندر کہتے ہیں یہاں ملتان کا حاکم رہتا ہے صرف جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے ہاتھی پر سوار ہو کر ملتان جاتا ہے۔ یہ امیر قریشی ہے جو سامعہ ابن لوی کے خاندان سے ہے۔ اس نے ملتان پر اپنا قبضہ جمالیا ہے خود مختار ہے۔ منصورہ کے حاکم کا مطیع نہیں ہے۔ البتہ خلیفہ بغداد کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے۔

اس کے بعد اصطخری نے بسمد اور الور (ارور) دو شہروں کا ذکر کیا ہے جو دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہیں۔ پھر دیبل کے متعلق لکھتا ہے:

وہ سندھ کا بڑا بندر اور تجارتی مرکز ہے۔ سمندر کے پاس دریائے سندھ کی مغربی جانب یہ شہر آباد ہے۔ آس پاس نہ کوئی زراعت ہے اور نہ کوئی درخت ہے۔ بلکہ یہ ایک بنجر زمین ہے جو صرف تجارتی تعلقات کی وجہ سے آباد ہے۔ پھر بیرون، امزی، قالری وغیرہ کا ذکر ہے۔ قامہل کو سندھ کا آخری اور ہندوستان کا پہلا شہر کہا ہے جہاں سے لوگ چیمور جاتے ہیں، قامہل، سندان، چیمور اور کنبھائت (ہندوستانی علاقوں میں) جامع مسجدیں مسلمانوں کی ہیں اور ظاہر اطور پر مسلمانوں کے لئے ان کے قاضی احکامات جاری کرتے ہیں۔ یہ بڑے شاداب شہر ہیں، ناریل، کیلا، آم بہت ہیں۔ زراعت زیادہ تر چاولوں کی ہوتی ہے۔ کھجور کے درخت یہاں نہیں ہیں۔ مگر شہد خوب ہوتا ہے، قامہل، اور کنبھانت سے چیمور تک گاؤں ہی گاؤں ہیں، یہاں کپڑے استعمال کرنے اور زلف رکھنے میں ہندو مسلمان ایک ہی طرح ہیں ان کا لباس ازار اور کرتا ہے۔ کیونکہ ان کا ملک بہت گرم

ہے، ملتان والوں کا لباس بھی یہی ہے۔ لیکن تاجر لوگ قمیض اور لنگی پہنتے ہیں جیسا کہ تمام اور عراق والوں کا دستور ہے، اصطخری نے منصورہ (سندھ) کے لباس اور سکوں کے متعلق بھی ایک جگہ کہا ہے کہ سکوں میں قاہریات کا رواج زیادہ ہے جو پانچ درہم کے برابر ہوتا ہے۔ خود ان کا اپنا سکہ بھی جس کو طاطری کہتے ہیں ایک طاطری کا وزن $\frac{2}{3}$ ادرہم ہے لین دین، دینار سونے کے سکے سے بھی کرتے ہیں۔ ان کا لباس عراقیوں کی طرح ہے لیکن بادشاہوں کا لباس ہندوستانی راجوں کی طرح کرتا اور ازار ہوتا ہے۔

اس کے بعد اصطخری نے بڑی تفصیل سے سندھ اور مکران وغیرہ کے شہروں کے فاصلے مرحلوں میں سمجھائے ہیں ایک مرحلہ تقریباً ۱۲ میل کا ہوتا تھا۔ ان مرحلوں سے اس زمانے کے تجارتی راستوں اور ان کی مسافت کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اور اگر اصطخری کے بتائے ہوئے نقشے پر غور کیا جائے تو آسانی کے ساتھ دیبل کی جائے وقوع بھی معلوم ہو سکتی ہے۔

آیئے کچھ دریائے سندھ کا حال بھی اصطخری سے سن لیجئے وہ کہتا ہے:

یہاں ایک دریا ہے جس کو مہران کہتے ہیں اور مجھے خبر ملی ہے کہ اس کا منبع اس پہاڑ کے پیچھے ہے جس سے جیجوں کے بعض دریا نکلتے ہیں۔ دریائے سندھ ایک بڑا دریا ہے یہ ملتان سے ہو کر لسمبد اور ارور ہوتا ہوا منصورہ پہنچ کر دیبل کی مشرقی جانب سمندر سے مل جاتا ہے اس کا پانی میٹھا ہوتا ہے۔ نیل کی طرح مہراں میں بھی مگر مچھ بہت ہیں اور نیل کی طرح بڑا بھی ہے۔ مدوجزر بھی اسی طرح ہیں۔ جب اس کا چڑھاؤ ہوتا ہے تو ہر جگہ پانی پہنچ جاتا ہے لیکن اتار ہونے پر زراعت ہوتی ہے جیسا کہ مصر میں ہوتا ہے۔ اور سندھ اور (یعنی اٹک) جو ملتان سے ۹ میل پر ہے اور میٹھا دریا ہے وہ دریائے سندھ سے مل جاتا ہے مکران عموماً بنجر ملک ہے۔ ریگستانی میدان زیادہ البتہ منصورہ اور مکران کے درمیان دریائے سندھ کی شاخیں یا تالاب میں جہاں جاٹ لوگوں کا قبضہ ہے

ان میں سے جو شخص جس پانی پر قابض ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے لئے
مخصوص ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر مچھلی اور آبی پرندوں پر گزارہ
کرتے ہیں اور کردوں کی طرح دور میدانوں میں رہتے ہیں۔

اس سفرنامے میں، اصطخری نے سندھ اور اس کے اطراف کی چھ ریاستوں کے نام گنائے ہیں۔ان کے حکمرانوں کے نام بھی اس طرح دیئے ہیں۔ ملتان میں خاندان سامہ ابن لوی قریشی سندھ میں ہبار ابن اسود قریشی، مکران میں عیسیٰ ابن معدان مکران سے متصل مشکی میں مطہر ابن رجا، بدھ میں کوئی راجہ تھا اور طوران میں مغیر ابن احمد تھا بہرحال اصطخری کی کتاب کی دلچسپی اور اہمیت کا اندازہ بھی اقتباسات سے ہوسکتا ہے اور اس عہد میں جب کہ تاریخ اپنے اوراق جلد جلد پلٹ رہی ہے۔اس فاضل سیاح کی جغرافیہ دانی سے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔☆

☆ ماہنامہ ''ساقی'' کراچی اپریل و مئی ۱۹۵۱ء۔ نورالقمر۔ ص ۵۵

سائنسداں خیام

حجتہ الحق عمر ابن ابراہیم الخیامی کا تعلق ایسے زمانے سے ہے جب کہ علم نجوم نہ صرف علوم متداولہ میں شامل تھا بلکہ موجب افتخار وابتہاج سمجھا جاتا تھا۔ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کی اکثر کتابیں شاہد ہیں کہ اس علم کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ نظامی عروضی کا چہار مقالہ، افضل الدین کرمانی کی عقد العلیٰ للموقف الاعلیٰ، راوندی کی راحت الصدور، علی ابن زید البیہقی کی تتمہ صوان الحکمہ وغیرہ متعدد کتابیں اس علم کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ابوریحان البیرونی نے کتاب التفہیم فی صناعۃ التنجیم میں اس علم کی ضرورت پر خاصی بحث کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس علم میں مہارت حاصل کرنے کے لئے چار علوم ہندسہ، حساب، ہیئت اور احکام بھی لازمی ہیں۔

نظامی عروضی نے کہا ہے:

> از لوازم ایں صناعت منجم کہ احکام خواہد گفت باید کہ سہم الغیب در طالع
> دار دیا بجائے نیک از طالع وخداوند خانۂ سہم الغیب مسعود در موصعے عمود
> تا آنچہ گوید از احکام بصواب نزدیک باشد

اس کے ساتھ نظامی نے اس زمانے کی فنی کتابوں کے مطالعے کا مشورہ دیا ہے:

> از شرائط منجم یکے آن است کہ مجمل الاصولِ کوشیار یاد دارد و کارِ مہتر پیوستہ
> مطالعہ می کند وقانونِ مسعودی وجامع شاہی می نگرد تا معلومات و
> منصورات او تازہ ماند

نظامی نے خیام کا زمانہ دیکھا ہے اس لئے اس علم کی مشہور کتابوں کا تذکرہ اس موقع پر ضروری تھا لیکن ہمارے زمانے میں ان کتابوں میں سے سوائے ایک دو کے اکثر ناپید ہیں

اور جو موجود ہیں ان کے سمجھنے والے موجود نہیں ہیں تاہم ان کتابوں سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ خیام کے زمانے میں علم نجوم میں مہارت حاصل کرنے کے لئے ایسی کتابیں ضروری تھیں لیکن مشرق میں جس قدر خیام اپنے نجوم کی وجہ سے مشہور ہے اسی قدر وہ اس علم سے خود کو بے نیاز سمجھتا تھا اور اسے اس سے کوئی عقیدت نہ تھی۔ چنانچہ نظامی عروضی نے صاف کہا ہے کہ

اگر چہ حکیم حجۃ الحق عمر بدیدم، اما ندیدم اور در احکام نجوم، ہیچ اعتقادے

لیکن اس کے باوجود نظامی نے چہار مقالے میں تین جگہ اس کو علم نجوم ہی کے سلسلے میں یاد کیا ہے اور اس کے کمالات کا اعتراف کیا ہے کہ لوگ اس علم میں اس کی مثال دیا کرتے تھے۔

عمر خیام نجوم اور فلکیات میں زیادہ تر اپنی زیچ ملک شاہی کی وجہ سے مشہور ہے۔ زیچ ان جدولوں کو کہتے ہیں جن میں کسی رصد خانے کے فلکی مشاہدات اور ستاروں کے حرکات قلم بند کئے جائیں۔ خیام کو زیچ ملک شاہی کا ذکر خلیفہ چلپی کی کشف، الظنون میں ضرور آتا ہے لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے فاضلانہ مقالے میں لکھا ہے کہ

ملک شاہی رصد خانے کے فلکی مشاہدات وتحقیقات آیا کسی زیچ میں قلم بند ہوئے ہیں یا نہیں! اس کا کوئی مستند جواب ہم کو نہیں ملتا البتہ قطب الدین شیرازی (التوفی ۷۱۰ھ) نے اپنی کتاب تحفۂ شاہیہ میں خیام کی اس زیچ کا اس طرح ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی نظر سے گزری تھی اور خیام نے اس میں اپنی تاریخ کے اصول بھی بتائے تھے۔

بہر حال شمسی حرکات کو صحیح طور سے ضبط کرنے کے لئے عہد ملک شاہی میں جو رصد خانہ تیار کیا گیا تھا اس کے لئے بہت سے ایسے رصد خانوں کے تجربات بھی ممد ومعاون ثابت ہوئے جو خلیفہ مامون الرشید کے زمانے سے رائج تھے، ابو حنیفہ محمد ابن جابر بتانی، محمد ابن محمد بوز جانی، شرف الدولہ، ابو علی ابن سینا وغیرہ کے رصد خانے ضرور قائم ہوئے تھے اور ان سے کسی نہ کسی طرح ضرور ملک شاہی رصد خانے کی تعمیر میں مدد ملی ہوگی۔

خیام تقریباً ۱۹ سال یعنی ۴۶۷ھ سے ۴۸۵ھ تک ملک شاہ سلجوق کے دربار میں رہا

اور اس عہد میں اس کا سب سے بڑا کام رصد خانہ ملک شاہی کی تعمیر اور فلکیاتی تحقیق ہے۔ یہاں اس نے قمری اور شمسی سالوں کا جائزہ لیا اور رصد خانے کی تعمیر میں بعض رفقائے کار کی مدد بھی حاصل کی۔ مختلف کتابوں میں اس کے رفقا کے نام اس طرح آتے ہیں کہ مظفر اسفزازی، میمون ابن نجیب واسطی، ابوالعباس لوکری، محمد ابن احمد معموری بیہقی، ابوالفتح عبدالرحمٰن خازن وغیرہ۔ ان سب نے مل کر ۴۶۷ھ میں رصد خانے کا کام شروع کیا اور ۱۰ رمضان ۴۹۱ھ میں جبکہ تاریخ ملک شاہی کا آغاز ہوا یہ رصد خانہ مکمل ہو چکا ہوگا۔ اس کے بعد تحقیقات اور مشاہدات کا کام شروع ہوا جس کے ذریعہ منٹوں کی تعین بھی کی تھی۔ کیونکہ سال کے ۳۶۵ دن قدیم مصری مراصد کے نزدیک بھی تھے اور مزید ۵ گھنٹے غالباً بطلیموس نے سب سے پہلے شمار کیے تھے لیکن منٹوں کی صحیح تعین دراصل رصد خانۂ ملک شاہی سے شروع ہوئی اور آج کل سے اگر خیام کے یا ملک شاہی رصد خانے کی تحقیق کا مقابلہ کیا جائے تو صرف چند سیکنڈوں کا فرق معلوم ہوگا۔ اس فرق کا سبب سب سے پہلے بیرونی نے آثارِ باقیہ میں یہ بتایا تھا کہ ہمارے آلاتِ رصد چھوٹے ہیں اس لئے ہم پوری تحقیق سے عاجز ہیں کیونکہ ان چھوٹے آلات سے آفتاب کے دائرہ عظمٰی کی پوری پیمائش نہیں ہو سکتی۔

بات دراصل یہ تھی کہ مشرقی قوموں نے جن کے یہاں مطلع عموماً صاف رہتا تھا قمری مہینے کو مانا لیکن جن کے یہاں مطلع عموماً ابر آلود رہتا تھا اور جو پہلی کے چاند کو دیکھنے سے عاجز تھے وہ شمسی ماہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ ایران میں قدیم عہد کے یعنی دارا کے زمانے کے صرف نو مہینوں کے نام ہم تک پہنچتے ہیں۔ بقیہ تین مہینوں کے نام ہم تک نہیں پہنچے لیکن جب ایران میں مسلمانوں کا تسلط ہوا اور مالیہ کی وصولی کے لئے شمسی حساب اور ان کے قمری حساب میں فرق پڑا تو ہارون الرشید نے برمکی وزیروں کے سامنے اس صورت حال کو پیش کیا لیکن انہوں نے اس کو مذہبی مداخلت سمجھا۔ تاہم مامون الرشید کے زمانے میں ۲۰۸ھ میں یہ دونوں سال برابر کر دیئے گئے۔ لیکن خلیفہ متوکل علی اللہ کے زمانے میں شمسی اور قمری سالوں کی مطابقت کے لئے ۲۴۲ھ میں ایک قمری سال نکال دیا گیا جو ۲۰۸ھ سے اس وقت تک کے زمانے میں بڑھ رہا تھا۔ اس طرح کاشتکاروں اور خود مالیات کو اس الجھن سے نجات ملی لیکن بتیس سال کے بعد یعنی ۲۷۴ھ میں پھر وہی دقت پیدا ہوئی اور وہی ایک سال کا حذف پھر عمل

میں آیا بہر حال ملک شاہ کے عہد میں تاریخ جلالی کی ترتیب جو خیام اور اس کے رفقائے کار کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی وہ اس طرح تھی۔

۱۔ فارسیوں کی طرح ہر ماہ تیس تیس دن کا فرض کرلیا جائے۔ اس طرح ۳۶۰ دن ہوتے ہیں۔

۲۔ باقی پانچ دن ہر سال کے آخر میں بڑھا دیئے جائیں۔ اس طرح ۳۶۵ دن ہوتے ہیں۔

۳۔ ۵ گھنٹے ۴۹ منٹ کو ۱۱ منٹ بڑھا کر آسانی کے لئے چھ گھنٹے فرض کر لئے جائیں تو چار سال میں ایک دن ہو جائے گا۔

یہ ایک دن ہر چوتھے سال ان پانچ اضافی (مسترقہ) دنوں میں ملا کر چھ دن کر کے ان کا کبس لگا کر شامل کر دیتے تھے۔ یعنی خیام نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ ہر چوتھے سال ایک دن بڑھایا جائے اور سورج کے سات سالانہ دوروں کے ختم ہونے پر پانچویں سال ایک دن زیادہ کیا جائے۔ اس حساب سے شمس وقمری سال کا فرق پورے ۳۳ برس میں نکل جائے گا۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ خیام نے ان اصولوں پر عمل کرنے کے علاوہ یہ بھی کیا کہ "سال کے آغاز کا دن اس وقت کو مقرر کیا جس وقت آفتاب دوپہر سے پہلے برج حمل میں آئے۔ اس طرح آغاز سال کا وقت اور روز مقرر ہو کر اپنی جگہ پر اٹل ہو گیا۔ اس حساب کے اجرا کا مہینہ فروردین ماہ تھا۔ گو کچھ تاریخیں اس کی گزر چکی تھیں تاہم یکم فروردین سے اس کا آغاز کیا۔ آفتاب کے برج حمل میں ہونے کا وہ دن تھا جب روز وشب بالکل برابر ہوتے ہیں اور بہار کا آغاز ہوتا ہے۔ اس طرح نوروز ہر سال کے یکم فروردین کو مقرر کر کے دائمی کر دیا اور شمسی سال کا ہر نقص پورا ہو گیا۔ سلجوقی سلطنت میں یہ تقویم جلالی یا ملک شاہی کے نام سے دہم رمضان ۴۷۱ھ میں جاری ہو گئی اور بعد کی مشرقی سلطنتوں نے بھی اس کو قبول کرلیا۔ اسی عہد ملک شاہی کے ایک شاعر نے ان جلالی یا ملک شاہی مہینوں کی خصوصیت اس قصیدے میں بیان کی ہے۔

جہاں جواں شدہ اکنوں بفرِ فروردیں
نمودہ تازہ چمن را بہ سنبل و نسریں

نگر کہ مژدۂ اردی بہشت داد صبا
کہ گشتہ صحن چمن چوں نگار خانۂ چیں
جہاں بہ موسم خرداد مہ نہاد از گل
بفرقِ پادشہِ گلبن افسر زریں
بہ تیرماہ ز گرمی دہان مرغاں باز
برائے آب بہ پرواز از یسار دیمیں
بہ عہدِ دولتِ مرداد شد فضائے چمن
نگار خانۂ ارژنگ و صحنِ خلد بریں
بہ وقتِ موسمِ شہر یور از شہورِ جدید
فزاید از شرف اربابِ جاہ را تمکیں
بہ مہرماہ شدہ چار امہات عقیم
از آنکہ آمدہ آبائے ہفتگانہ چنیں
چوگشت فصل اباں ابراز برائے نثار
بفرق شاہد گلزار ریخت دُرِ ثمیں
چوگشت نوبت آذر بجانِ باغ افتاد
ہزار شعلۂ آتش چوآذر برزیں
بہ دے ز اوج کنذ مہر رُو بسوئے حضیض
برائے سجدۂ درگاہ شاہ عدل آئیں
ہمیشہ تاکہ بود دور بہمن و اسفند
ترا لکام بود گردشِ شہور و سنیں
ہمیشہ از پۓ ہر سال تا بود خمسہ
فزودہ باد بہر حال عمر تو خمسیں

بہر حال خیام کی کوششوں سے تاریخ جلالی قائم ہوئی اور اس نے جلالی سنہ کی تاریخوں کی تعیین کے لئے ایک تقویم یعنی جنتری کی جَدْوَلیں بھی تیار کی تھیں۔ یہ چار جدولیں

تھیں جن میں سے ایک جدول میں ہفتے کے دنوں کے نام تھے۔ دوسری میں مہینوں کے نام اور تیسری میں تاریخوں کے ابجدی اعداد لکھے گئے تھے۔ غالباً اسی تقویم کا نام ''آغازِ حسابِ تاریخ جلالی'' تھا۔ لیکن تقویم جلالی اور زیج ملک شاہی کے علاوہ فلکیات پر خیام کی دوسری تصانیف اگر تھیں تو اب موجود نہیں ہیں۔ تاہم ہجری اور عیسوی سنین کے تطابق اور تقابل کے لئے جو طریقہ آج کل رائج ہے وہ خیام کے مقرر کردہ اصول ہی سے مستنبط معلوم ہوتا ہے بہرحال مغرب میں اگر خیام ''ذکر بادہ وصہبا'' کے لئے مشہور ہے تو مشرق میں نجوم کے لئے یاد کیا جاتا ہے۔ نظامی عروضی جو خیام کو بمنزلہ استاد سمجھتا ہے اس کا ذکر نجوم ہی کے سلسلے میں ہوتا ہے اور ایک جگہ خیام کے انتقال اور مدفن کے متعلق بڑی دلچسپ بات لکھتا ہے کہ

درسنۂ ستِ وخمس مائتہ (۵۰۶ھ) بشہر بلخ درکوے بردہ فروشان درسرائے امیر بو سعد، خواجہ امام عمر خیامی وخواجہ امام مظفر اسفزازی نزول کردہ بودند ومن بدان خدمت پیوستہ بودم۔ درمیان مجلس عشرت از حجۃ الحق عمر شنیدم کہ اوگفت گورمن درموضعے باشد کہ ہر بہارے شمال برمن گل افشانی می کند۔ ملاین سخن مستحیل نمود ودانستم کہ چنوئی گزاف نگوید۔ چون درسنۂ ثلثین بنشاپور رسیدم چند سال بود تا آن بزرگ روے درنقاب خاک کشیدہ بود وعالم سفلی از وےیتیم ماندہ او را برمن حق استادی بود آدینۂ بزیارتِ او رفتم ویکے را با خود ببردم کہ خاکِ او بمن نماید۔ مرا بگورستان حیرہ بیروز آورد وبردستِ چپ گشتم۔ درپائین دیوار باغے خاک او را دیدم نہادہ ودرختان امرود وزرد آلو سراز آن باغ بیرون کردہ وچنداں برگ شگوفہ برخاکِ او ریختہ بود کہ خاکِ او درزیرگل پنہاں شدہ بود مرا یاد آمد آن حکایت کہ بہ شہر بلخ از وشنیدہ بودم

یہ حکایت خیام کے علم نجوم کے سلسلے میں آتی ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ حقیقت کیا تھی۔ تاہم ہماری دعا ہے کہ:

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے☆

☆ رسالہ ''انشاء''۔ کراچی۔ ستمبر ۱۹۵۹ء۔ نور القمر۔ ص ۸۵

حکیم نکتہ سنج

ابن سینا

ابو علی حسین ابن عبداللہ ابن سینا صرف ابن سینا اور Avicenna کے نام سے تمام دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ شیخ الرئیس ان کا مشہور لقب ہے۔ بخارا کے قریب ایک گاؤں میں ۳۷۰ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ انہوں نے دس سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرلیا تھا اور علم نحو اور علوم دینیہ کی مبادیات کی تکمیل کرلی تھی۔ ایک عالم عبداللہ ناتیلی سے انہوں نے استفادہ کیا لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصے میں استاد کی حیثیت سے علماء کو درس دینے لگے۔ ریاضیات، طبیعیات، منطق اور ماوراء طبیعیات کے ادق مسائل اور فن طب کی مہارت اسی نوعمری میں حاصل ہوگئی تھی اور وہ ابھی سترہ سال ہی کے تھے کہ مشرق و مغرب میں ان کی شہرت پھیل گئی تھی۔ بخارا کے امیر نوح بن منصور نے ان کو اسی زمانے میں ایک ایسے مریض کے علاج کے لئے طلب کیا تھا جس سے تمام اطبا مایوس ہوگئے تھے لیکن ابن سینا کے علاج سے وہ شفایاب ہوگیا تھا۔ امیر نے خوش ہوکر انہیں مالا مال کردیا اور اپنا بیش بہا کتب خانہ ان کے سپرد کردیا، حاسدوں نے کتب خانے جلا کر اس کا الزام ابن سینا پر رکھ دیا۔ نظامی عروضی کی روایت ہے کہ ابن سینا کو اس کتب خانہ کی اکثر کتابیں زبانی یاد تھیں اور انہوں نے املا کر کے ان کتابوں کو دوبارہ زندہ کردیا۔

امیر نوح بن منصور کی وفات ۳۸۷ھ میں ہوئی تو ابن سینا بخارا سے جرجان، خوارزم، خراسان، اور داغستان میں قیام کرتے رہے اور وہاں تدریس کا سلسلہ جاری رکھا،

جرجان میں ابن سینا نے اپنی مشہور کتاب قانون لکھنی شروع کی جس کی نظیر صدیوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ یہ کتاب فن طب پر ایک اٹل کتاب ہے اور بہ کثرت انکشافات پر مبنی ہے۔ اسی کے نام پر Canon Law اسی قانون کو کہا جاتا ہے جو اٹل ہے۔ جرجان سے ابن سینا کو ہمدان جانا پڑا کیوں کہ اس زمانے میں سیاسی افراتفری عام تھی۔ ہمدان کے امیر شمس الدولہ نے ان کو اپنا وزیر بنالیا۔ امیر کو آنتوں کی بیماری ہوئی تو ابن سینا نے کتاب شفا لکھی جو اس بیماری کے علاج اور تشخیص کے سلسلے میں بے نظیر ہے۔ شمس الدولہ کے انتقال کے بعد ابن سینا نے اصفہان کا رخ کیا اور وہاں کے امیر علاؤ الدولہ کے ساتھ کچھ عرصے تک قیام کیا۔ بالآخر رمضان ۴۲۸ھ میں ان کی وفات ہوئی لیکن مرنے سے پہلے انہوں نے اپنا تمام مال ومتاع اللہ کی راہ میں خیرات کردیا۔

ابن سینا جیسے ذکی، ذہین اور بلند پایہ مصنفین دنیائے اسلام میں بہت کم ہوئے ہیں۔ انہوں نے مختلف ذمہ داریوں کے باوجود ایک سو سے زیادہ کتابیں لکھیں ہیں۔ اور ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ ان کے موضوعات پر اج تک اضافہ نہیں ہوسکا۔ ان کی کتاب قانون اور شفا کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے اور آج تک ان کا پڑھنا اور سمجھنا بہت بڑی استعداد والوں ہی کا کام ہے۔ کتاب الشفا مختلف علوم کا مخزن اور انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس کی اٹھارہ جلدیں ہیں۔ بعض حصے یہ ہیں۔

منطق، طبیعیات، السماء والعالم، روح حیات حیوانی، عقل، فلسفۂ اولیٰ۔

ابن طفیل نے اپنی کتاب ''حی ابن یقظان'' میں لکھا ہے کہ ابن سینا نے شفا کی ابتدا میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ اس کتاب میں اس کے اصلی خیالات کا اندازہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی کتاب حکمت مشرقیہ کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ لیکن ابن سینا کی یہ کتاب مفقود ہے البتہ بعض متقدمین نے اس کا مطالعہ کیا ہے تو وہ بتاتے ہیں کہ اس کتاب کا موضوع وحدۃ الوجود ہے تاہم شفا میں عموماً تین علوم پر بحث ہے۔

۱۔ اعلیٰ علوم جن کا مادے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ حکمت اولیٰ یا ماورائے طبیعیات سے عبارت ہیں۔

۲۔ یعنی وہ علوم دنیا جو مادے کے ساتھ مخصوص ہیں یعنی وہ علوم ان اشیا کے ساتھ

مخصوص ہیں جن کی ظاہری حیثیت مادی ہے۔

۳۔علوم وسطی یعنی وہ علوم جن کا تعلق ماوراء الطبیعیات سے عبارت ہے اور مادے سے بھی ہے۔ایسے علوم ریاضیات سے متعلق ہیں جن کا تعلق طبعاً مادے سے نہیں ہے لیکن مقتضائے حال کے لحاظ سے مادے سے ایک گونہ اتصال ضرور ہے۔اسی طرح علم ہندسہ ہے کہ وہ ایسے موجودات سے مخصوص ہے جن کا تخیل بغیر مادی اتصال کے ممکن ہے گو کہ میں ان کا کوئی وجود نہیں یعنی بغیر مرئی اشیا کے ان کا قوام ممکن نہیں البتہ موسیقی ،فنون، آلات اور علوم بصری کو مادے سے قریبی تعلق ہوتا ہے۔اور ان میں سے جو علوم وفنون طبیعیات سے زیادہ قریب ہیں ان کی وقعت زیادہ ہے بعض علوم خلط ملط ہو جاتے ہیں اور ان کی علیحدگی ممکن نہیں ہوتی، جیسے فلکیات ہے کہ وہ علم ریاضی ہے لیکن علم طبیعی کے اعلیٰ طبقے سے مخصوص ہے۔حکما کا خیال ہے کہ ابن سینا گو کہ ارسطو کی کتابوں سے مستفید ہوئے ہیں لیکن ان سے آگے بڑھ گئے ہیں کیوں کہ ارسطو نے فلسفہ نظری کی تین قسمیں کی ہیں:

۱۔ریاضیات

۲۔طبیعیات

۳۔علم لاہوت

اس لحاظ سے ارسطو نے ریاضیات کو فلسفے کی ایک شرح قرار دیا ہے اور ریاضیات سے ایسے فنون منسوب کیے ہیں جو متحرک بھی نہیں اور جو مادے سے منزہ ہیں۔اس کے بعد اس نے دوسرے علوم کا ذکر کیا ہے، جیسے فلکیات، مرئیات اور انجام اور ان کو طبیعات سے منسوب کیا ہے۔تاہم ارسطو کی یہ تقسیم ابن سینا جیسی تقسیم اور اس کی تحقیق کے درجے کو نہیں پہنچی۔ابن سینا نے نہ صرف علوم کی اعلیٰ تقسیم کی ہے بلکہ مختلف فلسفیانہ نظریات پر مفصل بحث کی ہے۔انہوں نے ارسطو کی طرح وجود کے نظریے پر ممکن اور ضروری بحث بھی کی ہے لیکن چند مخصوص خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ابن سینا نے بتایا ہے کہ موجودات کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ایک تو وہ ہیں جو صرف ممکن کے ذیل میں ہیں یعنی پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں۔

۲۔دوسری وہ ہیں جو ممکن کے ذیل میں ہیں لیکن ایک خارجی سبب سے ان میں وجوب پایا جاتا ہے یعنی وہ فانی ہونے کے باوجود باقی رہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

۳۔ تیسری قسم اس ذات برتر تک محدود ہے جو بذاتہٖ واجب ہے اور اسے ہم اللہ کہتے ہیں۔ ابن سینا نے صرف اسی ذات برتر میں وجود، وحدت اور روح کے اتحاد کو تسلیم کیا ہے اور پہلی دو قسموں میں وحدت وجود کو حادث کہا ہے جو اشیا کی روح پر عارض ہیں اور اس کے ساتھ متصل ہو جاتی ہیں۔

بہر حال ابن سینا اپنی ذکاوت کی وجہ سے بے مثل فلسفی قرار دیے جاتے ہیں۔ وہ جن نظریات کو ایک بار ثابت کر دیتے ہیں ان میں پھر ترمیم و تنسیخ کی گنجائش نہ چھوڑتے اور کاٹ چھانٹ میں مطلق وقت صرف نہ کرتے یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام کی تمام تصانیف بہت اہم ہیں اور گو کہ وہ عین شباب میں لکھی گئی ہیں ان میں سے آج بھی اختلاف رائے بہت کم ہوا ہے۔

علامہ جرجانی اور دیگر مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ابن سینا کو جب کبھی کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا تو وہ وضو کر کے جامع مسجد کا رخ کرتے اور نماز نفل پڑھ کر خدا سے اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے دعا مانگتے۔ اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ایمان ان کی ذکاوت کا ایک جز تھا، اور وہ اس قدر بلند و ارفع مقام پر ہوتے ہوئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے رجوع ہوتے اور اسی سے استمداد طلب کرتے۔

ابن سینا کی ذکاوت اور نکتہ سنجی کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ وہ شروع جوانی ہی سے اپنے فیصلے پر اٹل تھے اور ابتدا میں جن علوم کی وہ تحصیل و تکمیل کر چکے تھے اس پر کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ غرض کہ ان کی فطرت سلیم، روشن بصیرت اور قوی ارادے نے ہمیشہ ان کے ایمان میں پختگی اور ان کے عمل میں وحدت پیدا کی۔ اسی لئے ان کی کتابوں کی اہمیت اور افادیت شروع سے اب تک ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ ☆

☆ آہنگ۔ ریڈیو پاکستان۔ ۱۹۸۳ء۔ اوراق گم گشتہ۔ ص ۲۳

بابا فرید گنج شکرؒ

حضرت بابا فرید الدین مسعود ''گنج شکر'' رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اور آپ کابل کے بادشاہ فرخ شاہ کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ بھی اسی خاندان سے تھے۔

بابا صاحب کا اسم گرامی فرید الدین تھا اور لقب گنج شکر اس لیے ہوا کہ آپ کی والدہ ماجدہ آپ کو نماز کا پابند بنانے کے لئے آپ کے مصلے کے نیچے شکر کی ایک پڑیا رکھ دیتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ جو بچے نماز پڑھتے ہیں ان کے مصلے کے نیچے شکر کی پڑیا ملتی ہے۔ اس طرح آپ بچپن ہی سے عبادت اور ریاضت سے شغف رکھنے لگے اور یہ شغف اس قدر بڑھا کہ نوعمری میں ہی آپ کو ''زہد الانبیاء'' بھی کہا جانے لگا۔ اسی زمانے میں آپ اپنے خالہ زاد بھائی حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کے پیر حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ سے نیاز حاصل کرنے کے لئے بغداد تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھے کہ حضرت کے وضو کا وقت ہوا تو بابا صاحب وضو کرانے آگے بڑھے، دیکھا تو حضرت کی ڈاڑھ میں سخت درد تھا۔ بابا صاحب نے وہ درد اپنی ریاضت شاقہ کی برکت سے سلب کرلیا۔ حضرت کو فوراً سکون ملا۔ حضرت نے بہت دعائیں دیں لیکن فرمایا، افسوس کہ تمہارا حصہ میرے پاس نہیں ہے۔ البتہ میں اپنی کتاب ''عوارف المعارف'' تم کو ہدیہ کرتا ہوں۔ اس طرح یہ کتاب بابا صاحب ہی کی وجہ سے ہمارے برصغیر پاک و ہند کو نصیب ہوئی۔

بابا صاحب نے حفظ قرآن اور تعلیم ظاہری کی تکمیل کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی سعادت حاصل کی اور ملک کے طول و عرض میں دین کی

تبلیغ کے لئے سیاحت فرمائی۔ اسی لئے آج تک مختلف شہروں میں آپ کی قیام گاہیں ''تکیوں'' کے نام سے مشہور ہیں۔ بابا صاحب آخر میں اجودھن یعنی موجودہ پاک پٹن میں قیام پذیر ہوئے۔

بابا صاحب ایک رباعی پڑھ رہے تھے اور جھوم رہے تھے، آپ کے مرید حضرت بدر الدین اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ دروازے پر بیٹھے ہوئے نگرانی کر رہے تھے۔ انہیں کسی ضرورت سے باہر جانا پڑا تو حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے عرض کیا کہ بھائی صاحب آپ یہاں دروازے پر بیٹھ جایئے۔ حضرت نظام الدینؒ بیٹھے ہی تھے کہ بابا صاحب کی نظر ان پر پڑی تو ہاتھ اٹھ گئے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ ''الٰہی نظام الدین را محبوب گرداں'' اس وقت سے حضرت نظام الدین اولیاء ''محبوب الٰہی'' مشہور ہوئے۔ جب آپ دہلی میں تھے تو حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتیؒ نے آپ کے لئے دعا کی تھی:

خدایا ہمارے فرید کو قبول فرما۔

بابا صاحب کے وصال کی تاریخ ۵ محرم ۶۶۴ھ کہی جاتی ہے۔ حضرت قطب جمال ہانسویؒ حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت مخدوم علاؤ الدین صابر کلیریؒ آپ کے خاص خلفا ہیں جن کے فیوض و برکات آج بھی جاری و ساری ہیں۔

آپ کے بعض اقوال سے تبلیغ اسلام اور حسن اخلاق کے جو اسباق حاصل ہوتے ہیں، ان کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ آپ فرماتے ہیں:

☆ جیسی تمہاری حقیقت ہے ویسا ہی اظہار کرو۔ یعنی تصنع اور بناوٹ کے قریب بھی نہ جاؤ۔

☆ اگر کچھ ہے تو غم نہیں اور اگر نہیں ہے تب بھی غم نہیں۔

☆ لذت نفس کے لئے قرض لینے سے بہتر یہ ہے کہ فاقے سے مر جائے۔

☆ جس چیز کے لئے کوشش کرو اسے انتہا تک پہنچاؤ۔☆

☆ آہنگ۔ ریڈیو پاکستان۔ اکتوبر ۱۹۸۴ء۔ اوراق گم گشتہ۔ ص ۳۱

مولانا رومؒ

جلال الدین محمد جو مولانا روم کے لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ بلخ میں ۶۰۴ھ مطابق ۱۲۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ وہاں کے امیر علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کو آپ کے والد بہاؤ الدین ولد سے غالباً ان کے علمی وقار اور وجاہت کی وجہ سے عداوت تھی۔ اس لیے وہ جلد ہی اپنے صاحب زادے وغیرہ کے ساتھ بلخ سے کوچ کر کے نیشا پور چلے گئے۔ وہاں شیخ فرید الدین عطارؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے جلال الدین محمد کو گود میں اٹھالیا، خوب دعائیں دیں اور ان کے عظیم المرتبت ہونے کی پیشین گوئی بھی فرمائی، پھر اپنی مثنوی الٰہی نامہ بھی ان کو پیش کی۔ نیشا پور میں رہنے کے بعد یہ پورا خاندان بغداد، مکہ معظمہ ہوتا ہوا قونیہ چلا گیا۔ وہاں جلال الدین محمد کی شادی ۶۲۵ھ مطابق ۱۲۲۸ء میں ہوئی۔ دو بیٹے علاؤ الدین اور بہاؤ الدین پیدا ہوئے اور وہیں مولانا کو ان کے پیر شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری نصیب ہوئی۔ مولانا کے بڑے بیٹے اور پیر شمس تبریز دونوں قونیہ کے ایک فساد میں قتل کر دیئے گئے۔ مولانا وہیں قونیہ میں رہے۔ اور ۶۷۲ھ مطابق ۱۲۷۳ء میں وہیں فوت ہوئے۔

مولانا کی یادگار ایک دیوان ہے جو ان کے پیر کے نام سے ''دیوان شمس تبریز'' مشہور ہے۔ تصوف پر ایک رسالہ ''فیہ مافیہ'' ہے، لیکن سب سے زیادہ شہرت ان کی مثنوی کی ہے جس میں ۶ دفتر ہیں اور (Nicholson) والے ایڈیشن میں ۲۵۹۱۰ اشعار ہیں۔ اس مثنوی کے متعلق یہ مشہور شعر اس کی عظمت اور شہرت کے لئے ہر شخص کے ورد زبان ہے:

مثنوی معنوی مولوی

ہست قرآن در زبان پہلوی

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس مثنوی میں بہ کثرت آیات قرآنی کی تلمیحات ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس میں ۴۰۳ آیات کی تلمیحات کے کئی کئی مقامات ہیں، اور احادیث ان کے علاوہ ہیں۔

مثنوی کی سلاست، روانی اور برجستگی کا یہ عالم ہے کہ اس کے بعد بہ کثرت شعرا نے اس کا تتبع کیا اور علامہ اقبالؒ نے خاص طور پر اس مثنوی کی پیروی میں کئی مثنویاں لکھیں، اور اس مثنوی سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنے ''فلسفہ سخت کوشی'' کی تبلیغ بھی کی۔ علامہ اقبالؒ کی مثنوی اسرار خودی جو مولانا ہی کی زمین میں ہے۔ مولانا کے دیوان کے ان اشعار سے شروع ہوتی ہے:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم وانسانم آرزوست
زیں ہم رہان ست عناصر الم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتند یافت می نشود، جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو ست

کل ایک بزرگ، دن کے وقت چراغ لیے گھوم رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں حیوانوں سے تنگ آ گیا ہوں اور انسانوں کو ڈھونڈتا ہوں۔ میں اپنے ست ساتھیوں سے تنگ آ گیا ہوں اور میں شیر خدا اور رستم کی تلاش کر رہا ہوں۔

لوگوں نے کہا کہ ہم تو بہت ڈھونڈ چکے، انسان تو کہیں ملتا نہیں۔ وہ بزرگ بولا کہ جو نہیں ملتا اسی کو تو میں ڈھونڈتا ہوں۔

چنانچہ یہی سخت کوشی، پیہم جستجو، مسلسل تلاش رومی کا خاص پیام ہے، جس کا خلاصہ ایک مصرعے میں آ گیا ہے:

کوشش بے ہودہ بہ از خفتگی

یعنی اگر یہ معلوم ہو کہ اب کوشش کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، تب بھی کوشش کرنی

چاہئے جو سو رہنے سے بہتر ہے۔ یعنی زندگی اور زندہ رہنے کا ثبوت ہی کوشش میں مصروف رہنا ہے۔

مولانا ایک اور شعر میں بہت خوبی کے ساتھ اس پیام کو پیش کرتے ہیں:

تشنگاں گر آب جویند از جہاں
آب ہم جوید بہ عالم تشنگاں

دنیا میں پیاسے لوگ اگر پانی کی تلاش کرتے ہیں تو پانی خود پیاسوں کی تلاش میں رہتا ہے، کیونکہ دنیا کی ہر چیز انسان کے لئے بنائی گئی ہے لیکن اسی انسان کے لئے جو ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔☆

☆ آہنگ۔ ریڈیو پاکستان۔ ۱۹۸۲ء۔ اوراقِ گم گشتہ۔ ص ۲۸

ولیٔ کامل

حضرت بابا سید محمد تاج الدینؒ ناگپوری

حضرت بابا صاحبؒ نہایت روشن ضمیر با کرامات بزرگ تھے۔ اس مختصر مضمون میں چند کراماتیں ہی پیش کی جاسکتی ہیں۔ بابا صاحبؒ کا فیض عام تھا اور حلقہ ارادت میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی کثرت سے تھے۔ سُکر کی حالت سے صحو میں آجاتے تو شریعت کی پابندی فرماتے۔ اخلاق مثالی تھا۔

حضرت بابا صاحبؒ مہاراجا کے محل کے شیر اور خوں خوار درندوں کے پنجروں میں داخل ہو کر ان کو کھلاتے اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیر کر واپس باہر تشریف لاتے۔

۱۔ تحصیل دار عبدالغفار صاحب سے معلوم ہوا کہ حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں ایک بدعقیدہ شخص آزمائش کے طور پر توجہ کا طلب گار ہوا۔ بابا صاحب نے اسے منع فرمایا۔ جب اس نے بہت زیادہ اصرار کیا تو حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا۔

تاج الدین کی توجہ سے تو پہاڑ بھی پھٹ جاتا ہے۔

آپ کے یہ فرمانے کے ساتھ ہی اس کا خون بہہ نکلا اور وہ ختم ہوگیا۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا۔

مٹی تھا مٹی میں ملا دو۔

۲۔ جناب قطب الدین صاحب قادری اور ان کے بھائی بدرالدین صاحب اپنے عہد شباب میں حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جوانی میں جس طرح عام آدمی

کا حال ہوتا ہے وہی ان حضرات کا حال تھا۔ ایک روز تہجد کے وقت حضرت بابا صاحبؒ نے بہت دور سے ایسی توجہ فرمائی کہ ان ہر دو حضرات کی دنیا ہی بدل گئی۔ شریعت کے پابند ہو گئے۔ قطب الدین صاحب قادری سلسلے میں بیعت ہوئے اور خلافت بھی پائی۔

۳۔ ایک خستہ حال بیل گاڑی والا اپنی بیل گاڑی میں جا رہا تھا اتفاقاً اس کا گزر بابا صاحبؒ کے سامنے سے ہوا۔ دور سے ہی بابا صاحبؒ کو دیکھ کر دل میں خیال کر رہا تھا کہ بابا جی توجہ فرما دیں تو میرے حالات بہتر ہو جائیں۔ جیسے ہی وہ قریب آیا سرکار نے ایک مردہ کتے کی طرف اشارہ کر کے اٹھانے کے لئے حکم دیا۔ تعمیل حکم میں گاڑی میں کتے کو ڈال لیا۔ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ اسے خیال ہوا کہ کتے کو پھینک دوں۔ جیسے ہی اس نے کتے کو ہاتھ لگایا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں بجائے مرے ہوئے کتے کے ایک رقم سے بھری ہوئی تھیلی ہے۔

حضرت بابا صاحبؒ کے سامنے کبھی کسی کو عرض معروض کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی۔ اور نہ آپ کسی کو خصوصی طور پر مخاطب فرماتے۔ بلکہ حاضرین کے جوابات اجتماعی طور پر اپنی روشن ضمیری سے عنایت فرمایا کرتے۔ سائل اپنے اپنے جوابات پا کر مطمئن واپس ہوتے۔

آپ سے بے شمار کرامات ظہور میں آئیں۔ ہزاروں غیر مسلم صاحب ایمان ہوئے۔ آپ کی خدمت میں دنیا کے گوشے گوشے سے حاجت مند حاضر ہوتے اور بامراد لوٹتے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بزرگان دین اور اولیاء اللہ کی کرامات کو منطقی استدلال یا اشیا کے خواص و افعال کے تحت پرکھنا اور سمجھنا محال ہے۔ یہ ایک مخصوص قوت ہے جو بارگاہ الٰہی سے اس کے مقبول اور پسندیدہ بندے کو عطا کی جاتی ہے اور یہ بندے اس عطیۂ الٰہی سے ایسے وقت کام لیتے ہیں جب اس کے اظہار کے سوا چارہ کار باقی نہیں رہتا۔

اولیائے کرام سے ہمیشہ کرامات کا صدور اعلائے کلمۃ الحق، احکام الٰہی کی سربلندی، اور اشاعت اسلام ہی کے سلسلے میں ہوا ہے۔ اپنی ذات کے لئے اپنی کرامات کے زور سے اعلیٰ ملبوسات، عالی شان محلات اور لذیذ مطعومات ان بزرگوں نے کبھی تیار نہیں

کیئے۔ وہ اس عطیۂ الٰہی کو حرص دہوا کی تکمیل میں صرف کرنا گناہِ عظیم سمجھتے تھے۔ انہوں نے لذیذ کھانوں کی بجائے جنگل کے پھلوں اور پتوں پر گزارہ کیا۔ محلات وایوان کے بجائے جھونپڑیوں اور پیڑوں کے سائے میں زندگی گزاری۔ خلعت شاہی کی بجائے مرقع اور گدڑی سے ستر پوشی کی۔ اس لئے کہ ان کا نصب العین صرف یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اس ودیعت کو اس راہ میں نمایاں کیا جائے اور اس راہ میں اس سے کام لیا جائے۔☆

☆ تذکرہ تاج الاولیاء۔ کراچی۔ ۱۹۶۵ء۔ اوراق گم گشتہ۔ ص ۴۱

باب دوم

اساتذہ

حضرت قاری ضیاء الدین احمد الہ آبادیؒ

آپ نارہ (ضلع الہ آباد) میں جمعہ ۲۹ جمادی الاول ۱۲۹۰ھ ۲۵ جولائی ۱۸۷۳ء کو
کے ایک چچا نے انگریزی تعلیم شروع کرادی۔ آپ انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کرنے لگے
تھے لیکن والدہ صاحبہ نے انگریزی تعلیم ناپسند فرمائی اور حفظِ قرآن شروع کرادیا۔

آپ نے جلد ہی اس کی تکمیل کرلی اور عربی درسیات کی طرف مائل ہوکر متوسطات
تک کامیابی حاصل کرلی تھی کہ اسی زمانے میں لکھنؤ میں حضرت قاری عبدالرحمٰن مہاجر مکی علیہ
الرحمہ (م ۱۳۴۹ھ) کا ورودِ مسعود ہوا۔ ان کی شہرت سن کر آپ نے لکھنؤ جانے کا ارادہ کیا۔ گھر
سے کچھ رقم لی اور والدہ صاحبہ کے نام ایک رقعہ لکھا کہ آپ پریشان نہ ہوں، میں تجوید وقرات
سیکھنے کے لئے لکھنو جارہا ہوں اور میں نے آپ کی اتنی رقم ساتھ رکھ لی ہے۔ رقعہ گھر میں چھوڑ کر
آپ لکھنؤ پہنچے تو حضرت قاری صاحب بڑی شفقت سے پیش آئے اور جلد ہی قراتِ عشرہ تک
تکمیل کرادی۔ آپ کی نمایاں کامیابی کی وجہ سے آپ کو امروہہ میں تجوید وقرات کی تدریس
کے لئے بلوایا گیا۔ آپ نے عذر کیا کہ میں نے درسیات کی تکمیل نہیں کی اس لئے میں ابھی نہ
جاسکوں گا۔ لیکن اصرار ہوا اور آپ کو سہولت دی گئی کہ امروہہ میں درسیات کی تکمیل بھی کرسکتے
ہیں۔ چنانچہ آپ نے ۱۸۔۱۹ سال کی عمر میں مدرسی شروع کی اور مولانا احمد حسن محدث
امروہویؒ سے درسیات کی تکمیل بھی کرلی۔

تجوید وقرات کے مدرسے میں بعض فارغ التحصیل علماء بھی آپ کے شاگرد
ہوئے۔ آپ فرماتے تھے کہ بعض علماء ایسے سوالات بھی کرتے تھے جن کا جواب میرے لیے
مشکل تھا۔ لیکن میں اپنے استادِ محترم حضرت قاری صاحبؒ کا تصور کرتا تھا تو فوراً جواب بن

جاتا تھا۔(۱)

عربی میں آپ کی قابلیت اور صلاحیت کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ بے تکان عربی نظم بھی لکھ لیتے تھے اور بعض عرب بھی آپ سے عربی پڑھا کرتے تھے۔ امروہہ میں کئی سال رہنے کے بعد آپ مدرسہ تجوید القرآن سہارنپور، مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ، مدرسہ قراۃ القرآن کانپور، مدرسہ فرقانیہ

۱۔ حضرت قاری عبدالرحمٰن مکی علیہ الرحمہ کی فوائد مکیہ بہت مقبول ہے اور اب بھی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ آپ نے قرأت سبعہ پر اردو میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ وہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ ایک قاری صاحب کی اصلاح کے لئے ایک مقالہ لکھا تھا۔ وہ رسالہ اور یہ مقالہ راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ حضرت قاری عبدالرحمٰن علیہ الرحمہ حسنِ ادا اور حسنِ صوت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ سننے والے بے تاب ہو جاتے تھے۔ میں علی گڑھ میں تھا تو ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ کو قاری ضیاء الدین احمد صاحب نے ۱۲ بجے دن کو خواب میں دیکھا کہ حضرت قاری عبدالرحمٰن علیہ الرحمہ تلاوت فرما رہے ہیں اور ایسی کیفیت ہے کہ قاری ضیاء الدین احمد صاحب کے چچا مولانا منیر الدین صاحب کو وجد آ گیا اور قاری ضیاء الدین احمد صاحب چیخ اٹھے جس سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ میں نے یہ واقعہ الہ آباد جا کر مولانا منیر الدین احمد صاحب علیہ الرحمہ کو (مدرسہ سبحانیہ میں) سنایا تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ مولانا منیر الدین احمد صاحب علیہ الرحمہ بہت بڑے عالم تھے۔ ذی قعدہ ۱۳۵۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ راقم الحروف نے یہ تاریخی مصرعے لکھے:

حجتِ	اسلام،	فرقِ		فرقداں	
۸	۵	۳		۱ھ	
محسنِ	دوران	فقیہ	دین	رفت	
۸	۵	۳		۱ھ	
جہبذ	النحریر	ونورِ	تاج	دیں	
۹	۳	۹		۱ء	
ہادیِ	تکویں،	بعلیّین		رفت	
۸	۵	۳		۱ھ	
زیں	جہانِ	خستہ	و	ماتم	سرا
۹	۳	۹			۱ء
قبلہ	علامہ	منیر	الدین	رفت	
۸	۵	۳		۱ھ	

جونپور میں بھی تعلیم فرماتے رہے۔ لکھنؤ میں مولانا عین القضاۃ علیہ الرحمہ نے آپ ہی کے مشورے پر اپنے مدرسے کا نام فرقانیہ رکھا تھا۔ لکھنؤ اور الٰہ آباد کے مدرسوں میں معمول یہ تھا کہ قرأتِ سبعہ تک آپ ہی تعلیم دیتے تھے، پھر قرأت عشرہ کی آپ کے استاد محترم تکمیل کرایا کرتے تھے۔ ان کے انتقال (۱۳۴۹ھ) کے بعد آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں استاد مقرر ہوئے اور کئی سال تک وہاں کے انگریزی والے طلبہ کو مستفیض فرماتے رہے۔

آپ کی اسی فضیلت کی وجہ سے مولانا شبیر احمد عثمانی کی دستار بندی کے لئے آپ کو دیوبند بلایا گیا تھا اور یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ آپ کے چار صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں چاروں صاحبزادے عالم، حافظ اور قاری تھے۔ سب سے بڑے صاحبزادے (جن کا نام مجھے اب یاد نہیں) بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ پھر قاری عصام الدین احمدؒ، قاری مستجاب الدین احمدؒ اور قاری محب الدین احمدؒ تھے۔ قاری عصام الدین احمدؒ بھی علی گڑھ میں عرصے تک تجوید وقرأت کے استاد رہے تھے۔ قرآن پاک کی کتابت بھی کرتے تھے اور ان کی کتابت والے قرآن پاک لکھنؤ سے شائع ہوتے تھے۔ قاری مستجاب الدین احمدؒ بنارس میں تھے اور قاری محب الدین احمدؒ الٰہ آباد میں، پھر لکھنؤ میں آخر وقت تک قرأتِ عشرہ کی تعلیم دیتے رہے اور اپنے فن میں کمال کی وجہ سے پورے برصغیر پاک و ہند میں شہرت رکھتے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت قاری ضیاء الدین احمدؒ ہی کے سلسلے کے قرا پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ قاری محب الدین احمدؒ نے کئی فاضلانہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں اور انہوں نے پوری تعلیم (شروع سے آخر تک) اپنے والد صاحبؒ سے ہی حاصل کی تھی۔

قاری ضیاء الدین احمد علیہ الرحمہ کے مشہور شاگردوں قاری محمد نظر، قاری محمد صدیق بنگالی، قاری محمد اظہر امروہوی، قاری محمد سلیمان، قاری عبداللہ، قاری عبدالمالک، قاری حفظ الرحمٰن وغیرہ تھے۔ اور ان شاگردوں نے کئی کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ بعض شاگرد جنات بھی تھے جن کے واقعات حضرت قاری صاحب نے راقم الحروف کو بتائے تھے۔

آپ کی تصانیف میں ضیاء القرأت بہت مشہور ہوئی اور اس کے بہ کثرت ایڈیشن ہندوستان میں اور پھر پاکستان میں بھی شائع ہوئے۔ یہ کتاب پہلے سہارنپور میں لکھی گئی تھی۔ بعد میں ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء میں نظر ثانی کے بعد شائع ہوئی۔ کتاب اردو میں ہے اور اس کے آخر

میں حروف وصفاتِ حروف سے متعلق ۳۵۔اشعار عربی میں ہیں۔دوسری کتاب خلاصۃ البیان عربی میں ہے جو پہلی بار ۱۳۲۰ھ میں اور دوسری بار ۱۳۳۴ھ میں شائع ہوئی۔اور وہ مدرسہ صولتیہ، مکہ معظمہ میں بھی داخلِ نصاب رہی۔ بعد میں حضرت قاری محمد ایوب سورتی صاحب نے ۱۳۹۸ھ میں اس کی اردو شرح شائع کی۔۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء میں آپ نے ایک مشہور قاری صاحب کے فائدے کے لئے ایک بلند پایہ کتاب لکھی جو حضرت قاری صاحب کے شاگرد قاری محمد اظہر صاحب نے اپنے نام سے شائع کی اور اس کا نام اشعۃ الضیاء رکھا۔آخر عمر میں آپ قصیدۂ رائیہ اور خلاصۃ البیان کی بھی شرح لکھ رہے تھے۔لیکن کمزوری کی وجہ سے پوری نہ کر سکے۔

۱۹۳۱ء میں جب راقم الحروف نے علی گڑھ میں بی اے میں داخلہ لیا تو حضرت قاری صاحب نے وہاں تجوید وقرأت پڑھانی شروع کی۔آپ کی سادہ طبیعت جو نام ونمود سے دور تھی طلبہ کے لئے بہت جاذبِ نظر تھی۔ان کے اطوار واخلاق خالص شریعت کے تابع تھے۔اور حقیقت یہ ہے کہ راقم الحروف کو شریعت سے جو تھوڑی سی مناسبت پیدا ہوئی وہ انہی کے فیضِ نظر کا صدقہ ہے۔میرا جی چاہتا تھا کہ ان کو دیکھتا رہوں اور ان کی شرعی زندگی کو اپنانے کی کوشش کروں۔کلاس کے کمرے میں ان کا پیک دان رکھا رہتا تھا۔میں اپنی شیروانی کے دامن میں چھپا کر اسے لے جاتا تھا اور صاف کر کے خاموشی سے رکھ جاتا تھا۔ایک مرتبہ حضرت قاری صاحبؒ کو اس خدمت کا اندازہ ہوا تو مجھے بہت دعائیں دیں۔اور میری تعلیم پر خصوصی توجہ فرمائی۔مسلم یونیورسٹی میں یہ عاجز ان سے روایت حفصؒ کی سند سے فیض یاب ہونے والا پہلا طالب علم تھا۔انہوں نے مجھے عربی صرف ونحو کی تعلیم دی اور ایک دن بڑی شفقت سے فرمایا کہ ان شاء اللہ تم کو شاطبی شریف پڑھاؤں گا۔میری نوعمری تھی۔اس نعمت کی قدر نہ ہوئی اور علی گڑھ میں ۱۹۳۶ء تک اپنی دنیوی تعلیم کی تکمیل کرتا رہا۔پھر وطن واپس آیا رخصت ہوتے وقت حضرت قاری صاحب نے میری درخواست پر میری ڈائری میں یہ نصیحت فرمائی:

> اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ڈرتے رہیں، اس کے احکام دل وجان سے بجالاتے رہیں اور اس سے ہمیشہ اچھی امید رکھیں۔

بعد میں راقم الحروف کو حدیثِ مصافحہ عنایت فرمائی تھی جس کے راوی ایک جن صحابی تھے۔

۱۹۳۷ء میں پبلک سروس کمیشن نے مجھے کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراؤتی (برار) میں اردو کا استاد مقرر کیا۔ حضرت قاری صاحب کی خدمت میں برابر عریضے روانہ کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں ان کا ایک گرامی نامہ ملا کہ میں نے تم سے شاطبی شریف پڑھانے کا وعدہ کیا تھا۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ میں اپنا وعدہ پورا کرنے کیلئے تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔ میں حیرت میں رہ گیا کنواں پیاسے کے پاس آرہا ہے اور وہ پیاس بھی ایسی جس کی مجھے قدر نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ حضرت قاری صاحب ستر سال کی عمر میں قریب ایک ہزار میل کا تن تنہا سفر کر کے (کہ راستے میں کئی جگہ گاڑی بدلنی پڑی) امراؤتی پہنچ گئے۔ (۲) اور اپنے وعدے کے ایفا میں مشغول ہو گئے۔ حضرت نے ہر فرصت میں صبح سے رات تک کئی کتابیں پڑھائیں۔ تحفۃ الاطفال، مقدمۃ الجزری بھی اسی موقع پر میں نے پڑھیں اور شاطبی شریف جیسی ادق کتاب بھی مجھ عاجز کو پڑھا کر وعدے سے فارغ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان پر لاکھوں اور کروڑوں رحمتیں ہر لحہ نازل فرمائے۔ ثم آمین

اس موقع پر حضرت کے ایک مشہور شاگرد قاری عبدالمعبود صاحب جبل پوری کے والد مولانا عبدالرب صاحب نے مجھے یہ اشعار لکھ کر بھیجے۔

ہو مبارک آپ کو قاری غلامِ مصطفیٰ
حضرت استادِ اعظم نے کیا رنجہ قدم
اے زہے طالع مکاں کے جس میں ہوں رونق فزا
افسر القرأ ضیاء الدین احمد محترم
پیش کش کرتا ہے عبدالرب بطورِ تہنیت
گرقبول افتد زہے الطاف و صد گونہ کرم

۲۔ وہ اتوار ۲۴۔ اگست ۱۹۴۱ء کو امراؤتی پہنچے۔ اور ۶ ستمبر کو واپس تشریف لے گئے۔ میں ناگ پور تک ان کو پہنچانے گیا۔ وہاں سے وہ دوسرے دن ۶ بجے شام کو جبل پور کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں میرے ماموں مولوی عبدالمجید خان صاحب کے یہاں قیام فرمایا۔ مولانا عبدالرب صاحب اور میرے بڑے بھائی حاجی نذیر احمد خان صاحب وغیرہ نے بھی نیاز حاصل کیا۔ پھر وہاں سے آپ الہٰ آباد کے لئے روانہ ہوئے۔

حضرت قاری صاحب نہایت سادہ لباس پہنتے تھے اور نہایت سادہ غذا کھاتے تھے۔ میں نے اکثر ان کو دو کی روٹی کھاتے دیکھا ہے۔ غریب خانے پر جتنے دن قیام فرمایا صرف سادہ غذا کو پسند کرتے تھے۔ اگر دن کے وقت گذشتہ رات کا سالن بھی ہوتا تھا تو دن کا سالن چھوڑ کر صرف رات کا سالن کھانا پسند فرماتے تھے۔ آپ نے سخت محنت کی تھی اور بعض شاگردوں کو (مثلاً قاری عبداللہ مراد آبادی کو) ۱۵ دن میں شاطبی مکمل کرادی تھی اس لئے تنفس کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔ مجبوراً چائے میں دارچینی کا استعمال فرماتے تھے۔ دسترخوان پر کوئی لذیذ کھانا ہوتا تھا تو اکثر سب کا سب غریبوں میں تقسیم کرادیتے تھے۔ پھر کسی موقع پر انہوں نے دو بزرگوں کے واقعات سنائے کہ ایک بزرگ کی کہیں دعوت ہوئی تو وہاں دو کھانے تھے۔ انہوں نے میزبان سے فرمایا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے کس طرح فرصت ملی کہ آپ نے دو کھانے تیار کرنے میں وقت صرف کیا؟ ایک اور بزرگ کا واقعہ فرمایا تھا کہ انہیں مچھلی کھانے کا شوق تھا اور وہ ایسی جگہ تھے جہاں بہ مشکل مچھلی دستیاب ہوسکتی تھی۔ اتفاق سے ایک مرتبہ دستیاب ہوئی۔ تیار کرکے دسترخوان پر رکھی تو اسی وقت ایک مسکین نے آواز دی۔ آپ نے فوراً سب کی سب اٹھا کر اسے دے دی۔ ایک مرتبہ اس عاجز نے آپ سے عرض کیا کہ مجھ سیاہ کار کو بھی کیا ایسی سعادت حاصل ہوسکتی ہے کہ آخرت میں آپ کی خدمت میں رہوں؟ اس جملے سے ان پر رقت طاری ہوگئی اور دعا فرمائی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے سادہ مزاج، بے لوث، اہل ورع وتقویٰ بزرگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ (۳)

شنبہ ۷ ربیع الاخر ۱۳۷۱ھ/ ۵ جنوری ۱۹۵۲ء کو آپ نے انتقال فرمایا۔ (۴) اس عاجز

۳۔ حضرت قاری صاحب کے ساتھ حج کے لیے جانے کی بڑی آرزو تھی لیکن افسوس کہ اس زمانے میں یہ سعادت نصیب نہ ہوسکی۔

۴۔ امداد صابری نے اپنی کتاب فیضانِ رحمت کے صفحہ ۱۰۴ میں لکھا ہے کہ قاری ضیاء الدین احمد علیہ الرحمہ نے الہ آباد کے دائرۂ شاہ محب اللہؒ میں مدرسۂ قرآنیہ کے حافظ اجیر الدین صاحب سے قرآن پاک حفظ کیا تھا۔ صفحہ ۱۰۷ میں ہے کہ شاہ عبدالرزاق گورکھپوریؒ سے نقشبندی سلسلے میں بیعت ہوئے تھے اور صفحہ ۱۰۸ میں ہے کہ الہ آباد کے دائرۂ شاہ رفیع الزماںؒ کے سجادہ نشین حکیم سید محمد احسنؒ نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی تھی۔

نے یہ قطعۂ تاریخ لوحِ مزار کے لئے لکھا:

روضۂ کنز المعانی

۰ ۹ ۲ ۱ھ

حفص التجوید والقراءات

۱ ۷ ۳ ۱ھ

حجت القراء مولانا مولوی حافظ

۲ ۵ ۹ ۱ ء

قاری ضیاء الدین احمد صاحب

۱ ۷ ۳ ۱ھ

انار اللہ برہانہٗ

۱۹۵۲=۵۸۱+ء

ضیاء الدین احمد بحرِ الطاف

۰ ۹ ۲ ۱ ھ

کزو دیں پاک وجہ و پر ضیا گشت

۳ ۷ ۸ ۱ ء

بہ تجوید وقراءت فوزِ عالم

۱ ۷ ۳ ۱ھ

بہ ورع و یاد فخرِ اولیا گشت

۲ ۵ ۹ ۱ ء

ادب آموز ازو حفاظ و قرآء

۱ ۷ ۳ ۱ھ

سرِ نو انس و جاں را مقتدا گشت

۲ ۵ ۹ ۱ ء

بہ طبعِ جیدہ شمس الضحیٰ بود
۱ ۷ ۳ ۱ھ

بہ ذہنِ قامعہ بدرالدجیٰ گشت
۲ ۵ ۹ ۱ ء

ز موت العالم آں حق موت العالم
۱ ۷ ۳ ۱ھ

مظہر دینِ کامل بے ضیا گشت
۲ ۵ ۹ ۱ ء

حضرت قاری صاحب خط لکھنے میں بھی سنت کی پیروی فرماتے تھے اور اس طرح شروع فرماتے تھے۔

از بندۂ ضعیف ضیاء الدین غفرلہ بخدمتِ محب مکرم جناب...... زید لطفہٗ (۵)☆

۵۔ راقم الحروف کے نام آپ کے بارہ خطوط رسالہ اردو۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی کے اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

☆ طوبیٰ لہم۔ ص ۲۳

مولانا سلیمان اشرفؒ

راقم الحروف کی طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ کے یونیورسٹی اسکول میں آٹھویں جماعت تک تعلیم تھی۔ پھر انٹرمیڈیٹ کالج میں نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں جماعتیں تھیں جن کی تعلیم منٹو سرکل میں ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد یونیورسٹی میں بی اے، بی ایس سی سے تعلیم شروع ہوتی تھی۔ میں نے ۱۹۲۹ء میں وہاں سے میٹرک پاس کیا۔ اس زمانے میں اس کلاس میں سات سیکشن تھے۔ میں ایف سیکشن میں تھا اور جبلی ہوسٹل میں رہتا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں جب کہ میں مزمل ہوسٹل میں تھا انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ پھر بی اے میں داخلے کے لئے یونیورسٹی گیا۔ وہاں ایس ایس ویسٹ، پھر عثمانیہ ہوسٹل میں قیام رہا۔ اس وقت میری عمر قریب ساڑھے اٹھارہ سال تھی۔ یونیورسٹی کی جامع مسجد میں نماز کے لئے حاضر ہوتا تھا۔ وہیں عصر کے بعد مولانا سلیمان اشرف علیہ الرحمہ تفسیر پڑھاتے تھے اور مغرب کے بعد بخاری شریف کا درس (بعض دنوں میں) دیا کرتے تھے۔ میں بھی شریک ہوا تو دریافت فرمایا کہ ''تو کہاں سے آیا ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ ''جبل پور (سی۔ پی) سے''۔ فرمایا، وہاں میرا ایک دوست عبدالسلام رہتا ہے۔ کیا تو اسے جانتا ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ ''وہ تو میرے مخدوم ہیں۔'' فرمایا، ''اب تو وہاں جائے تو میرا سلام کہنا۔'' میں نے عرض کیا کہ ''ان شاء اللہ عرض کر دوں گا۔'' چنانچہ تعطیل میں جب میں وطن گیا تو مولانا کا سلام ان کے دوست سے عرض کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے بھی سلام عرض کرنے کے لئے فرمایا۔

میں جب تفسیر کلاس میں شریک ہوا تو اس وقت مولانا (غالباً) سورۃ الشعراء پڑھا رہے تھے۔ اس سورت کی آیت نمبر ۲۰ میں ''ضالین'' کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ''بے خبر

لوگوں" کے بھی ہیں۔ مولانا ہم لوگوں سے فرداً فرداً اس کے معنی پوچھنے لگے کہ "تو بتا۔ تو بتا" (شاگردوں سے ان کے خطاب کا یہی طریقہ تھا)۔ سب لڑکے چپ تھے۔ کوئی بھی نہ بولا۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے معنی "گمراہ لوگوں" کے ہیں۔ مولانا نے گرج کر ڈانٹا کہ "چپ بے، نالائق۔" میں لرز گیا۔ خیر، بات ختم ہوگئی اور میں برابر تفسیر کلاس میں شریک ہوتا رہا۔ مولانا کا معمول تھا کہ جب پورے قرآن پاک کی تفسیر مکمل ہوجاتی تو وہ یونیورسٹی ہال کے قریب ملا احمد کی دکان سے بہت سی مٹھائی منگواتے، کیوں کہ وہ بہت اچھی مٹھائی بناتا تھا۔ مٹھائی کی تقسیم کے دن، تفسیر پڑھنے والوں سے کہیں زیادہ دوسرے طلبہ اس میٹھی تقریب میں شریک ہوتے اور مولانا اس دن سب کو نوازتے۔

تفسیر پڑھانے کا قاعدہ یہ ہوتا کہ ایک طالب علم ترجمہ کرتا، پھر مولانا اس کی تفسیر بیان فرماتے۔ اور جس طرح وہ بی اے کلاس میں ہم لوگوں کو مدلل طریقے سے سمجھاتے، یہاں بھی وہی انداز اختیار فرماتے۔ میں نے مزمل صاحب مرحوم کے زمانے سے لے کر انوار احمد صمدانی صاحب مرحوم تک کا زمانہ پایا ہے۔ یعنی یہ اور دوسرے حضرات ترجمہ پڑھ کر آتے اور اسی کے مطابق وہاں ترجمہ کرتے۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ عربی صحیح سیکھنے کے لئے قرآن پاک خوب پڑھا کرو۔ تفسیر کی کلاس **عصر** کی نماز کے بعد ہوا کرتی تھی۔ آیاتِ سجدہ کی تلاوت کی وجہ سے سجدہ مغرب سے پہلے کرلیا کرتے تھے، تاکہ بھول نہ جائیں، حالانکہ غروب کے بعد (اور طلوع کے بعد) ایسا سجدہ کرنا **افضل** ہے۔ مولانا کی آواز گرجدار اور رعب دار تھی۔ اس لیے کبھی نماز پڑھاتے تو قرآن کی تلاوت بہت اثر آفریں ہوتی تھی اور عجیب کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ کلاس میں بھی انکا اندازِ بیان بہت پرتاثیر اور مدلل ہوتا تھا اور ہم لوگوں کی غلطی پر برملا اصلاح فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ پڑھاتے ہوئے فرمایا کہ جس پانی کا رنگ اور مزہ بدل جائے اس سے وضو جائز نہیں۔ میرا لڑکپن تھا، میں نے عرض کیا کہ پانی میں پٹاس ملا دینے سے بھی پانی کا رنگ اور مزہ بدل جاتا ہے تو کیا ایسے پانی سے وضو نہیں کرنا چاہئے؟ مولانا ایک لمحے تک خاموش رہے لیکن پھر فرمایا کہ نہیں، ایسے پانی سے وضو جائز ہے (میں سمجھ رہا تھا کہ شاید پھر ڈانٹ پڑے گی۔ لیکن پھر یہ اعزاز نہیں ملا)۔

مولانا بہت خوش رو اور جامہ زیب تھے۔ علی گڑھ کٹ پاجامے سے ذرا ڈھیلا پاجامہ ہوتا تھا۔ کرتہ اور عموماً نہایت اعلیٰ کپڑے کی شیروانی ہوتی تھی۔ بلکہ سردی کے زمانے میں روئی کی شیروانی بھی بہت خوب صورت ہوتی تھی۔ ایسی شیروانی کی لمبی دھاریوں کے ساتھ سلائی ہوتی تھی۔ بڑا رومال، سرخ اور سیاہ پھولوں والا ہوتا تھا۔ سر پر عموماً لکھنوی سفید ٹوپی یا عمامہ (عموماً ہلکے بادامی رنگ کا) ہوتا تھا۔ آپ کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ نہایت متوازن اعضا تھے، آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے، ہتھیلیوں کی لکیریں لمبی اور بہت نمایاں تھیں۔ آپ کا خدمت گزار ایک پہلوان تھا۔

آپ کے ایک بھائی بھی تھے ان کا دماغ ماؤف تھا۔ وہ بھی بڑے عالم تھے۔ بالکل خاموش رہتے تھے لیکن پابندی کے ساتھ یونیورسٹی لائبریری میں صرف عربی اخبار پڑھا کرتے تھے۔ راستے میں چلتے چلتے کھڑے ہوجاتے اور کبھی دیر تک سر جھکا کر زمین کو دیکھتے رہتے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا بہت بڑا محافظ ہے۔ سنا ہے کہ مولانا کی وفات سے پہلے ان کے بھائی فوت ہوگئے تھے۔ آخر مولانا کے بعد ان کی سرپرستی کون کرتا؟

مولانا گوکہ بریلوی مسلک کے تھے لیکن آج کل کے بریلوی حضرات کی طرح شدت نہیں برتتے تھے۔ وہ ہمیشہ مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری علیہ الرحمہ کے پیچھے نماز ادا کرتے جو دیوبندی تھے اور جب وہ کہیں چلے جاتے تھے تو (حضرت قاری ضیاء الدینؒ کی ضعیفی کی وجہ سے) جمعہ کی نماز قاری انوار الحق صاحب ہی پڑھاتے تھے۔ وہ بھی دیوبندی مسلک کے تھے۔ بعض نمازیں مولانا بھی پڑھا دیتے تھے لیکن اقامت شروع ہوتے ہی نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے یعنی حی علی الصلوٰۃ سن کر کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ اور اشھد ان محمد رسول اللہ سن کر دونوں ہاتھوں کا سبابہ (انگوٹھے کے پاس کی انگلی) لبوں پر لگا کر (چوم کر) آنکھوں پر لگاتے تھے۔ انہوں نے یا ان کے مسلک کے کسی بریلوی عالم نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی حاضر و ناظر نہیں کہا۔ مسجد کے لئے عموماً ابوبکر محمد شیث علیہ الرحمہ کے ساتھ (اور نواب حبیب الرحمٰنؒ شروانی اگر ہوتے تو وہ بھی ساتھ) تشریف لے جاتے لیکن ان کے ادب کی وجہ سے ان کے پیچھے پیچھے چلتے۔ تاہم آخر زمانے میں ایسا بھی میں نے دیکھا ہے کہ مولانا ابوبکر علیہ الرحمہ ان کا ادب کرنے لگے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے تھے۔ بہر حال، یہ دونوں

بزرگ ہر شخص کے لئے قابلِ احترام تھے اور ہر جگہ ان کی بزرگی کا چرچا تھا۔

میں نے ۱۹۳۶ء میں دو ایم اے اور ایل ایل بی سے فراغت کے بعد علی گڑھ چھوڑا۔ اس وقت حافظ فضل الرحمٰن صاحب مرحوم (مولانا نورانی کے عزیز) مجھ سے دو سال پیچھے تھے اور محترم ڈاکٹر مختار الدین آرزو صاحب بھی یونیورسٹی کی ابتدائی جماعتوں میں تھے۔ علی گڑھ چھوڑنے کے بعد میرا تقرر کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراؤتی (برار) میں ہوگیا۔ مولانا کا جس دن انتقال ہوا میں اپنے ایک دوست کے ساتھ حیدر آباد (دکن) میں تھا۔ ریڈیو سے مولانا کے انتقال کی خبر سنی تو سخت قلق ہوا۔ ان کے لئے دعا کی اور ایصال ثواب کیا۔ اسی رات مولانا خواب میں تشریف لائے، دوسری رات پھر تشریف لائے اور تیسری رات پھر تشریف لائے تو مجھے خواب ہی میں خیال آیا کہ مجھے ایک مرتبہ ڈانٹا تھا، شاید اسی وجہ سے مسلسل تین راتوں سے تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تو میرے استاد ہیں اور والدین کی طرح شفقت فرماتے ہیں، آپ کوئی خیال نہ فرمائیں۔ پھر اس کے بعد کبھی خواب میں تشریف نہیں لائے، اللہ تعالیٰ ان پر بے حساب رحمتیں اور نعمتیں ہر وقت نازل فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ ☆

☆ طوبیٰ لہم۔ ص ۵۰۔ سراج البیان۔ ص ۹۳

مولانا احسن مارہرویؒ

مولانا سید علی احسن (عرف شاہ میاں) مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں ۲۲ شوال ۱۲۹۳ھ کو پیدا ہوئے۔ نو سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا اور جلد تکمیل کر لی۔ پھر علومِ دینیہ وغیرہ اپنے والد شاہ مجتبیٰ احسنؒ اور دیگر اساتذہ سے حاصل کیے۔ ۱۳۱۰ھ میں اپنے والدین کے ساتھ حج کے لئے روانہ ہوئے۔ رمضان المبارک میں بیت المقدس (مسجدِ اقصیٰ) میں تراویح پڑھائی۔ پھر حج کیا اور مکہ معظمہ میں تجوید وقرات کی تکمیل کی۔ والدہ ماجدہ مکہ معظمہ میں فوت ہو گئیں اور واپسی پر بمبئی میں والد ماجد نے بھی داغِ مفارقت دیا۔ وطن آ کر والد ماجد کی وفات پر ۱۳۱۱ھ میں ''تواریخ محزن وبکا'' کے تاریخی نام سے قطعات لکھے۔(۱) دوسرے سال یعنی ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) میں خط وکتابت کے ذریعے حضرت داغ کے شاگرد ہوئے۔ پھر ۱۸۹۶ء میں حیدرآباد دکن جا کر استاد کا قرب حاصل کیا۔ اور ۱۹۰۲ء میں جلوۂ داغ کا ڈول ڈالا۔ ۱۹۰۳ء تک وہاں قیام رہا۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے ایک گلدستہ، ریاضِ سخن کے نام سے جاری کیا تھا جو نواب ابراہیم علی خان (والی ٹونک) کو بہت پسند آیا تھا اور انہوں نے ایک ہزار روپیہ انعام کے طور پر عطا فرمایا تھا۔ اسی گلدستے کا نام مولانا نے پھر ریاضِ خلیل کر دیا تھا۔

استاد داغ کے انتقال پر ۱۹۰۵ء میں مولانا نے لاہور سے رسالہ فصیح الملک جاری کیا جس میں چند صفحات فصیح اللغات کے ہوا کرتے تھے۔ لاہور ہی سے استاد مرحوم کا بقیہ کلام ''یادگارِ داغ'' (چوتھا دیوان) شائع کیا اور وہیں لالہ سری رام کے خم خانۂ جاوید (تذکرۂ شعراء) کی تدوین میں بھی حصہ لیا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد آپ وطن واپس آ گئے۔ ۱۸ نومبر

۱۔ ابتدائی زمانے میں مجمع البرکات، قصائدِ صاحب عالم مرتب کئے ہوں گے۔ وہ میں نے نہیں دیکھے۔

۱۹۱۴ء کو مولانا شبلی نے اور اسی سال ۲۱ دسمبر کو مولانا حالی نے انتقال کیا تو مولانا نے ایک پُر درد مرثیہ کسوف الشمسین کے نام سے مرتب کیا۔(۲) پھر ۱۹۱۷ء میں آپ ایک بار پھر حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے اور وہاں ولی کے دیوان کی تدوین میں مصروف رہے۔ ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء میں اس کی تکمیل پر (صنعتِ مستزاد میں) کیا خوب قطعۂ تاریخ لکھا ہے:

دیوانِ ولی ختم بوجہ احسن اب آ کے ہوا

۸ ۳ ۳ ۱ ھ

۱۹۲۰ء میں جب تارکانِ موالات نے گاندھی کی معیت میں علی گڑھ کالج پر یورش کی اور اس پر قبضہ کرلیا تو مولانا بے تاب ہوگئے اور اس قومی ادارے کی مدافعت میں ''قوم کا مطالبہ'' اور ''علی گڑھ کالج کی فریاد'' نظمیں شائع کیں جو ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہوئیں۔

۱۹۲۲ء میں صاحبزادوں کی تعلیم کے سلسلے میں مولانا علی گڑھ تشریف لے گئے تو وہاں انٹرمیڈیٹ کالج میں اردو کے لیکچرر مقرر کرلئے گئے۔ پھر ۱۹۳۴ء سے ایم اے کلاسیں پڑھانے لگے اور ۱۹۳۸ء تک مصروف رہے۔ اسی زمانے میں آپ نے نظامِ دکن میر عثمان علی خان کی دو فارسی نثری تحریروں کو اردو نظم میں منتقل کیا اور اس کا نام ''شاہ کارِ عثمانی'' رکھا۔ یہ واقعہ ۲۳ مارچ ربیع الآخر ۱۳۶۵ھ (۳ جولائی ۱۹۳۷ء) کا ہے۔ ۱۳۶۵ھ/۱۹۳۸ء میں آپ علی گڑھ سے رخصت ہونے لگے تو چونسٹھ اشعار کی ایک نظم ''رخصتی میز'' (تاریخی نام سے) مرتب کی جس میں اساتذہ وطلبہ سے تعلقات کا ذکر ہے۔ اسی زمانے میں شہدائے کربلاؑ کی یاد میں کارنامۂ غم کے تاریخی نام سے سلاموں اور رباعیات کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ دوسرے سال ''انشاء داغ'' کے تاریخی نام سے استاد مرحوم کے خطوط کا مجموعہ مرتب کیا۔ پھر کلامِ داغ کا ایسا انتخاب تیار کیا جس کے ایک حصے مین وہ کلام ہے جس میں فارسی عطف واضافت نہیں لیکن دوسرے حصے میں یہ پابندی نہیں۔ یہ مجموعہ منتخبِ داغ کے نام سے انوار احمدی پریس الہٰ آباد نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا ہے۔

۲۔ نظامی پریس بدایوں سے کسوف الشمسین اور اردو لشکر شائع ہوئی تھیں تحفۂ احسن (بچوں کے لئے منظوم کہاوتیں) بھی غالباً وہیں سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا کے دیوان کے مقدمے میں راقم الحروف نے ان کی شاعری پر بحث کی ہے۔

علی گڑھ سے فارغ ہونے کے دو سال بعد آپ کی پیٹھ میں کاربنکل پھوڑا نکل آیا۔ آپ کے صاحبزادے ڈاکٹر انعام احسن صاحب اس وقت پٹنہ میں تھے۔ وہاں پھوڑے کا آپریشن کرایا لیکن کامیاب نہ رہا۔ اور وہیں جمعہ ۳۰ اگست ۱۹۴۰ء کو آپ نے داغِ مفارقت دیا لیکن تدفین مارہرہ میں ہوئی۔

ربکم یدخل جنت

۲۶ رجب ۱۳۵۹ ھ

حضرت احسن نے قریب ۴۸ سال تک علم و ادب کی خدمت کی۔ اس مدتِ مدید میں بعض علمی معرکے بھی ہوئے لیکن آپ نے ہمیشہ حسنِ اخلاق سے کام لیا۔ الفاظ کی تحقیق، املا، قواعد اور عروض و قافیے (۳) کے فن میں ان کا قول، حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا اور وہ ہر جگہ شمعِ انجمن ہی ہوا کرتے تھے۔ خود علی گڑھ کی زندگی میں پرو وائس چانسلر اور وائس چانسلر بھی ان کا ادب کرتے تھے۔ آپ نہایت بے ریا اور نیک نفس بزرگ تھے۔ خوش وضع اور خوش پوشاک تو ایسے تھے کہ ہزاروں میں بھی کوئی ایک شخص ان جیسا نظر نہیں آتا۔ خود بھی کہا ہے:

احسنِ مرحوم سے ہم بھی ملے تھے ایک دن
آدمی خوش وضع، خوش اوقات، خوش پوشاک تھا

ان کی نظم ''دستورالعمل'' کے مطالعے سے ان کی یومیہ مصروفیات کا پاکیزہ نقشہ ذہن میں مرتب ہوتا ہے۔

یہ ہماری قوم کی بدنصیبی ہے کہ ہمارے نوجوان ہر ڈاڑھی والے کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہی نوجوان جب ڈاڑھی والے کسی پادری سے ملتے ہیں تو اسے ''فادر'' کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ علی گڑھ میں میرے زمانے میں دینیات کے ایک عالم کی توند بڑی تھی تو ان کا نام ''مولوی مٹکا'' پڑ گیا تھا اور لطف یہ کہ ان کے گھر والوں میں بھی اصل نام کے بجائے یہی نام رائج تھا۔ چنانچہ ابھی ۳۔۴ سال پہلے ان کے صاحبزادے مجھ سے ملنے آئے تو انہوں نے اپنی پہچان اسی طرح کرائی کہ میں ''مولوی مٹکا'' کا بیٹا ہوں۔ اسی طرح بعض شریر

۳۔ چاہیے نظم قوافی کا تتبع احسن
یعنی آزاد نہ تم قیدِ روی سے رہنا

طلبہ کچھ نہ کچھ مذاق حضرت احسن سے بھی کرتے تھے لیکن آپ کے برجستہ جواب سے ایسے طلبہ شرمندہ ہو جاتے تھے۔

حضرت احسن کے ذوقِ شعری کی وجہ سے انٹرمیڈیٹ کالج میں (یونیورسٹی میں نہیں) ہر سال عظیم الشان مشاعرہ ہوا کرتا تھا اور چوٹی کے شعرا آیا کرتے تھے بلکہ ان شعرا کی شہرت ہی ان مشاعروں کی وجہ سے پورے ملک میں ہوئی تھی۔ حضرت احسن نے کالج کے طلبہ میں شعروشاعری کا ذوق پیدا کرنے کے لئے طرحی مشاعرے بھی شروع کرر کھے تھے۔ ۱۵۔۲۰ دن میں ایسے مشاعرے کسی مصرعِ طرح کے سلسلے میں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ مصرعِ طرح یہ تھا:

افسانہ وہ سناؤں جو تم نے سنا نہ ہو

ایک شریر طالب علم نے اس مصرعِ طرح پر غزل لکھی اور ایک شعر میں مجنوں کو لیلیٰ کا شیر خوار بیٹا بنا دیا۔

مجنوں کو لے کے ...... لیلیٰ نے یوں کہا
لے پی لے...... جو تو نے پیا نہ ہو

مولانا اس شعر پر ''خاموش، خاموش'' ہی کہہ سکتے تھے لیکن پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ (شعر کے حذف شدہ الفاظ، قارئین پُر کر سکتے ہیں)۔

غرض کہ حضرت احسن نے ایسے مشاعروں کے ساتھ ایک تمثیلی مشاعرہ بھی مرتب کیا۔ وہ اکثر بڑے بڑے شعرا کو دیکھے ہوئے تھے۔ ان کی شکل وصورت وضع قطع اور ان کے حالات سے بھی واقف تھے۔ چنانچہ تمثیل کے لئے طلبہ کا انتخاب ہوا۔ لباس وغیرہ کا انتخاب کیا گیا۔ جو شعرا ضعیفی کی وجہ سے توتلے ہو گئے تھے ان کی نقل اتاری گئی۔ ان کی چال، ان کی طرزِ ادا، ان کی مسکراہٹ، ان کا جلال وغیرہ سب کچھ من وعن سمجھایا اور بتایا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسا مشاعرہ دیکھنے اور سننے کے لئے طلبہ کے علاوہ بھی باہر کے کتنے لوگ جمع ہوئے ہوں گے۔ یہ تمثیلی مشاعرہ وہی ہے اور ہر شاعر کے حالات خود حضرت احسن نے لکھے ہیں جو یقیناً مستند ہیں۔ لیکن

ایک احسن کی جگہ خالی بھری محفل میں ہے

راقم الحروف نے مولانا سے انٹرمیڈیٹ کلاسوں میں اردو پڑھی تھی۔ الفاظ کی تحقیق اوران کے استعمال کے مواقع بڑی خوبی کے ساتھ سمجھاتے تھے اوراشعار کی زبان وبیان سے ان کے زمانے کی تعیین بھی سمجھاتے تھے اور یہ ان کے کمال کی بڑی خصوصیت تھی۔ ۱۹۳۱ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد بی اے کلاسوں میں محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب سے مستفیض ہوااور بی اے سے ۱۹۳۳ء میں فارغ ہواتو ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کی شخصیت سے متاثر ہوکر ایم اے فارسی میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۵ء میں اس سے فارغ ہوا۔ اس زمانے میں ایم اے کے تمام پرچے (یعنی سالِ اول اور سالِ دوم کے) ایک ساتھ ہوا کرتے تھے اور ایک ایم اے کے بعد دوسرا ایم اے پرائیویٹ طور پر ایک سال میں مکمل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ بعض احباب کے مشورے پر میں نے ایم اے اردو میں کرنے کا ارادہ کیا اور اپنے دیرینہ استادوں یعنی مولانا احسنؒ اور پروفیسر صدیقی صاحب سے ان کی کلاسوں میں بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ ان دونوں بزرگوں نے بہ خوشی اجازت دی۔ لیکن میں زیادہ تر مولانا ہی کی کلاس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ ان کی شفقت کا یہ حال تھا کہ اگر مجھے کچھ دیر ہو جاتی تو وہ اپنی تقریر دوبارہ شروع فرماتے اور یوں بھی فرماتے کہ ''مجھ پر تمہارا زیادہ حق ہے۔'' ایک دن مولانا نے طلبہ سے لیکن کی اصل پر سوال کیا۔ طلبہ خاموش تھے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ لاکن سے امالہ کرنے سے بنا ہے۔ مولانا بہت خوش ہوئے پھر انہوں نے قرأت کے مختلف ائمہ کا امالہ سمجھایا جس سے اندازہ ہوا کہ مولانا کو قرأت سبعہ پر کتنا عبور حاصل تھا۔

۱۹۳۶ء میں ایم اے (اردو) کے تمام پرچوں کا امتحان ہوا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) کا یہ پہلا امتحان تھا۔ زبانی امتحان کے دن حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ الہٰ آباد سے ایک ممتحن تشریف لائے ہیں۔ ہمارے دونوں بزرگ داخلی ممتحن تھے۔ باہر سے آنے والے ممتحن صاحب کا طریقۂ سوال یہ تھا کہ تمہید کے طور پر اس سوال سے متعلق چند جملے فرماتے تھے اوراس کے بعد سوال کرتے تھے۔ مجھ سے پہلے جس طالب علم کا امتحان تھا اس سے انہوں نے فرمایا تھا کہ دہلی کی شاعری میں صرف داخلیت ہے اور لکھنؤ کی شاعری میں خارجی اوصاف ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ ایسی بات طلبہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن آپ نہیں کہہ سکتے۔ کیا دہلی کے تمام شعرا کے یہاں محض داخلیت ہے؟ پھر مولانا نے غالب کے اشعار (''دھول دھپا'' اور ''پاؤں

داب تو دے،' وغیرہ) پیش کیے۔ امتحان کے کمرے میں خاموشی کا عالم طاری ہوگیا۔ باہر کے ممتحن صاحب ایسے خاموش ہوئے کہ آواز ہی نہ نکلی۔ آخر کار میرے امتحان کی باری آئی۔ مجھے بلوایا گیا۔ محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے سوالوں کا آغاز کیا۔ فرمایا کہ آپ نے فارسی میں ایم اے کیا ہے، بتایئے کہ ولی نے کن کن فارسی شعرا کی تقلید کی ہے؟ مجھے ایسے اشعار بہت سے یاد تھے میں عرض کرنے لگا۔ باہر کے ممتحن صاحب خاموش بیٹھے رہے اور جلد ہی میری جان چھوٹی۔ مگر حضرت احسن جیسے باکمال اب کہاں؟

ہوئی جاتی ہے آخر بزمِ اربابِ کمال احسن
اٹھے جاتے ہیں وہ بھی جو یہاں دو چار بیٹھے ہیں☆

☆ طوبیٰ الہم۔ ص ۵۳۔

واقعاتِ احسن

آج ایسے بزرگ ادیب اور استاد کے متعلق کچھ کہنا ہے جن کی وفات کم از کم میرے لئے رسمیہ نہیں، بلکہ حقیقی معنی میں ''ناگہاں'' تھی۔ کیونکہ وہ بزرگ یعنی حضرت مولانا مولوی حافظ قاری حاجی سید شاہ علی احسن صاحب احسن مارہرویؒ اپنی وفات کے دو تین ماہ قبل سے غالباً اپنی پریشانیوں کی وجہ سے مجھے کوئی جواب نہ لکھ سکے تھے۔ لیکن ان کی علمی وادبی مصروفیتوں کا حال اس دوران میں بھی مجھے بعض اخباروں سے معلوم ہوتا رہتا تھا اس لئے میں بھی خاموش تھا۔ بہرحال جس بزرگ کا حال اور قال یوں تھا کہ:

یاد داری کہ وقتِ زادن تو
ہمہ خنداں بدند و تُو گریاں
پس چناں زی کہ وقتِ مردن تو
ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

اس کے ماتم میں کیسے صبر آئے اور یہ دل کس طرح بہلایا جائے؟ خیر۔ بقول میر:

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

مجھے یہاں حضرت احسن مرحوم کی ۶۶ سالہ زندگی کے حالات بیان نہیں کرنا ہے بلکہ کچھ ایسے واقعات پیش کرنا ہے جن کو میں زمانہ شاگردی میں خود مطالعہ کرتا تھا یا کسی سے معلوم کرلیتا تھا۔

یوں تو میں علی گڑھ میں ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۶ء تک رہا لیکن سب سے پہلے مجھے ۱۹۲۹ء

میں حضرت احسن سے مستفیض ہونے کا موقع نصیب ہوا جب کہ میں فرسٹ ایر میں تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ مجھے مذہبی بحث ومباحثے میں خاصا انہاک تھا اور جس کا سودا میں اپنے وطن جبل پور سے لے کر گیا تھا۔ اول تو اس عمر میں میری سمجھ ہی کیا! لیکن بعض اہم مسائل مثلاً حجر اسود کی حقیقت، معراج، قرآن پاک کے مضامین کا تسلسل اور معتزلہ فرقے کے اعتراضات کے جوابات وغیرہ کو حضرت احسن ایسے دلائل کے ساتھ مجھے سمجھا دیتے تھے کہ اب بھی غور کرتا ہوں تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔

اس وسیع النظری کا یہ حال تھا کہ اگر کسی لفظ کے استعمال پر بحث ہوتی تو نہایت برجستگی کے ساتھ اردو کے مختلف شعراء کے اشعار کے حوالے کے لئے پیش کرتے تھے۔ اگر اس لفظ کا تعلق فارسی سے ہوتا تو فارسی شعراء کے یہاں اس کا استعمال بتاتے تھے اور اگر عربی سے کوئی تعلق ہوتا تو عُربی کے مختلف استعمال سے آگاہ فرماتے تھے۔ یہ خصوصیت ان کے یہاں ایسی تھی جو بہت کم بزرگوں میں پائی جاتی ہے۔

ان کی دقیق النظری کی بھی اکثر مثالیں دیکھنے میں آئیں۔ اور یہ تو حضرت احسن کے متعلق کئی مرتبہ معلوم ہوا کہ بعض لوگوں نے محض امتحان کے طور پر مختلف شعرا کے ہم وزن وہم قافیہ اشعار خلط ملط کر کے رکھ دیئے اور ان سے شاعر کا نام پوچھا۔ انہوں نے ہر شعر کو الگ الگ کر کے رکھ دیا اور کم از کم یہ ضرور بتا دیا کہ فلاں شعر فلاں عہد اور فلاں اسکول سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا انہیں شعر کی نبض پہچاننے میں خاص مہارت تھی اور یہ سب کچھ ان کی پختہ کاری اور کہنہ مشقی کی وجہ سے تھا۔

یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایک اچھا ناقد اچھا شاعر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک اچھا شاعر اچھا ناقد نہیں ہوتا۔ لیکن ایسے اشخاص جن میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہوں بہت کم ہوتے ہیں۔ خدا کا کرم واحسان تھا کہ علی گڑھ کی قسمت میں حضرت احسن کی ہستی ان دونوں خوبیوں کی جامع تھی۔ ان کی تنقید عموماً مولانا حسرت موہانی کی طرح مختصر لیکن جامع ہوتی تھی اور حشو وزاوید سے بالکل پاک۔ چنانچہ انہوں نے تاریخ نثر اردو میں جن انشا پردازوں کے متعلق محض ''تبصرہ'' کیا ہے وہ اتنا کافی ہے کہ اس کا اجمال کسی طرح بھی تفصیل سے کم نہیں ہے۔ اردو نثر کے ارکانِ خمسہ اور دہلی ولکھنؤ اسکول کے متعلق بہت لوگوں نے خامہ فرسائی کی ہے اور خوب

خوب لکھا ہے لیکن حضرت احسن نے اس تاریخ میں جس ایجاز و جامعیت کے ساتھ تنقید کی ہے حق تو یہ ہے کہ ابھی تک کسی بزرگ نے اس پر ایک لفظ بھی نہیں بڑھایا۔ اسی طرح میر، غالب اور داغ پر جو کچھ انہوں نے وقتاً فوقتاً لکھا، یا طلبہ کو لکھوایا وہ بلا شک وشبہ بہترین تنقیدوں میں شمار ہوگا اور ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

حضرت احسن میں یہ خاص بات تھی کہ وہ ہر شخص کی ادبی خدمت کو سراہتے تھے اور مبتدی کی بہت زیادہ ہمت افزائی فرماتے تھے بلکہ اس کے پوشیدہ جوہروں کو نمایاں کرنے میں کوشش بھی کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی کتاب کے متعلق اگر ہم لوگوں کو تنقید لکھنا چاہتے تھے تو پہلے تلاش کرتے تھے کہ کسی دوسرے شخص کی تنقید مل جائے۔ اگر وہ مل جاتی تو وہی لکھا دیتے تھے۔ حالانکہ ہم لوگ بخوبی سمجھتے تھے کہ اس سے بہت زیادہ بہتر خود حضرت احسن لکھا سکتے ہیں اور لکھا بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسی تنقید لکھا دینے کے بعد اس کی خصوصیات پر بحث کرتے تھے اور جو کچھ باقی رہ جاتا تھا اس پر پھر مدلّل و مفصل تبصرہ کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حق گوئی کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی بڑا ادیب اور نقاد غلط بیانی کر جائے۔ چنانچہ تاریخ نثر اردو میں انہوں نے ہرگز کسی بڑے ادیب اور نقاد کی تحقیقی اور تنقیدی غلطیوں کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ضرور اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سے خدانخواستہ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ غلطیوں سے پاک تھے۔ وہ بھی انسان تھے اور ''تقاضائے بشریت'' کے وہ خود قائل تھے بلکہ اکثر اس کو یاد بھی کرتے تھے لیکن حق گوئی کو وہ ضروری اپنے ذاتی تعلقات پر ترجیح دیتے تھے اور یہ رویہ شروع جوانی ہی سے ان میں پایا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے بعض لوگوں کو ان سے ذاتی بغض پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان کی ''اصلاحِ سخن'' خواہ بہترین اصلاحوں میں شمار ہو سکے لیکن اس میں بھی بعض لوگوں کو ستم ظریفی کا موقع مل گیا۔ اسی طرح خواہ اکبر الٰہ آبادی انہیں علم عروض کا امام سمجھیں اور کم از کم داغ کے تمام شاگرد انہیں قواعد زبان میں فرد سمجھیں لیکن ''اردو لشکر'' کے خلاف پھر بھی علم بغاوت بلند کیا جاتا تھا۔ ''کسوف الشمس'' میں خواہ کتنی ہی حقیقت بیان کی جائے لیکن ''احوال'' نظریں اسے بھی نہ دیکھ سکیں۔ ''تخمین'' اور ''کارنامۂ غم'' خواہ مذہبی عقیدت میں محض جزوی رنگ لئے ہوئے ہوں لیکن محض اسی رنگ کو دیکھ کر ان کی پوری شاعری پر فتویٰ صادر کیا جائے۔ ''کلیاتِ ولی'' کو

مخالف نسخوں کے تطابق اور تحقیقی وتنقیدی مقدمے کے ساتھ مرتب کرنا یورپ میں کم از کم پی ایچ ڈی کے برابر ضرور اہم ہوتا ہے لیکن افسوس کہ چند تنگ نگاہیں اسے بھی نہ دیکھ سکیں۔ لیکن حضرت احسن ان کارناموں کی مطلق پروانہ تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ خاص لوگوں نے ضرور ان کی قدر کی ہے اور کریں گے۔ اور بقول سودا:

مرے سخن کی مرے بعد زیادہ ہووے قدر
گہر یتیم جو ہووے تو ہو فزود بہا

کسی زمانے میں ''نقاد'' وغیرہ پرچوں کی ''مغربیت'' کا بڑا چرچا ہوا تھا اور اس کے لئے علوم انگریزی کے نیم ملاؤں نے خوب ہاتھ پاؤں مارے تھے لیکن حضرت احسن نے شروع ہی سے اسے ''فریب فکر ونظر'' سمجھ کر اردو شاعری کے ماحول کے منافی خیال کیا تھا اسی لئے اس کے خلاف انہوں نے صحیح طور پر قلم اٹھایا تھا لیکن افسوس کہ مہدی مرحوم جیسے بزرگ ادیب بھی ''ذاتیات'' کا ''تبرا'' پڑھنے لگے۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر مجبوراً حضرت احسن سے بھی ایک آدھ جگہ بے اعتدالی ہوگئی تو وہ ''تقاضائے بشریت'' سے زیادہ کچھ اور نہیں تھی۔ کیونکہ جنہوں نے ان کی صحبت اٹھائی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ بذاتِ خود اپنے بزرگوں یعنی مولانا عبدالجلیل بلگرامی، مولانا آزاد بلگرامی، حضرت شاہ ابوالبرکات مارہروی اور حضرت صاحب عالم مارہروی کی طرح کتنے پاک باطن شریف النفس، منکسر المزاج اور سراپا اخلاق تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک صحبت میں باہر کے ایک مشہور ادیب بعض طلبہ سے کہنے لگے کہ ابتذال اور سوقیانہ پن لکھنؤ کی شاعری میں پایا جاتا ہے لیکن دہلی اس سے پاک ہے۔ حضرت احسن موجود تھے ان کی صداقت پسندی اس جملے کو برداشت نہیں کرسکی حالانکہ ان جیسا دہلی کا مقلد کون ہوگا؟ فوراً وہ دہلی کے شعرا کا متبذل کلام سنانے لگے۔ غالب کے بھی دو شعر تھے۔

- دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن
اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

پھر ذوق، مومن اور داغ وغیرہ مشاہیر شعرائے دہلی کے اشعار بھی سنا دیئے۔ حیرت ہوتی تھی کہ ایسا زبردست حافظہ اور ایسی حاضر جوابی کیسے ان کے حصے میں آئی تھی۔ غرض کہ ان واقعات کو ''حق گوئی'' سے تعبیر کیجئے اور کچھ سمجھ لیجئے لیکن یہ بالکل حقیقت ہے کہ حضرت احسن بہت پاک باطن اور بے ریا بزرگ تھے۔ مشہور ہے کہ مصحفیؔ تنگ دستی کی وجہ سے اپنی اچھی سے اچھی غزلیں بھی فروخت کر کے اپنا گزارہ کرتے تھے۔ سرور جہاں آبادی کو بھی مجبوریوں نے اسی طرح گھیر لیا تھا۔ افسوس کہ زندگی کی ایسی کٹھن گھڑیاں کبھی کبھی حضرت احسن کو بھی پیش آئیں اور انہیں بھی مجبوراً اپنی بعض تصانیف فروخت کرنی پڑیں۔ چنانچہ کم از کم ان کی دو اعلیٰ ادبی کتابیں ضرور ایسی ہیں جن کی آج کل ادبی حلقوں میں بہت شہرت ہے لیکن اصل مصنف کا نام پوشیدہ ہے۔ بہرحال جن حضرات کو حضرت احسن کی زبان اور طرز تحریر سے واقفیت ہے وہ ان کتابوں کے چند صفحے پڑھ کر خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔

نمونۂ منشورات (حصہ اول) بھی اپنی مالی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لئے لکھی گئی تھی۔ لیکن حسب منشا داد نہ ملنے کی وجہ سے اس کا دوسرا حصہ ہمیشہ کے لیے رہ گیا۔ جن لوگوں نے واقعی اس جیسے کام کئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ سینکڑوں کتابوں کو کھنگالنے میں کتنی محنت اٹھانی پڑتی ہے اور یہ محنت اس وقت کتنی بڑھ جاتی ہے جب کہ قلمی کتابوں سے واسطہ ہو اور کم از کم ساڑھے پانچ سو سال کے سلسلے وار نمونے پیش کرنے ہوں اور ساتھ ہی تنقید اور تبصرہ بھی جامع و مانع ہو۔ ابھی تک ہندوستانی زبانوں میں اس طرز کی اور کوئی کتاب نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ جب تک تاریخ نثر اردو لکھنے لکھانے میں ادبا کی کوششیں جاری رہیں گی اس وقت تک حضرت احسن کی یہ کتاب ہمیشہ قدر و منزلت سے دیکھی جائے گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا بغور مطالعہ کیا جائے اور محض سرسری نگاہ ڈال کر اس پر فتویٰ صادر نہ کیا جائے۔

چند پریشانیوں کی وجہ سے حضرت احسن کی کتاب ''شبیہ داغ'' بھی رہ گئی جو دراصل ''جلوۂ داغ'' (۱۸۹۹ء) کے سلسلے کی دوسری کڑی تھی اور ''یادگار داغ'' کے بعد ہی جس کا ڈول ڈالا گیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے ''انتخاب کلام داغ'' بھی مرتب کیا جو غالباً اب طبع ہو رہا ہے۔ اس کے متعلق انہوں نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۰ جولائی ۳۸ء میں مجھے تحریر فرمایا تھا کہ ''اس انتخاب میں یہ التزام ہے کہ فارسی عطف و اضافت نہیں ہے۔'' ''انشا داغ'' بھی

اپنے تاریخی نام کے ساتھ ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۴۰ء میں شائع ہو جاتی لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ نیز رام پور میں حضرت داغ کے کچھ اور خطوط کا پتا چلا اس لئے حضرت احسن نے وہاں کا رخ بھی کیا اور وہ کتاب ابھی تک ہماری نظروں سے چھپی ہوئی ہے۔ خدا کرے کہ جلد چھپ جائے۔

حضرت داغ کے شاگردوں میں صرف حضرت احسن ہی ایسے تھے جنھوں نے تمام عمر اپنے استاد کے نام کو قائم رکھنے کے لئے پوری کوشش کے ساتھ قلمی جہاد کیا۔ حالانکہ وہ خود فرماتے تھے کہ ''حضرت داغ اپنی شاعرانہ نام وری میں کسی ایک شاگرد کے محتاج نہیں ہوئے۔'' یہ واقعی حقیقت ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وقتاً فوقتاً جن حضرات نے فصیح الملک کی رنگینی اور شوخی پر حرف گیری کی جرأت کی ان کا جواب پوری طرح حضرت احسن نے دیا اور خاموش کر دیا۔ اس کی وجہ دراصل یہی تھی کہ حضرت احسن نے ایک عرصے تک اپنے استاد کی خدمت میں رہ کر ان کی شاعری اور ذاتی حالات کا بغور مطالعہ کیا تھا اور ان کی ہر اونچ نیچ سے بذاتِ خود واقف تھے۔

استاد بھی اپنے مخلص شاگرد کی دل سے قدر کرتے تھے اور ان کی ذاتی قابلیت سے متاثر تھے۔ ایک قطعے کی فرمائش پر لکھتے ہیں:

سید احسن جو مرے دوست بھی شاگرد بھی ہیں
جن کو اللہ نے دی فکرِ رسا، طبع رسا
شعر کے حسن وقبائح جو انہوں نے پوچھے
ان کی درخواست سے اک قطعہ یہ برجستہ کہا

حضرت داغ نے لفظ ''دوست'' رسمیہ نہیں استعمال کیا تھا بلکہ کچھ اصلیت بھی رکھتا تھا اور یہ عجیب بات تھی کہ جس کی بنا پر حضرت احسن کے تمام خواجہ تاش ان سے بہت عزت واحترام کے ساتھ ملتے تھے اور حضرت احسن بھی ان حضرات سے اس خلوص کے ساتھ ملتے تھے کہ حقیقی بھائیوں کی محبت بھی شاذ و نادر ایسی ہوتی ہے۔

حضرت داغ کی صحبت میں رہ کر حضرت احسن نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ شعرا کا کلام جب اصلاح کے لئے آتا تھا تو استاد کی اصلاحات کو اکثر حضرات احسن ہی اپنے قلم سے لکھتے جاتے تھے اور عموماً جواب بھی خود ہی لکھا کرتے تھے اس

لئے انہیں تمام اصلاحات کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور محض اسی وجہ سے ان کے کلام میں بھی استاد جیسی پختہ کاری نظر آتی ہے یعنی کہنہ مشقی کے باوجود وہ بہت زیادہ احتیاط برتتے تھے اور اگر کوئی خاص عجلت ہوتی تھی تو بے شک جلد لکھ لیتے تھے ورنہ عموماً بہت زیادہ غور وفکر کے بعد لکھتے تھے اور جب تک اچھے الفاظ ذہن میں نہ آتے تھے ہرگز شعر نہیں کہتے تھے۔ مجھ سے خود انہوں نے بعض مرتبہ فرمایا کہ

دیکھو یہ مضمون ذہن میں آیا ہے لیکن دو تین روز ہوئے ابھی تک شعر میں ضم نہیں ہو سکا۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بھرتی کے الفاظ بالکل نہیں ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ حضرت احسن کے یہاں حضرت داغ کے جذبات، خیالات، شوخی اور رنگینی بہت کم ہے لیکن یہ بالکل حقیقت ہے کہ ان کے یہاں زبان کی خوبی کے ساتھ ساتھ الفاظ کی بندش اور ترکیب کی چستی اتنی زیادہ ہے کہ ذرا سا ردوبدل بھی محال ہے۔ اسی لئے امید ہے کہ ان کا کلام شائع ہو جانے پر مستند زبان کا ایک بیش بہا خزینہ ثابت ہوگا۔

ایک اور چیز جو حضرت احسن کی تحریر میں شروع ہی سے دیکھی جاتی ہے وہ ان کا املا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انجمن ترقی اردو نے ۱۹۲۳ء سے اصلاح املا کی طرف توجہ مبذول کی اور باقاعدہ اس کے لئے مختلف اہل قلم نے کوششیں کیں لیکن جو چیزیں ان حضرات نے قائم کیں وہ بہت پہلے (سوائے چند مستثنیات کے) حضرت داغ کی صحبت میں حضرت احسن نے قائم کر لی تھیں اور ان پر ہمیشہ سے عمل بھی کرتے تھے۔

لیکن جو چیز حضرت احسن کی خاص تھی اور جس کی وجہ سے میں ان کا گرویدہ ہوا وہ ان کی زبان تھی۔ وہ اگر آزاد کی چٹخارے دار لطافت اور چاشنی سے لب ریز تھی تو ساتھ ہی موجودہ زمانے کی سلاست سے بھی رواں تھی اور مولوی عبدالحق صاحب کی طرح ہندی کے میٹھے میٹھے اور فصیح الفاظ سے بھی پر تھی۔ افسوس ہے کہ وقت کی قلت کی وجہ سے ان کی اس اعلیٰ خصوصیت کو میں ابھی زیادہ واضح نہیں کر سکتا ورنہ بتا دیتا۔ کہ اس محسن اردو کی ۴۵ سالہ ادبی خدمات میں یہ چیز کتنی زیادہ ارفع واعلیٰ ہے۔ بہر حال جن اہل ذوق حضرات نے ان سے گفتگو بھی کی ہے ان کو ضرور اعتراف ہوگا کہ ان کا ہر جملہ ''زرِ کامل عیار'' کی شان رکھتا تھا اور ایک

ایک لفظ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ٹکسال کے نئے نئے سکے ہیں جو ڈھل ڈھل کر نکلتے جا رہے ہیں اور سامع میں اگر ذوقِ سلیم ہوتا تھا تو ان الفاظ کی لطافت سے بغیر لطف اٹھائے نہیں رہ سکتا تھا عجب شان تھی، عجیب بزرگ تھے۔ آہ! کیسے یقین کرلوں کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں؟ کم بخت دل کو تو صبر آتا ہی نہیں۔

آہ ایسا بزرگ جس کی تمام عمر ادیبوں کی صحبت میں گزری، جس نے تمام عمر اردو کی خدمت کی، جس نے اپنے استاد فصیح الملک کی ہر اعتبار سے جانشینی کی، آج ہماری نظروں سے اوجھل ہے! دعا ہے کہ اللہ پاک اپنی رحمت کاملہ سے اس بزرگ ہستی کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اس کی قبر کو ہمیشہ پُر نور رکھے۔ آمین ثم آمین۔ ☆

☆علی گڑھ یونی ورسٹی میگزین، احسن نمبر، علی گڑھ ستمبر ۱۹۴۱ء۔ نور القمر۔ ص ۳۳

علی گڑھ کے بعض اساتذہ

راقم الحروف ۱۹۲۸ء میں علی گڑھ گیا۔ ۱۹۲۹ء میں میٹرک پاس کیا۔ اور ۱۹۳۶ء تک دو ایم اے اور ایل ایل بی پاس کر کے اپنے وطن جبل پور واپس ہوا۔ اس زمانے میں نویں۔ دسویں، گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کے لئے انٹرمیڈیٹ کالج مخصوص تھا۔ اقامتی طلبہ کے لئے منٹو سرکل اور نیو سرکل (ارون سرکل) کے چار چار ہوسٹل تھے۔ سیمی بورڈ اور ڈے اسکالر ان کے علاوہ تھے۔ منٹو سرکل کے ایک ہوسٹل میں جسے منٹو اے کہتے تھے، میٹرک کی کلاسیں ہوا کرتی تھیں اور منٹو بی جو دو منزلہ عمارت تھی اس کی اوپر کی منزل کے ایک سرے پر محترم عبدالمجید قریشی صاحب کا دفتر تھا۔ وہ اس کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کے دفتر کے ساتھ ہی ان کے سیکریٹری بشیر احمد صاحب کا دفتر تھا۔ ایک کلرک رحمت اللہ تھے۔ اس دوسرے دفتر کے عقب میں سید ولی محمد صاحب (وائس پرنسپل) کا دفتر تھا۔ ان دفتروں کے علاوہ اوپر کی منزل کے ہال میں لائبریری اور ریڈنگ روم تھا۔ بقیہ کمروں میں گیارھویں اور بارھویں کی کلاسیں ہوا کرتی تھیں۔

عبدالمجید قریشی صاحب

عبدالمجید قریشی صاحب بڑے رعب داب والے بزرگ تھے لیکن بہت شفیق بھی تھے۔ مونچھیں لمبی تھیں۔ اکثر پتلون پہنا کرتے تھے۔ لیکن ان کا کوٹ دوسرے اساتذہ کے کوٹ کی طرح بہت لمبا ہوتا تھا۔ (بغیر کوٹ کے، صرف قمیض اور پتلون پہننا اس زمانے میں معیوب سمجھا جاتا تھا)۔ ہمارے پرنسپل صاحب اکثر مغرب کی نماز ان دونوں سرکلوں میں پڑھتے تھے۔ راقم الحروف نیو سرکل کے جوبلی ہوسٹل میں تھا۔ وہاں پرنسپل صاحب باغ کے اندر

مغرب کی نماز خود پڑھاتے تھے، حالانکہ وہاں پیش امام بھی مقرر تھے۔ طلبہ کے کھیلوں، مباحثوں، مشاعروں وغیرہ میں وہ برابر شرکت فرماتے تھے۔ طلبہ کی ہمت افزائی فرماتے تھے اور انعامات بھی تقسیم فرماتے تھے۔ طلبہ کی اس زندگی کے مطابق بعض دل چسپ پروگرام بھی انہیں پسند تھے۔ مثلاً ایک طالب علم نے A rustie on the telephone کے نام سے خود ہی سائل اور خود ہی مجیب بن کر دیہاتی زبان میں ایک مکالمہ پیش کیا۔ زبان ایسی تھی کہ ''میں نے کہہ دینی گے بات ٹھیک نائے'' (یعنی میں نے کہہ دیا کہ یہ بات ٹھیک نہیں)۔ پرنسپل صاحب نے ہمت افزائی فرمائی اور طالب علم کو انعام بھی دیا۔ ان کی کوٹھی میرس روڈ کے شمالی سرے پر تھی، ہم لوگ حاضر ہوتے تو بہت شفقت فرماتے۔ پھر اپنے باغ کے مختلف پودوں اور پھلوں کے درختوں کی شناخت کراتے تھے۔ ایک دفعہ مجھے شریفے کے درخت کی پہچان کرائی۔ (شاید اس لئے کہ میرے وطن میں شریفہ بہت ہوتا تھا)۔

یونیورسٹی سے اس کالج کے انضمام کے بعد پرنسپل صاحب ایم اے (ریاضیات) کی کلاسیں پڑھانے لگے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی تشریف لے آئے تھے اور وہیں انہوں نے ۱۰ جون ۱۹۸۲ء کو انتقال فرمایا۔

سید ولی محمد صاحب

اس کالج کے وائس پرنسپل سید ولی محمد صاحب تھے۔ نظم و نسق کے معاملے میں وہ بھی بہت سخت تھے اور بعض اساتذہ سے بھی پوچھ گچھ کر لیتے تھے۔ وہ بھی اکثر لمبا سوٹ پہنتے تھے۔ کبھی کبھی علی گڑھ کے مونوگرام والے کپڑے کی شیروانی بھی پہنتے تھے جو انہیں بہت زیب دیتی تھی۔ وہ گیارہویں اور بارہویں جماعت کو بہت محنت سے انگریزی پڑھاتے ان کا تکیۂ کلام They say تھا۔ ایک مرتبہ ان کو پتھری کی تکلیف ہوئی تو یعقوب بیگ نامی صاحب (استاد منطق) سے میں ایک نسخہ ان کے لئے لایا۔ بہت خوش ہوئے لیکن فرمانے لگے کہ ''بیٹے اس مرض کی تین قسمیں ہیں۔ جس قسم کی پتھری مجھے ہے اس کے لئے یہ نسخہ صحیح نہیں۔'' پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی تشریف لے آئے تھے۔ کئی سال اردو کالج میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ پرانے تعلق کی وجہ سے مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ پھر وہ لاہور تشریف لے گئے اور وہیں

غالباً ۱۹۵۸ء میں انتقال فرمایا۔

دوسرے اساتذہ

دسویں جماعت کے زمانے میں میرا قیام جوبلی ہوسٹل (نیو سرکل) میں تھا۔ اس کے شمالی سرے کے وارڈن شمس الہدیٰ صاحب تھے جو ریاضی پڑھاتے اور اس کے جنوبی سرے کے وارڈن شیخ علی جواد صاحب تھے۔ دونوں بہت نیک اور نمازی تھے۔ لیکن شمس الہدیٰ صاحب اپنے کمرے ہی میں نماز پڑھتے تھے۔ البتہ شیخ علی جواد صاحب جو دینیات کے استاد تھے ہمیشہ باقاعدہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے تھے جو مزمل ہوسٹل میں ہوتی تھی۔ ظہر کے بعد جوبلی ہوسٹل کے ہال میں یہ دونوں بزرگ ہم لوگوں کو امتحان کی تیاری کرانے کے لئے جمع کرتے تھے۔ عصر کے بعد ایک استاد ہنوٹ سکھاتے تھے۔ کچھ طلبہ سیکھتے تھے، کچھ اپنے کاموں کے لئے بازار چلے جاتے تھے۔ میٹرک کے زمانے میں میرے سیکشن ایف کے انگریزی پڑھانے والے استاد سعید الزماں صاحب تھے۔ حیدرآباد دکن والی شیروانی پہنتے تھے یعنی آستینوں کا سرا ڈبل ہوتا تھا۔ (۱) منٹو ڈی ہوسٹل کے وارڈن بھی تھے۔ ایک دن کلاس میں انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم انگریزی کتاب She لے کر آئے ہو؟ میں نے کہہ دیا کہ Some body has just stolen it. اس جواب سے ناراض ہوگئے اور فرمایا کہ Learn manners اس عتاب سے ان کی شرافتِ نفس ظاہر ہے اور میرے اس جواب سے میری طفلانہ حماقت کا ثبوت ملتا ہے۔ بہرحال وہ پھر مجھ سے خوش رہے اور پورا وقت کامیابی کے ساتھ گزر گیا۔

واجد علی شیدا صاحب۔ صبیح الدین حیدر صاحب

جغرافیہ صبیح الدین حیدر صاحب پڑھاتے تھے۔ لڑکے ان کو چچا کہتے تھے۔ چہرہ مبارک ایسا تھا کہ گویا وہ غصے میں ہوں۔ اسی لئے جب کبھی وہ مسکراتے تھے تو لڑکے کہتے تھے کہ

۱۔ حیدرآباد دکن کی شیروانی میں آستینوں کا سرا ڈبل ہوتا تھا۔ شیروانی کی لمبائی زیادہ ہوتی تھی۔ بھوپال کی شیروانی کی لمبائی گھٹنوں تک ہوتی تھی اور علی گڑھ کی شیروانی کی لمبائی درمیانی ہوتی تھی۔

آج بارش ہو جائے گی۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھے، کیوں کہ میں اپنے وطن کے اسکول سے جغرافیئے سے متعلق بہت کچھ پڑھ کر گیا تھا۔ ان کے عزیز واجد علی شیدا صاحب فارسی پڑھاتے تھے۔ وہ بھی بہت سنجیدہ تھے۔ یہ دونوں بزرگ منٹوسی میں رہتے تھے۔ ان میں سے ایک، وہاں کے وارڈن تھے۔ ان کے اعزا کراچی میں ہیں۔

اشفاق صاحب

میٹرک پاس کرنے کے بعد جب گیارہویں جماعت میں داخلہ لیا تو قیام کے لئے بعض احباب کی وجہ سے مزمل ہوسٹل منتخب کیا۔ وہاں کمرہ نمبر ۳۳ میں رہتا تھا۔ میرے ساتھ میرے پرانے دوست اور مشہور کھلاڑی عبدالحی اور ان کے عزیز سراج الحق بھی رہتے تھے۔ ہماری کلاسیں منٹو بی کی بالائی منزل میں ہوا کرتی تھیں۔ انگریزی جناب سید ولی محمد صاحب پڑھاتے تھے۔ بہت محنت اور محبت سے پڑھاتے تھے۔ نواب وقار الملک کے صاحب زادے اشفاق صاحب گو کہ بی اے (آکسن) تھے لیکن ہمیشہ شیروانی پہنتے اور طلبہ کو پہلے ہی سلام کرتے تھے۔ شرافت، شفقت اور ذہانت کا مجسمہ تھے۔ اور بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ عبدالشکور صاحب بھی انگریزی پڑھاتے تھے لیکن ہم لوگوں کو معلوم نہیں ان کے لیکچر کے وقت نیند آنے لگتی تھی۔ ہمت علی صاحب چھوٹے سے قد کے تھے۔ بہت تیزی سے بات کرتے تھے اور ہمیشہ سوٹ پہنتے تھے۔ طلبہ ان کو Courage Ali کہا کرتے تھے۔

محمد حنیف صاحب

جغرافیہ جناب محمد حنیف صاحب پڑھایا کرتے تھے۔ وہ شہر کے بالائی قلعے سے آیا کرتے تھے۔ Clarendon کے جغرافیہ کے دو حصے پڑھاتے تھے۔ کبھی کبھی کسی دینی بات کے متعلق مجھ سے تصدیق کرا لیتے تھے اور بڑے خوش اخلاق تھے۔ دبلے پتلے لیکن اخلاق میں وزنی۔ جناب ابرار حسین قادری صاحب اور عبدالعزیز جے پوری صاحب تاریخ پڑھاتے تھے۔

محمد حاذق صاحب

فارسی جناب محمد حاذق صاحب ''خوش باش''۔ ''زندہ دل'' اور علی گڑھ کے ایسے

سپوت جس کے ہر قول اور ہر فعل سے علی گڑھ والوں کی صحیح نمائندگی ہوتی تھی۔ میرے محبوب استاد قبلہ ضیاء احمد بدایونی صاحب بھی فارسی پڑھاتے تھے لیکن وہ بہ یک وقت عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کے بہت بلند پایہ استاد تھے۔ ان کے احسانات فراموش نہیں ہو سکتے۔ اردو جناب خاوری صاحب پڑھاتے تھے۔ بہت زیادہ نفاست پسند اور بذلہ سنج تھے۔ شریر لڑکے ان کے سامنے شرمندہ ہو جاتے تھے، ایک مرتبہ ایک طالب علم نے پڑھائی کو ٹالنے کے لئے کہا کہ جناب آج تو بہت گرمی ہے۔ خاوری صاحب نے برجستہ کہا کہ ایسی گرمی اس لئے ہے کہ پھر دوزخ میں تم کو زیادہ گرمی محسوس نہ ہو۔ وہ شرمندہ ہو کر چپ رہا۔

مولانا احسن مارہروی صاحب

مولانا احسن مارہروی صاحب کو بھی بعض لڑکے اسی طرح چھیڑتے تھے۔ ایک طالب علم بہت شریر تھا (اللہ اس کی مغفرت فرمائے)۔ وہ کچھ نہ کچھ فضول بات کرتا تھا، پھر شرمندہ ہو جاتا تھا۔ مولانا احسن الفاظ کی تحقیق اور ان کے استعمال کے مواقع بڑی خوبی سے سمجھاتے تھے اور اشعار کی زبان و بیان سے ان کے زمانے کی تعیین بھی سمجھاتے تھے اور یہ ان کے کمال کی بڑی خصوصیت تھی۔ ان کے ذوقِ شعری کی وجہ سے انٹرمیڈیٹ کالج میں ہر سال عظیم الشان مشاعرہ ہوا کرتا تھا اور پورے ملک سے چوٹی کے شعرا شرکت کرتے تھے۔ بعض شہرت پسند شعرا بھی آجاتے تھے جن کا دماغ بھی درست کر دیا جاتا تھا۔ طلبہ میں شعر و سخن کا ذوق پیدا کرنے کے لئے مولانا اکثر ''طرحی'' مشاعرے بھی منعقد کراتے تھے۔ پھر ۸ دسمبر ۱۹۲۹ء کو انہوں نے ایک 'تمثیلی' مشاعرہ منعقد کیا یعنی اس مشاعرے کی نقل جو ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں رام پور میں وہاں کے والی نواب کلب علی خان کی نگرانی میں ہوا تھا۔ اور میرِ مشاعرہ امیر مینائی جو نواب صاحب کے استاد تھے۔ اصل مشاعرے کے شرکا یہ تھے۔

نواب محمد کلب علی خان نواب (م ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء)۔ امیر مینائی (۱۳۱۸ھ م ۱۹۰۰ء) شمس العلماء مولوی عبدالحق منطقی خیر آبادی (م ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء)، محمد شاہ خان (رام پوری) کاوش، حافظ محمد احمد قمر (خلفِ امیر مینائی) نصیر احمد خان سحاب۔ خواجہ ارشد علی خان قلق۔ محمود علی خان محمود۔ آغا علی نقی غنی لکھنوی، احسان علی خان احسان۔ محمد بشیر خان بشیر۔

شیخ امداد علی بحر لکھنوی۔ امراؤ مرزا نادان، میر قطب الدین اشک۔ منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی، سید مظفر علی اسیر، منشی احمد حسین خان عروج، صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا، آغا مرزا شاغل، سید محمد اسمٰعیل حسین، منیر شکوہ آبادی، حکیم میر ضامن علی جلال لکھنوی، نواب مرزا خان داغ (م ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء)۔ ان سب شرکا کی وضع قطع، نشست و برخاست، انداز تکلم کی نقل طلبہ نے اتاری۔ خاص طور پر مرزا رحیم الدین حیا کی غزل طاہر حسین زبیری نے پوپلے پن سے پڑھی جس کی وجہ سے ان کو پہلا انعام ملا۔ یہ سب روئداد انٹرمیڈیٹ کالج میگزین (اپریل ۱۹۳۰ء) میں شائع ہوئی اور مولانا احسن کے حسنِ انتظام کی وجہ سے اس مشاعرے کی بڑی شہرت ہوئی۔

شیخ علی جواد صاحب

دینیات شیخ علی جواد صاحب پڑھاتے تھے۔ میٹرک میں بھی انہی نے دینیات پڑھائی تھی۔ اس زمانے میں ان کی ڈاڑھی نہیں تھی۔ سنا ہے کہ بعد میں رکھ لی تھی۔ وہ داہنے اور بائیں ہاتھ سے بلا تکان لکھ لیتے تھے۔ ان کی دو باتیں اب تک یاد ہیں۔ فرماتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمعہ کا خطبہ غیر زبان عربی میں جائز ہے۔ دوسری بات یہ کہ رفعِ سبابہ کا کوئی ذکر بخاری شریف میں نہیں ہے۔ شیخ صاحب پانچوں نمازیں جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے نماز کا مانیٹر بنا دیا تھا۔

مولوی مٹکا

اکثر طلبہ نمازی تھے۔ دینیات کے دوسرے استاد جن کا نام یاد نہیں لیکن ان کی عرفیت ''مولوی مٹکا'' تھی۔ بہت دل چسپ شخصیت کے مالک تھے۔ ابھی ۵۔۶ سال ہوئے ان کے صاحب زادے مجھ سے ملنے آئے تو انھوں نے اپنی شناخت اسی طرح کرائی کہ میں ''مولوی مٹکا'' کا بیٹا ہوں۔ مولوی صاحب کے علم و فضل اور ان کی توند کے ''گنجہائے گراں مایہ'' کا صحیح اندازہ ہم لوگوں کو کبھی نہیں ہو سکا۔ لیکن ان کی دل چسپ باتوں سے ان کا گھنٹہ آسانی سے ختم ہو جاتا تھا۔ ایک دن فرمانے لگے کہ میں حج کے لئے گیا تھا تو وہاں ایک شادی

کی بڑی دھوم مچی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ معلوم ہوا کہ جس لڑکی کی شادی ہو رہی ہے وہ بہت خوبصورت ہے۔ میں نے کہا کہ کیا میں اس لڑکی کو دیکھ سکتا ہوں۔ لڑکی والوں نے کہا کہ ہاں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے دیکھا تو وہ ناک کی بالکل چپٹی تھی۔ اور یہی اس کا حسن تھا۔ مولوی مٹکا صاحب ایسی باتیں ایسے زور وشور سے بیان فرماتے کہ کئی کمروں تک پڑھنے پڑھانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔

۱۹۳۱ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ایس ایس ویسٹ کے آخری کمرے سے پہلے والے کمرے میں قیام کیا۔ میرے ساتھ سید محمد صاحب (مرادآبادی) تھے۔ ہاکی کے اچھے کھلاڑی اور ۸۔۹ میل روز دوڑ لگاتے تھے۔ یہاں پاکستان میں ٹریفک پولیس کے سب سے بڑے افسر ہو کر ریٹائر ہوئے ہیں۔ انہی کے چھوٹے بھائی سید حامد صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ چند ماہ تک سید محمد صاحب کے ساتھ اس کمرے میں قیام رہا پھر وارڈن عبدالرشید صاحب نے وہ کمرہ ایک صاحب کے لئے خالی کرالیا تا کہ وہ کمرے کی پشت کی جالی سے کرکٹ کا کھیل بیٹھے بیٹھے دیکھ سکیں۔ سید محمد صاحب وہاں کے کمرہ نمبر ۴۴ میں چلے گئے اور راقم الحروف عثمانیہ ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۷ میں چلا گیا۔

مختار حامد علی صاحب

بی اے کلاس میں مختار حامد علی صاحب انگریزی کے سب سے زیادہ محنتی استاد تھے۔ پہلے سال کی انگریزی اور دوسرے سال کی انگریزی (شیکسپئر کے دو ڈرامے اور جدید انگریزی شعرا کا انتخاب دو حصوں میں) انہی کے ذمے تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر اور پورے اعتماد کے ساتھ انگریزی بولتے تھے۔ سخت محنت کی وجہ سے منہ میں ایک طرف جھاگ آ جاتا تھا۔ Thomas Hardy سے انہیں شغف تھا اور انہی کی وجہ سے ہم میں سے اکثر طلبہ نے اس مصنف کی تمام کتابیں پڑھ ڈالی تھیں وہ اسے Prose Dramatist کہا کرتے تھے۔ مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور اپنی ٹیوٹوریل کلاس میں انہوں نے خصوصی طور پر مجھے شامل کیا تھا۔ نہایت سنجیدہ اور باوقار تھے۔ ایک مرتبہ انگریزی کے استاد غلام سرور صاحب ایک مقالہ

پڑھنے والے تھے۔ سننے والا کوئی نہ تھا۔ مختار حامد علی صاحب نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ لڑکوں کو پکڑ لاؤ۔ میں بہت سے دوستوں کو لے آیا۔ غلام سرور صاحب کی تقریر جب ختم ہوئی تو شعبۂ انگریزی کے صدر Hadow Harris تبصرہ کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ ان کے ہر جملے پر مختار حامد علی صاحب قہقہہ لگاتے تھے اور ان کی انگریزی کا مذاق اڑاتے تھے۔ میں نے پہلی بار ان کو قہقہہ لگاتے دیکھا تھا۔

قاری محمود حسین صاحب۔ دراب جی

انگریزی کے دوسرے استاد محمود حسین صاحب تھے۔ وہ بعض حروف حلق سے ادا کرتے تھے۔ تو لڑکوں نے ان کا نام قاری محمود حسین رکھ لیا تھا۔ وہ عموماً Golden Treasury پڑھاتے تھے۔ تیسرے استاد دُراب جی (پارسی) تھے۔ وہ Galsworth کا ڈراما پڑھاتے تھے۔ بہت نرم طبیعت کے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ کسی کو برامت کہو۔ اگر برا کہنا ہی پڑے تو صرف یہ کہو کہ وہ اچھا نہیں ہے۔

میرے بزرگ استاد ضیاء احمد بدایونی صاحب اب بی اے کی فارسی نثر و نظم پڑھانے لگے تھے۔ ایک ایک لفظ کی تحقیق اور اس کے استعمال کا طریقہ سمجھاتے تھے۔ جدید فارسی کی نظم و نثر کا مجموعہ بھی انہی کے ذمے تھا۔ اس زمانے میں نویں جماعت سے ذریعۂ تعلیم (ہر مضمون کے لئے) انگریزی ہی تھا۔ ہمارے ضیاء احمد صاحب بہت اچھے انگریزی مترادفات بتاتے تھے۔

ڈاکٹر عبادالرحمٰن صاحب

ڈاکٹر عبادالرحمٰن صاحب کے آجانے سے شعبۂ جغرافیہ کو بہت فروغ ہوا۔ بکثرت طلبہ نے داخلہ لیا اور دور دور سے آنے والوں کا ہجوم لگ گیا۔ پھر تو دھوتی ہوسٹل (یعنی ڈیوٹی سوسائٹی ہوسٹل) میں بہت سی دھوتیاں سوکھتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ (۲)

۲۔ سوہن لال کا جغرافیہ بہت مقبول تھا۔ میں نے بھی وہ کتاب پڑھی تھی لیکن سوہن لال جب جغرافیہ میں ایم اے کا امتحان دینے آئے تو فیل ہو گئے۔

میرا ایک مضمون تاریخ تھا۔ پروفیسر عبدالرشید صاحب بہت تیاری کر کے آتے تھے۔ عبدالحلیم بنگالی صاحب تاریخ کی صرف ٹیوٹوریل کلاس لیا کرتے تھے۔ علی گڑھ میں اس وقت بعض مشہور اساتذہ اس مضمون کے لئے موجود تھے لیکن ان کا مطالعہ صرف انگریزی کتابوں تک محدود تھا۔ حالانکہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے لئے عربی اور فارسی کی اعلیٰ قابلیت بہت ضروری ہے۔ ورنہ بہت سی غلطیاں ہو جاتی ہیں جو بعض ایسی کتابوں میں نظر آتی ہیں جو اس زمانے میں شائع ہوئی ہیں۔

قاری ضیاء الدین احمد صاحب

اوپر عرض کیا گیا کہ راقم الحروف عثمانیہ ہاسٹل آ گیا تھا۔ وہاں آتے ہی اللہ کی طرف سے مجھے دو انعام حاصل ہوئے یعنی دو مشہور بزرگوں کی خدمت میں حاضری نصیب ہوئی۔ ایک قاری ضیاء الدین احمد صاحبؒ (م ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء) تھے اور دوسرے حضرت مولانا سلیمان اشرف صاحبؒ (م ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء)۔ حضرت قاری ضیاء الدین احمد صاحب نے حضرت قاری عبدالرحمٰن مکی علیہ الرحمہ (م ۱۳۴۹ھ) سے قرأتِ عشرہ تک کی تکمیل کی تھی۔ امروہہ، کان پور، لکھنؤ، جونپور، الہ آباد، وغیرہ میں برسوں تعلیم دی تھی اور ہندوستان کے اکثر قراء ان کے شاگرد تھے یا شاگردوں کے شاگرد تھے۔ عربی نظم ونثر بلا تکان لکھتے تھے۔ عربی نظم میں ان کی کتاب خلاصۃ البیان (علمِ تجوید پر) قریب ۲۸ سال کی عمر میں تیار ہوئی تھی۔

حضرت قاری عبدالرحمٰن مکی علیہ الرحمہ (م ۱۳۴۹ھ) کے انتقال کے بعد وہ مسلم یونیورسٹی میں استاذِ تجوید وقرأت مقرر کیے گئے۔ راقم الحروف کی خوش نصیبی ہے کہ یونیورسٹی میں سب سے پہلے روایتِ حفصؒ کی سند انہوں نے مجھ ہی کو عنایت فرمائی۔ اور حضرت مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری علیہ الرحمہ (م ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء) نے جو ناظمِ دینیات تھے میری سند کی تصدیق فرمائی۔

علی گڑھ کی معاشرتی زندگی میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہاں دیوبندی اور بریلوی، شیعہ اور سنی جیسی کوئی تفریق نہیں تھی۔ مولانا گو کہ بریلوی مسلک کے تھے اور حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب علیہ الرحمہ (م ۱۳۴۰ھ) کے خلیفہ تھے۔ لیکن ہمیشہ مولانا ابوبکر محمد شیث

جونپوری صاحب کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ دیوبندی تھے۔ اقامت شروع ہوتے ہی مولانا نماز، کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ یعنی حی علیہ الصلوٰۃ سن کر کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ جمعہ کے خطبہ کی اذان باہر ہونی چاہئے۔ انہوں نے اور ان کے کسی پیر بھائی نے کبھی نہیں کہا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ''حاضر و ناظر'' ہیں (۳) اور میلاد شریف جب بھی پڑھا جائے تشریف لے آتے ہیں۔ آج کل کے بریلویوں نے ''حاضر و ناظر'' کے مسئلے پر بہت زور دے رکھا ہے اور اب جماعت کے وقت امام مصلے پر بیٹھ جاتا ہے اور جب تکبیر کے وقت اشہد ان لاالہٰ الا اللہ اور اشہد ان محمد رسول اللہ کہا جاتا ہے تو دونوں اشہد کے وقت رفعِ سبابہ کرتا ہے اور جو نہ کرے اسے کافر سمجھتا ہے۔ ہمارے مولانا ان تمام باتوں کے خلاف تھے۔ البتہ اشہدُ ان محمد رسول اللہ سن کر دونوں انگوٹھوں کے پاس کی انگلیاں لبوں پر لگا کر (چوم کر) آنکھوں سے لگا لیتے تھے۔ اور انہوں نے کبھی کسی کو کافر نہیں کہا۔

رشید احمد صدیقی صاحب

بی اے کی لازمی اردو، پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب پڑھاتے تھے۔ دیوانِ غالبِ نشاطِ روح (اصغر) اور مقدمۂ شعر و شاعری (حالی) بہت خوب پڑھاتے تھے۔ کلاس بہت بڑی تھی۔ لیکن چونکہ وہ خود علی گڑھ کے مایۂ ناز طالب علم رہ چکے تھے اس لئے اپنی بذلہ سنجی سے شریر طلبہ کو بھی ایک آدھ جملے سے خاموش کر دیتے تھے۔ خوش باش، خوش کلام اور خوش

۳۔ راقم الحروف کئی مرتبہ مدینہ منورہ میں مولانا احمد رضا خاں صاحبؒ کے خلیفہ مولانا ضیاء الدین صاحب (م ۱۴۰۲ھ) کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ غالباً (۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء) میں ان کی خدمت میں فیصل آباد کے ایک بھاری بھر کم مولانا بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مولانا ضیاء الدین صاحب سے دریافت کیا کہ تشہد میں ''السلام علیک ایھا النبی'' ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر ہیں۔ مولانا نے غالباً ان کی دل جوئی کے لئے (ہاں کہنے کے واسطے) سر ہلا دیا۔ اس کے بعد سے حاضر و ناظر کا مسئلہ پاکستان میں بہت زور شور سے اٹھایا جا رہا ہے۔ حالانکہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ) نے بھی اپنے مکتوب نمبر ۳۸ میں اس عقیدے کی تردید فرمائی ہے۔

اوقات تھے۔ان کی شفقت سے بعض طلبہ کو اپنے متعلق غلط فہمی بھی ہو جاتی تھی چنانچہ بعد میں بعض نے احسان فراموشی بھی کی ہے۔

بعض غیر ملکی اساتذہ

علی گڑھ میں سرسید کے پوتے سرراس مسعود صاحب ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء سے یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء تک وائس چانسلر رہے۔انہوں نے کسی مصلحت کی بنا پر غیر ملکی اساتذہ کو یونیورسٹی میں جگہ دی۔حتیٰ کہ شعبۂ عربی میں جرمنی کے Dr. Otto Spies کو لے لیا۔(۴) وہ بے شک قابل اور بہت ملن سار تھے۔لیکن ان سے زیادہ قابل حضرات اس شعبے میں موجود تھے۔اسی طرح یونیورسٹی اسکول میں باہر سے درآمد کئے جانے والے G.C Woods پرنسپل بنائے گئے۔وہ اپنی حرکات وسکنات سے بھی جنگل کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔لڑکوں نے ان کو تماشا بنالیا تھا۔

۱۹۳۲ء میں کتاب ''انگارے'' شائع ہوئی تو علی گڑھ شہر سے ایک ہفت روزہ یا پندرہ روزہ اخبار خشماف کے نام سے جاری ہوا۔(اس کے مدیر غالباً وحید اللہ احرار اور مولانا ابرار حسین فاروقی تھے)۔اخبار کا نام ''خان بہادر شمس العلماء مولانا ابوالفداء'' کے ہر پہلے حرف کا مجموعہ تھا۔اس میں ایک مستقل باب ''آگ کھائیں انگارے'' ہوا کرتا تھا۔دہریت کے لئے جو نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا اور صرف بے حیائی والے افسانوں کو شائع کرنا Realism کہا گیا تھا۔اس کے خلاف اس اخبار میں مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے صدر ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب اس نئے شوق کے سخت خلاف تھے۔انہوں نے Realism کے نام سے ایک کتاب لکھی جو کیمبرج یونیورسٹی پریس نے شائع کی۔آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں وہ کتاب ''بطورِ حوالہ'' داخل نصاب تھی۔ملحد قسم کے نوجوان اس کتاب کو اپنے

۴۔محمد یوسف صاحب (راولپنڈی چھاؤنی) ماشاء اللہ ۹۵ سال کے ہیں اور غالباً اب وہی سب سے پرانے علیگ ہیں۔انہوں نے ۱۹ اپریل ۱۹۹۵ء کو مجھے لکھا کہ ''جب علی گڑھ میں ایک جرمن فوت ہوگیا تو اس کی جگہ دوسرا جرمن جناب راس مسعود صاحب نے بلالیا۔پھر ڈاکٹر احسان حقی صاحب نے (جو عربی کے پروفیسر تھے) بطور protest کے ملازمت چھوڑ دی اور دمشق واپس چلے گئے۔

لیے زہر سمجھتے تھے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کی ''اسلام دوستی'' سے پریشان تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے میرا تعلق بھائی عبدالحمید جالندھری کی وجہ سے ہوا تھا کہ وہ ان کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ایسے لوگوں سے بحث ومباحثہ کے لئے میں حاضر ہوں لیکن تم لوگ ان کی خیریت پوچھ لیا کرو۔ چنانچہ ایک صاحب کی خیریت میں نے بھی پوچھ لی تھی۔ اس سے ان کے دماغ کی فوراً اصلاح ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوبصورت اور خوب سیرت تھے۔ ان کی ڈاڑھی بھی بہت خوبصورت تھی۔ طلبہ کو شوق دلانے کے لئے اپنے بنگلے پر بنوٹ سکھانے کا انتظام کیا تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ زنانے لوگ بھی چھپ کر کلاشنکوف سے بے قصور لوگوں کو مارنا بہادری سمجھیں گے۔

ڈاکٹر ہادی حسن صاحب

بی اے اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کی شخصیت سے متاثر ہو کر میں نے ایم اے (فارسی) میں داخلہ لے لیا۔ ڈاکٹر صاحب نہایت حسین وجمیل، نازک اندام اور نازک مزاج تھے۔ ایرانی النسل ہونے کی وجہ سے ''حسنِ طبیعت'' کا مجسمہ تھے۔ غیر معمولی ذہین، انگریزی اور جدید فارسی کے بلند پایہ فاضل اور بہترین مقرر تھے۔

غلام السیدین صاحب جو بی ٹی کالج کے پرنسپل اور خود بھی بہت اچھے مقرر تھے وہ ڈاکٹر صاحب کو Stage dramatist کہا کرتے تھے۔ جو شخص انگریزی یا فارسی نہیں سمجھتا تھا وہ بھی مسحور ہو جاتا تھا۔ لندن میں Duke of Windsor کے ہم جماعت تھے۔ پروفیسر براؤن سے بہت مستفیض ہوئے۔ فرماتے تھے کہ پروفیسر براؤن کہا کرتے تھے کہ دنیا میں صرف عربی اور لاطینی کو ام الالسنہ کہنا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کئی فاضلانہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ بڑی بڑی کتابیں بہت جلد یاد کر لیتے تھے اور اپنی تقریر میں نثر کی عبارتیں ایسی خوبی کے ساتھ ضم کر لیتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ F.W Bain کی عبارتیں انہیں بہت پسند تھیں مجھ سے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ تم بھی ایسی عبارتیں یاد کر لیا کرو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ بھی ایسی عبارتوں کے بجائے قرآن پاک کیوں حفظ نہیں کر لیتے؟ انہوں نے برجستہ کہا کہ میں نے ایک تہائی قرآن حفظ کر لیا ہے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ تم دولت شاہ کے تذکرے

کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالو۔ میں نے چند روز میں اس کی نثر کا انگریزی نثر میں اور اس کے اشعار کا انگریزی اشعار میں ترجمہ (نصف کے قریب) کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا۔ بہت خوش ہوئے اور عرصے تک اپنے پاس رکھا۔ ڈاکٹر صاحب بار بار ایران جاتے رہتے تھے اور وہاں کی زبان اور معاشرے سے متاثر ہو کر آتے تھے۔ خوش اخلاق ایسے تھے کہ انکار کا لفظ ان کی زبان سے کبھی ادا نہیں ہوتا تھا۔ ان کی ذاتی زندگی کے واقعات اسی انکار کے نہ ہونے کی داستان تھے۔ ان کے صبر و تحمل سے متعلق بہت سی باتیں ہیں جن کا اجر اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات خوب خوب بلند فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین۔

حاجی حمید الدین صاحب

شعبۂ فارسی کے دوسرے استاد لیفٹیننٹ حاجی حمید الدین صاحب تھے۔ وقت کے سخت پابند۔ پڑھائی کا گھنٹہ شروع ہوتے ہی فوراً پڑھائی شروع کر دیتے تھے اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی فوراً پڑھائی ختم کر دیتے تھے بلکہ جملہ بھی ادھورا چھوڑ دیتے تھے۔

ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ تم فلاں جگہ (غالباً) نو بجے مجھ سے ملنا۔ مجھے ۲۔۳ منٹ کی دیر ہوگئی تو وہ وہاں صحیح وقت پر آکر جا چکے تھے۔ مجھ سے فرماتے تھے کہ تم لیڈر بننا (معلوم نہیں، کیوں ایسا فرماتے تھے)۔

۱۹۳۵ء میں جب کہ ہم لوگوں کا فائنل کا امتحان ہونے والا تھا وہ ریٹائر ہو گئے۔ فرمانے لگے کہ مجھے اپنے مضمون (فارسی) سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ ان کو شکار کا بہت شوق تھا اور اڑتے ہوئے پرندوں کا خوب نشانہ بناتے تھے۔ اپنے مکان کے ایک کونے میں انہوں نے مٹی کا ایک ڈھیر لگا دیا تھا اس پر نشانے کی مشق کرتے رہتے تھے۔ آخر وقت میں قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا۔ لیکن پھر ضعف کی وجہ سے نہ کر سکے۔

ضیاء احمد صاحب

شعبۂ فارسی کے تیسرے استاد فاضل یگانہ ضیاء احمد بدایونی صاحب تھے۔ عربی،

فارسی، اردو تینوں زبانوں اور ان کے ادب پر اتنا عبور تھا کہ خود ان مضامین کے اساتذہ ان کے فضل وکمال کے معترف تھے۔ بیماری کی حالت میں بھی وہ پابندی کے ساتھ پڑھاتے تھے اور مطبوعہ کتابوں کے الفاظ کی تصحیح فرمادیتے تھے۔ پھر غلطیوں کی تحقیق کا شوق بھی پیدا کراتے تھے۔شعروشاعری ان کے گھر کی لونڈی تھی۔یعنی ان کے گھر کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی اچھا شعر کہہ لیتے تھے۔ میں نے انہی کے مشورے سے سید حسن غزنوی (م ۵۵٦ھ) پر کام کیا تھا اور اس سلسلے میں اس کے متعدد معاصرین کے کم یاب کلام سے سلطان بہرام شاہ غزنوی کی تاریخ کے لئے اشارات جمع کئے تھے۔

سید حسن کے عربی قصائد کی تصحیح (جس کے لئے ملک کے بڑے بڑے فضلا نے معذرت کرلی تھی) صرف قبلہ ضیاءاحمد صاحب کی وجہ سے ہوسکی تھی۔ان کا انگریزی اور اردو خط نہایت پاکیزہ تھا۔وہ روانی میں بھی پاکیزگی کو برقرار رکھتے تھے اور خود بھی بہت نستعلیق قسم کے بزرگ تھے۔

ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ فردوسی (=۳٦۰) اور اس کا شاہ نامہ (=۴۰۲) دونوں تاریخی معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ تاریخی شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ۳٦۰ھ میں شاعری شروع کی تھی اور ۴۰۲ھ میں اس نے شاہ نامہ مکمل کیا تھا۔قبلہ ضیاءاحمد صاحب بہت خوش ہوئے۔فرمایا'' بیٹے، تم نے بات تو بہت اچھی کہی ہے۔لیکن اس صدی میں ایسے تاریخی ناموں کا رواج نہیں ملتا۔''

قبلہ ضیاءاحمد صاحب کی شفقتیں مجھ پر ان کے آخری دم تک رہی ہیں اور میں بھی ان کے درجات میں بلندی کے لئے دعا میں کبھی ناغہ نہیں کرتا۔

مولانا عبدالخالق صاحب

ایم اے کے ساتھ ایل ایل بی کلاس میں داخلہ لیا جاسکتا تھا اور اس کے امتحان میں کم ازکم پچاس فی صدی نمبر حاصل کرنے ضروری تھے۔ میں نے اور میرے چند خاص احباب نے بھی اس کلاس میں داخلہ لے لیا تھا، کیونکہ اس کی کلاسیں مغرب کے بعد ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں اس کے لئے تین استاد تھے۔ مولانا عبدالخالق صاحب، بیرسٹر خسرو صاحب اور

بیرسٹر خواجہ اسحاق صاحب۔

مولانا عبدالخالق صاحب بہت خاموش طبیعت تھے۔ پورے وقت میں سنجیدگی سے پڑھاتے تھے۔ شروع میں حاضری لیتے تھے اور طلبہ کی آواز پہچانتے تھے۔ اگر کسی طالب علم نے اپنے کسی غیر حاضر دوست کی حاضری کے لئے yes sir کہہ دیا تو وہ پھر سے حاضری لینا شروع کرتے تھے۔ اس مرتبہ وہ بے چارہ اپنے دوست کی حاضری کے وقت چپ ہو جاتا تھا لیکن مولانا کچھ نہیں بولتے تھے۔ ازراہِ شفقت انہوں نے مجھے بہت اچھا سرٹیفکیٹ عنایت فرمایا تھا جو ابھی تک محفوظ ہے۔ ان کی کوٹھی میرس روڈ میں مخدومی نواب حبیب الرحمٰن خان شیروانی صاحب کی کوٹھی کے مقابل تھی۔ سنا ہے کہ اب اس روڈ کا نام مولانا عبدالخالق روڈ ہو گیا ہے۔

بیرسٹر خسرو اسحاق صاحب

یونیورسٹی کا علاقہ بہت وسیع تھا۔ جنوبی حصہ میں مسلم یونیورسٹی پریس اور دوسری سڑک پر اساتذہ کے بنگلے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس علاقے اور شہر کے درمیان حدِ فاصل کٹھ پُلا (لکڑی کا پل) اور ریلوے اسٹیشن ہی کو سمجھا جاتا تھا۔

کٹھ پُلے کا مشرقی حصہ ایک بزرگ برچھی بہادرؒ کے مزار کے قریب ختم ہوتا تھا اور اسی کے ساتھ ریلوے لائن تھی۔ اس پل کا مغربی حصہ جہاں ختم ہوتا تھا اس کے آگے رسل گنج محلہ تھا۔ اس کی سڑک بالکل سیدھی چلی جاتی تھی۔ قریب ایک فرلانگ پر انس خان وکیل کا بنگلہ بائیں ہاتھ پر تھا اور اس کے مقابل دائیں ہاتھ پر گلی میں ہمارے دوسرے محترم استاد بیرسٹر خسرو اسحٰق صاحب کا بہت کشادہ مکان تھا اور گلی کے نکڑ پر مشہور درزی تلسی کی دکان تھی۔ بیرسٹر صاحب بہت گراں گوش تھے لیکن بہت محنت سے پڑھاتے تھے۔ وہ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمہ کے قریبی عزیز تھے۔ میرے دوست نامدار خان کی شادی انہی کے خاندان میں ہوئی تھی۔ جس سڑک کا ذکر ابھی آیا ہے وہ آگے بڑھتی تھی تو بائیں طرف دوسرے مشہور درزی پرشادی کی دکان تھی اور ذرا آگے داہنی طرف پولیس تھانہ تھا۔ پھر آگے بڑھ کر تیسرے مشہور درزی علاء الدین کی دکان تھی اور اس کے آگے چوراہا آتا تھا۔ اس سے ایک راستہ بالائی قلعے کو جاتا تھا اور دوسرا راستہ پھول والوں کی طرف ہوتا ہوا موتی مسجد کی طرف جاتا تھا۔

بیرسٹر خواجہ اسحاق صاحب

اس مسجد سے کچھ آگے ہمارے تیسرے استاد بیرسٹر خواجہ اسحٰق صاحب رہتے تھے۔ میں ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا ہوں۔ وہ میری اور چودھری عبدالحمید صاحب کی دوستی پر رشک کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم لوگوں کی دوستی کی طرح میری بھی کسی سے دوستی تھی لیکن اب قریب رہتے ہوئے بھی ان سے ملاقات نہیں ہوتی۔ بیرسٹر خواجہ اسحٰق صاحب کی ایک بہن امراؤتی (برار) میں تھیں جب کہ میں وہاں کنگ ایڈورڈ کالج میں پڑھاتا تھا۔ محترمہ کے شوہر وہاں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ (افسوس کہ اب ان کا نام یاد نہیں)۔ محترمہ چونکہ میرے استاد کی بہن تھیں اس لئے میں ان کو پھوپھی کہا کرتا تھا۔ ان کے امتحان (بی اے) کی تیاری میں بالخصوص فارسی مضمون ان کے مکان پر جا کر پڑھایا کرتا تھا۔ افسوس کہ اب کوئی بھی نہیں رہا۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں ☆

☆ انعت علیم۔ ص ۶۲

باب سوم

مشائخ

حضرت مولانا عبدالغفور مدنیؒ

حضرت مولانا عبدالغفور عباسی علیہ الرحمہ نے غالباً ۱۹۲۷ء میں مدینہ طیبہ کو ہجرت فرمائی تھی۔ان کی خدمت میں پہلی بار مجھے ۱۹۵۳ء میں حاضری نصیب ہوئی۔اس وقت میرے شیخ مولانا زوار حسین شاہ صاحب علیہ الرحمہ اور جماعت کے کئی حضرات ساتھ تھے۔حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے شاہ صاحبؒ کو دیکھتے ہی فرمایا (بعد سلام مسنون) کہ ''زوار حسین،تم تو میری اولاد ہو،ابھی سے بوڑھے ہوگئے''۔(یعنی سخت ریاضت کی وجہ سے جوانی ہی میں آپ کے تمام بال سفید ہوگئے تھے)۔اس کے بعد یہ عاجز حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عریضے ہی لکھتا رہا۔پھر میری خوش نصیبی سے حضرت مولانا ۱۹۵۸ء کے شروع میں کراچی تشریف لائے اور ۲۳ جنوری کو حیدرآباد میں جماعت کے ہمراہ غریب خانے کو عزت بخشی۔ایک دن اور ایک رات قیام فرمایا (اس کے بعد بھی دو مرتبہ غریب خانے میں چند گھنٹے قیام فرمایا) اور اس عاجز پر عجیب عجیب عنایتیں مبذول فرمائیں جن کا ہرگز اہل نہیں تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل وکرم ہوا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بار بار مدینہ منورہ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی،وہیں کے چند واقعات خود اپنے فائدے کی غرض سے عرض کرتا ہوں۔

ایک مجلس میں ایک اہلِ حدیث نے آپ سے عرض کیا کہ رفع یدین کی تائید میں بخاری شریف کی چار حدیثیں ہیں جو حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہیں البتہ ایک حدیث حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین نہیں کیا،تو آپ بتائیں کہ ان چار حدیثوں پر عمل کیا جائے یا ایک پر؟ حضرت مولانا رحمۃ

اللہ علیہ نے فرمایا کہ آپ کا سوال ہی آپ کا جواب ہے، یعنی حدیث میں جو مقام حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ہے وہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا نہیں ہے۔ اس جواب سے وہ عالم شرمندہ ہوا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ روئے سخن بدل کر عرض کرنے لگا کہ حضرت! کیا آپ کبھی بیت المقدس تشریف لے گئے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ جی ہاں، میں وہاں حاضر ہوا ہوں اور میں نے وہیں سے احرام بھی باندھا ہے۔ وہ عالم فوراً بول اٹھا کہ آپ نے وہاں سے احرام کیوں باندھا؟ آپ نے جواب دیا کہ ''وہی حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما جن کی حدیث آپ بیان کررہے تھے انہوں نے بیت المقدس سے احرام باندھا تھا۔'' اس جواب سے وہ مزید شرمندگی میں مبتلا ہوگیا اور پھر خاموشی سے چلا گیا۔

ایک مجلس میں ایک مصری یا شامی عالم آیا، ایک شخص نے ان کا تعارف کرایا کہ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور مشہور عالم ہیں۔ حضرت مولانا اس عالم سے ملے لیکن اس کے ڈاڑھی نہیں تھی (جیسا کہ عرب وغیرہ کے عالموں اور قاریوں نے شیوہ بنا رکھا ہے) حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ڈاڑھی کے سخت حامی تھے بلکہ مرید کرتے وقت اعلان فرماتے تھے کہ ڈاڑھی رکھنی ہوگی، انگریزی بال کٹوانے ہونگے، سگریٹ بیڑی چھوڑنی پڑے گی، ٹائی چھوڑنی پڑے گی، سینما وغیرہ لہو ولعب ترک کرنا پڑے گا۔ اگر یہ شرطیں منظور ہوں تو بیعت ہوجاؤ ورنہ نہیں۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے جب اس بے ڈاڑھی عالم کو دیکھا تو آپ کی طبیعت مکدر ہوگئی۔ آپ نے مجھ بے علم وعمل کی طرف اشارہ کرکے اس عالم سے فرمایا ''یہ شخص پاکستان سے آیا ہے اور ممکن ہے کہ یہ علم میں آپ سے کم ہو لیکن اس نے شریعت کے مطابق ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے اور آپ عالم ہوکر ڈاڑھی نہیں رکھتے۔'' اس عالم نے بدبختی سے یہ جواب دیا کہ ''ڈاڑھی رکھنا تو ضروری نہیں ہے۔'' حضرت مولانا اس جواب پر برافروختہ ہوگئے اور متعدد حدیثیں ڈاڑھی کی تائید میں پڑھیں پھر فرمایا کہ ''قرآن بھی گواہی دیتا ہے کہ انبیاء علیہ السلام نے بڑی ڈاڑھی رکھی ہے جو قبضے میں آسکے، جیسا کہ ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی ڈاڑھی قبضے میں پکڑی تھی اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا:

لا تاخذ بلحیتی

ایک مجلس میں ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کے متعلق دریافت

کیا۔آپ نے فرمایا کہ لقد جاء کم من الله نور و کتاب مبین مائدہ والی آیت میں نور سے بعض مفسرین نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی مراد لی ہے۔ پھر فرمایا کہ ایک حدیث ہے کہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایک فاسق مسلمان کے نور کو ظاہر کر دیا جائے تو وہ زمین اور آسمان کا احاطہ کر لے گا تو پھر ایک متقی مسلمان کا نور کیسا ہوگا؟ اور پوری کائنات کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کا کیا کوئی اندازہ لگا سکتا ہے؟ مراد نورِ ہدایت ہے۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا مررتم بریاض الجنة فارتعوا منها قالو اومارياض الجنة قال حلق الذكر

جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو خوب میوے کھاؤ۔ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے پوچھا کہ جنت کے باغ کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ذکر کے حلقے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث بھی اکثر بیان فرماتے تھے:

من تمسك بسنتي عند فساد امتي فله اجر مأة شهيد

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص قائم رہا میری سنت پر میری امت کے بگڑنے کے وقت تو اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

پھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ تم اگر ایک سنت (مثلاً ڈاڑھی) پر قائم ہو جاؤ تو تم کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی فرماتے تھے کہ دیکھو حضرت خالد بن ولیدؓ ہمیشہ شہید ہونے کی دعا کرتے تھے لیکن ان کی دعا قبول نہیں ہوئی، اور تم کو ایک سنت قائم رکھنے پر سو شہیدوں کا ثواب مل رہا ہے۔

ہم جیسے خادم چاہتے تھے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دست بوسی کریں۔ آپ اجازت تو دے دیتے تھے لیکن فرماتے تھے کہ دیکھو تمہاری پیشانی اور ناک نہ لگنے پائے۔ کہ دست بوسی پھر سجدے کے حکم میں آجاتی ہے۔

ایک مرتبہ بہت سے خدام آپ کے گرد جمع تھے۔ ایک صاحب باہر سے تشریف لائے اور مزاج پرسی کی۔ آپ نے فرمایا ’’کہ اس شخص کا حال اس سے بہتر اور کیا ہوگا کہ وہ اللہ

اللہ کرنے والوں کے درمیان ہو۔''

ایک مرتبہ ایک عجیب اتفاق ہوا اور لطیفہ ہوا۔ مولانا غلام دستگیر صاحب ہالانی سے حیدرآباد تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا کہ اس زمانے میں (صدر محمد ایوب خاں مرحوم کے زمانے میں) یہ دقت ہوگئی ہے کہ پاسپورٹ میں سعودی عرب جانے کے لئے اندراج اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک یہ حلف نامہ نہ دیا جائے کہ میں حج پر نہیں جاؤں گا۔'' میں نے کہا کہ حلف نامہ پر دستخط کے وقت ایک منٹ کے لئے آپ اپنا ارادہ روک لیجئے کہ میں حج پر نہیں جاؤں گا لیکن دستخط کرنے سے پہلے اور بعد میں بھی یہ ارادہ ہے کہ حج پر ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے بھی حلف نامے پر اس نیت کے مطابق دستخط کئے۔ اور اس عاجز نے بھی اس نیت کے مطابق دستخط کئے۔ یہ عاجز ان سے کچھ پہلے مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا، مولانا غلام دستگیر بھی وہاں پہنچے، انہوں نے ہجوم میں مجھے نہیں دیکھا اور حضرت صاحب رحمہ اللہ سے عرض کرنے لگے کہ حضور میں حیدرآباد گیا تھا تو غلام مصطفیٰ نے حلف نامہ پر دستخط کرنے کے سلسلے میں یہ طریقہ بتایا۔ حضرت صاحب مسکرانے لگے اور فرمایا کہ غلام مصطفیٰ تو یہ بیٹھا ہوا ہے۔ تب مولانا غلام دستگیر صاحب نے مجھے دیکھا اور وہ بھی بہت محظوظ ہوئے۔ (یہ مولانا غلام دستگیر صاحب وہی ہیں جو حضرت مولانا کو اور ان کے طفیل میں ہم خادموں کو بھی بادام والی روٹیاں کھلاتے تھے)۔

حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ہر شخص سے ایک دو خصوصی باتیں ضرور کرتے تھے جس سے وہ شخص سمجھتا تھا کہ آپ مجھ سے بڑی محبت فرماتے ہیں، اور آپ کی یہ محبت اور شفقت بالکل حقیقت بھی تھی اور آپ کے عظیم ہونے کی علامت بھی تھی۔

۱۹۶۷ء کے حج میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی بیماری کی وجہ سے شرکت نہ فرما سکے، یہ عاجز مدینہ منورہ حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ زیادہ بیمار ہیں اور کسی کو ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ مجھے بڑا قلق ہوا کہ درِ دولت پر حاضر ہو کر بھی نیاز حاصل کرنے سے محروم رہا۔ میں نے ایک کاغذ پر حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قطعہ لکھا۔

تو آں شاہی کہ بر ایوانِ قصرت
کبوتر گر نشیند باز گردد

غریبے مستمندے بر درآمد
بیاید اندروں یا باز گردد

میں نے یہ کاغذ حضرت صاحب کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا عبدالحق صاحب کو دیا کہ ازراہِ کرم یہ حضرت صاحب کو پہنچا دیں۔ حضرت صاحب بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ جونہی یہ کاغذ اور قطعہ دیکھا تو چیخ مار کر رونے لگے اور فرمایا کہ غلام مصطفیٰ کو بلاؤ۔ میں حاضر ہوا تو بہت دیر تک سینے سے لگا کر روتے رہے اور مستفیض فرماتے رہے۔ پھر ایک بڑا رومال اور ایک بڑی تسبیح عنایت فرمائی جو کھجور کی بنی ہوئی تھی اور فرمایا کہ مراقبے میں استعمال کرنا۔

دوسرے سال حسب معمول پھر آپ نے حج کیا لیکن صحت گرتی ہی گئی۔ اس کے بعد والے حج میں پھر آپ نے ہمت کر کے شرکت کی۔ لیکن منیٰ میں طبیعت زیادہ خراب ہوگئی اس سال ۲۶ فروری ۱۹۶۹ء کو حج ہوا تھا۔ آپ نے مدینہ منورہ میں ۱۷ فروری کو مریض کی شفا کے لئے یہ وظیفہ عنایت فرمایا کہ ''ہر نماز کے بعد سورۃ الفاتحہ، آیۃ الکرسی، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس (مکمل مع بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ایک ایک مرتبہ) پڑھ کر اپنے اوپر دم کرے اور ہر روز کسی وقت ۳۱۳ بار یا اللہ یا سلام یا قوی پڑھ کر دم کر دے۔ ظاہر ہے کہ حضرت صاحب رحمہ اللہ خود بھی یہ وظیفہ پڑھتے رہے ہوں گے لیکن **لکل داءٍ دواء الا الموت** کے مصداق آپ کی تکالیف بڑھتی گئیں۔

شروع مئی ۱۹۶۹ء میں خاص محبین یعنی حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحب مدظلہ حضرت مولانا علاء الدین صاحب مدظلہ اور مولانا حشمت علی صاحب مدظلہ وغیرہم آپ کو بہ غرضِ علاج کراچی لائے اور ہسپتال میں داخل کیا اور علاج شروع کیا۔ لیکن ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ معدے میں سرطان ہوگیا ہے۔ آپ کو اس مرض کی اطلاع نہیں دی لیکن حالت بگڑتی گئی۔ پورے پاکستان میں جہاں جہاں خدام تھے اطلاع ملتے ہی کراچی پہنچنے لگے لیکن ڈاکٹروں نے کہا کہ زیارت نہ کریں۔ یہ عاجز بھی خدمت میں پہنچا۔ سلام اور مصافحے کے بعد حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''ڈاکٹر صاحب جو ہونے والا ہے ہو کر رہے گا لیکن مجھے دعاؤں میں مت بھولنا''۔ اس جملے کا دل پر بہت اثر ہوا اور جو ہونے والا تھا ہو کر رہا۔ یعنی آپ اپنے احباب کے ساتھ جلد ہی واپس مدینہ منورہ (ہوائی جہاز سے) تشریف لے گئے اور وہاں یک

شنبہ یکم ربیع الاول ۱۳۸۹ھ/ ۱۷ مئی ۱۹۶۹ء کو واصل بہ حق ہوئے۔ حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت شاہ احمد سعیدؒ دہلوی کے قریب دفن ہوئے۔

اس عاجز نے وصیت کے مطابق اپنی ناچیز دعاؤں میں ہمیشہ آپ کو یاد رکھا ہے یہ صرف اللہ پاک کی خاص عنایت ہے۔ کاش یہ دعائیں بارگاہِ الٰہی میں منظور و مقبول ہوں اور حضرت کے درجات زیادہ سے زیادہ بلند ہوتے رہیں۔

اس عاجز نے آپ کے وصال پر یہ قطعۂ تاریخ لکھا تھا۔

رفت آں شیخِ عرب شیخِ عجم
محرمِ اسرارِ حق عبدالغفور
عالمِ اسلام۔ ازو شد مستفیض
مہرِ او در خیر ہرکس ناصبور
فاضلِ دین، باکمال و بے مثال
صاحبِ خلقِ عظیم و باشعور
مسلکش اخلاص در علم و عمل
صحبتش پرکیف و پرنور وسرور
''بزمِ جنت یافت ازراہِ بقیع''
۹ ۸ ۳ ۱ھ
رہنمائے راہِ دین عبدالغفور
۹ ۶ ۹ ۱ء

حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری چند سالوں میں مراقبے سے پہلے یہ ختم شریف بھی پڑھا کرتے تھے:

یالطیفاً بخلقہٖ یا علیما بخلقہٖ یاخبیرا بخلقہٖ الطف بی یا لطیف یا علیم یا خبیر

(۵۰۰ بار) اول و آخر ایک ایک سو بار درود شریف۔☆

☆ طوبیٰ لہم۔ ص ۵

حضرت مولانا شاہ زوار حسینؒ

یہ ذرۂ بے مقدار جس کی انتہا ایک مشتِ غبار ہے جبل پور (سی، پی) میں دوشنبہ ۱۰ شوال المکرم ۱۳۳۰ھ (۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء) کو پیدا ہوا۔ قریب ساڑھے چار سال کی عمر میں قرآن پاک شروع کیا اور اللہ پاک کے خصوصی فضل سے بہت جلد مکمل کرلیا۔ والد صاحب مرحوم کئی سال تک علیل رہے۔ لیکن بیماری کی حالت ہی میں مجھے نماز کی ترکیب لکھوادی اور استقامت کے لئے دعا فرمائی۔ اسکول میں داخلہ ہوا اور اعلیٰ کامیابی کی بنا پر چار سال تک وظیفہ ملتا رہا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد والدہ صاحبہ مرحومہ اور بڑے بھائی حاجی نذیر احمد خان مرحوم کے زیرِ تربیت رہا۔ ۱۹۲۸ء میں انجمن اسکول جبل پور سے نویں جماعت پاس کی۔ سی، پی میں گیارہویں جماعت میٹرک ہوتی تھی لیکن علی گڑھ میں دسویں جماعت میٹرک تھی اس لئے بڑے بھائی صاحب مرحوم نے ایک سال بچانے کے لئے مجھے علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں بفضلہٖ تعالیٰ بہت اچھے نمبروں سے ۱۹۲۹ء میں میٹرک پاس کیا اور وہیں سے ۱۹۳۶ تک دو ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کئے۔ علی گڑھ میں شیخ علی جواد صاحب مرحوم (استادِ دینیات) کی بڑی شفقت رہی۔ پھر انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد بی اے کے زمانے میں حضرت قاری ضیاء الدین احمد الہ آبادیؒ نے بڑا کرم فرمایا، تجوید اور روایت حفص رحمۃ اللہ علیہ کی تکمیل کرانے کے بعد عربی کی تعلیم بھی فرمائی۔ مولانا سلیمان اشرفؒ سے تفسیر اور کچھ حدیث کی تعلیم بھی نصیب ہوئی۔ مولانا ابوبکر شیث صاحبؒ کی شفقتوں سے بھی مستفید ہوا۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایوئیؒ، مولانا احسن مارہرویؒ، پروفیسر رشید احمد صدیقیؒ، حاجی حمید الدین خانؒ نے خصوصی شفقت فرمائی۔ لیکن علمی کاموں میں پروفیسر ضیاء احمد بدایوئیؒ، نواب حبیب الرحمٰن خاں

شروانیؒ، مولانا سیّد سلیمان ندویؒ اور ڈاکٹر محمد شفیعؒ سے ہمیشہ اور ان کے آخری ایام تک رہبری حاصل کی۔

علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں حضرت قاری ضیاء الدین احمد صاحبؒ کے ورع وتقویٰ سے میں بہت متاثر ہوا بلکہ دین سے تھوڑا بہت شغف انہی کی صحبت میں حاصل ہوا، وہ شریعت کے سخت پابند تھے تواضع، انکسار، کم گوئی، بے نفسی وغیرہ میں ان جیسے بزرگ بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ انہوں نے مجھے علی گڑھ سے رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی تھی کہ ''ہمیشہ اللہ پاک سے اچھی امید رکھنا''۔ ان کی یہ نصیحت میری زندگی کے ہر ہر قدم پر کارگر ہوئی۔ علی گڑھ کے اس زمانے میں ان کی ایک اور نصیحت یا مشورہ یہ تھا کہ تم اب حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہو جاؤ۔ لیکن میں نے کچھ ایسے مشائخ دیکھے تھے جن میں خود نمائی زیادہ تھی اور عجیب عجیب باتیں تھیں اس لئے میں خاموش ہو گیا اور ان کے مشورے پر عمل نہ کر سکا۔ پھر میں اپنے وطن جبل پور آ گیا۔ کچھ ماہ بے کار رہا۔ پھر پبلک سروس کمیشن والوں نے کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار) میں میرا تقرر کر دیا۔ حضرت قاری ضیاء الدین احمد صاحبؒ نے علی گڑھ میں عین شفقت سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ان شاء اللہ میں تم کو قراءاتِ سبعہ (شاطبی) پڑھاؤں گا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں جب کہ وہ ہجری سنین میں قریب ستر سال کے ہو چکے تھے اپنے وعدے کے ایفا کی خاطر قریب ایک ہزار میل کا سفرِ تنہا طے فرما کر امراوتی تشریف لائے اور رات دن محنت کر کے میری تکمیل فرمائی۔

امراوتی کے قیام کے زمانے میں ایک مرتبہ (۱۹۳۸ء میں) تعطیل میں جبل پور گیا۔ وہاں سے الٰہ آباد، علی گڑھ، دہلی ہوتا ہوا اپنے عزیز دوست محترم چودھری عبدالحمید صاحب سے ملنے کے لئے جالندھر گیا، راستے میں سرہند شریف کا اسٹیشن تھا۔ مجھے اس وقت تک حضرت مجددِ الف ثانی قدس سرہٗ کے متعلق (بڑے بھائی صاحب کی زبانی) صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ ایسے بزرگ ہوئے ہیں جن کا ہر قوم اور ہر فعل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عین پیروی میں رہا ہے۔ جب میں سرہند شریف کے اسٹیشن سے گزرنے لگا تو اس قدر کشش محسوس ہوئی کہ ڈبے سے چھلانگ لگانے کو جی چاہتا تھا۔ عجیب اضطراب تھا لیکن پھر کوئی واقعہ درپیش نہیں ہوا اور کئی سال گزر گئے۔ ۱۹۴۷ء میں میرا تبادلہ ناگ پور ہو گیا اور اسی زمانے میں

پاکستان کی تشکیل ہوئی۔ نومبر میں ہم لوگ ناگ پور سے کراچی کے لئے بمبئی کے راستے سے روانہ ہوئے۔ بڑے بھائی صاحب کراچی پہنچ چکے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو چند روز کے بعد گود کا بچہ اور پھر اس کی والدہ نے داغِ مفارقت دیا۔ ناگ پور سے پروفیسر رفیع الدین صاحب کا خط آیا کہ چند ماہ کے لئے واپس آجائیں اور پھر موسمِ گرما کی تعطیل کے موقع پر کراچی چلے جائیں۔ چنانچہ ان کے مشورے کے مطابق مین ناگ پور پہنچا۔ لیکن سراج احمد سلمہ کی بیماری کے متعلق بڑے بھائی صاحب نے کراچی سے فون کیا تو میں جنوری ۱۹۴۸ء میں پھر کراچی کے لئے بمبئی کے راستے سے روانہ ہوا۔ بمبئی کی ایک مسجد میں (غالباً ۱۹ جنوری کو) ظہر کی نماز پڑھی نماز کے بعد مسجد میں آویزاں ایک چارٹ میں حضرت مجددِ الف ثانی قدس سرہٗ کے اقوال دیکھے۔ ایک قول یہ تھا کہ

''حق سبحانہٗ'' تعالیٰ را بواسطۂ آں دوست دارم کہ ربِ محمد است صلی اللہ علیہ وسلم (مبدأ ومعاد)

اس قول کو دیکھتے ہی دل پر ایک جھٹکا سا محسوس ہوا اور سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے دل کو مضبوطی سے تھاما۔ ایسا لگتا تھا کہ حرکت بند ہو رہی ہے۔ بڑی دیر میں دل قابو میں آیا۔ سبحان اللہ، کیا قول ہے کہ حمد ونعت دونوں کو یک جا کر دیا ہے۔ شاید ایسا قول کسی زبان میں نہیں ہے۔

کراچی آنے پر اسلامیہ کالج میں میرا تقرر ہو گیا۔ یہ بالکل نیا کالج تھا اور پناہ گزینوں کے لئے ایک ٹھکانا تھا۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں سخت بیمار ہوا اور کئی دن مسلسل بخار میں مبتلا رہا۔ ایک دن ایم اے کے طالب علم مرزا اسحاق بیگ صاحب میری عیادت کو آئے اور مجھ سے کہا کہ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے لئے بخار کا تعویذ لے آؤں۔ میں نے کہا، ضرور لا دیجئے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں ضرور شفا ہے۔ پھر میں نے انہیں حضرت مظہر جانِ جاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنایا کہ کس طرح ان کی دعا سے اور کلامِ الٰہی پڑھ کر دم کر دینے سے شاہ عالم بادشاہ کی بیگم کو شفا ہو گئی تھی جبکہ دہلی کے بڑے بڑے اطبا عاجز آچکے تھے۔ دوسرے دن مرزا اسحاق بیگ صاحب میرے لئے تعویذ لائے کہ اسے پانی میں گھول کر پی لیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ ماشاء اللہ نیک اور نمازی ہیں آپ ہی گھول کر دے دیجئے۔ انہوں نے وہ

تعویذ گھول کر مجھے دیا۔ میں نے اس کا پانی پیا تو پیتے ہی میرا بخار ختم ہوگیا اور دل میں فرحت پیدا ہوئی۔ میں نے کہا، مرزا صاحب، وہ کوئی اللہ والے ہوں گے جن سے آپ تعویذ لائے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ وہ میرے ہم جماعت اور پرانے دوست ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔انہوں نے کہا، کہ وہ خود ہی آپ سے ملنے کے لئے آجائیں گے۔ چند روز کے بعد جب میں کالج جانے لگا تو ایک دن مرزا صاحب کے ساتھ ان کے دوست صوفی محمد احمد صاحب کالج میں تشریف لائے۔ ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور اس وقت سے مخلصانہ تعلقات شروع ہوگئے۔ میں نے ایک دن ان سے کہا کہ آپ اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ایم اے پاس کرلیجئے تاکہ ترقی ہو۔ یہ رائے انہوں نے پسند کی اور پرائیویٹ طور پر امتحان کا فارم داخل کرادیا۔لیکن پابندی سے وہ اور حافظ رشید احمد ارشد صاحب (جو بعد میں کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر ہوگئے تھے) میری کلاس میں آنے لگے اور دونوں نے امتحان میں اچھے نمبر حاصل کئے۔

اسی دوران میں صوفی محمد احمد صاحب نے ایک دن مجھ سے فرمایا، کہ ہمارے حضرت صاحب (شاہ زوّار حسین صاحبؒ) آج تشریف لارہے ہیں۔آپ بھی ان کے ساتھ میرے یہاں کھانا کھائیں۔ میں حاضر ہوا تو حضرت شاہ صاحبؒ کی سادگی، تقویٰ اور تواضع سے بہت متاثر ہوا پھر وہ خیر پورٹامے والی تشریف لے گئے۔

کچھ عرصے کے بعد وہ پھر تشریف لائے اور میں نے ان سے دوبارہ نیاز حاصل کیا۔ لیکن اس مرتبہ وہ جلد واپس تشریف لے گئے۔ پھر یہ ہوا کہ ایک دن میں اپنی اہلیہ مرحومہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے جارہا تھا، صوفی محمد احمد صاحب بھی ساتھ ہوگئے۔ وہاں فاتحہ پڑھنے کے بعد صوفی صاحب نے فرمایا کہ آپ کی اجازت ہو تو میں یہاں قبر کے قریب بیٹھ جاؤں۔ میں کچھ نہ سمجھا۔ میں نے عرض کیا کہ ضرور بیٹھ جایئے۔ وہ مراقب ہوئے۔ ماشاءاللہ بڑے صاحبِ کشف تھے۔ مراقبے میں ان سے میری اہلیہ کی باتیں ہوئیں لیکن میرے نانا مولانا عبدالقادر خاں صاحبؒ کے توسط سے۔ وہ میری اہلیہ کے دادا تھے اور مرحومہ کے والد صاحب بہ قیدِ حیات تھے، غالباً اسی وجہ سے مولانا عبدالقادر صاحبؒ اس گفتگو کا واسطہ بنے۔ صوفی صاحب نے وہ باتیں مجھے بتائیں تو میرے دل پر اس قدر اثر ہوا کہ عرصے تک یکا یک چیخ نکل جاتی

تھی۔ پھر میں نے صوفی صاحب سے عرض کیا کہ آپ اپنے ذکر کا طریقہ مجھے بتائیں۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے ابھی اجازت نہیں ہے۔ لیکن اپنے حضرت صاحب کو لکھتا ہوں۔ اگر وہ اجازت دے دیں گے تو میں بتادوں گا۔ حضرت شاہ صاحب کو انہوں نے لکھا۔ جواب آنے پر صوفی صاحب نے مجھے ذکر کا طریقہ بتادیا۔ میں گھر گیا اور عشاء کے بعد مراقبے میں بیٹھا۔ اسی وقت سے مجھ پر ایسی کیفیات شروع ہوگئیں کہ جن کا میں خود کو اب بھی اہل نہیں سمجھتا۔

غالباً ستمبر ۱۹۴۹ء میں بزرگوں کا سالانہ اجتماع مظفر گڑھ میں ہوا۔ مولانا محمد سعید گوہانوی صاحبؒ اس کے مہتمم تھے اور وہ تین دن تک یہ اجتماع کراتے تھے۔ صوفی محمد احمد صاحب کے ساتھ میں بھی وہاں حاضر ہوا۔ وہاں بھی بفضلہٖ تعالیٰ عجیب انعامات ہوئے۔ صوفی صاحب کے توسط سے حضرت شاہ صاحبؒ سے بیعت ہونے کی درخواست کی۔ اس وقت تک بلکہ اس کے بعد بھی عرصے تک حضرت شاہ صاحبؒ بہت کم کسی کو بیعت فرماتے تھے۔ بہرحال میری درخواست پر تیسرے دن عشاء کے بعد مظفر گڑھ کی جامع مسجد کے ایک گوشے میں مجھے بیعت فرمایا (غالباً استخارہ بھی فرمایا تھا)۔ اس کے بعد سے ان کی توجہات اور دعاؤں سے بڑا کرم ہوا۔ دوسرے دن ان کے ساتھ ملتان کے بزرگوں کے یہاں حاضری دی۔ پھر خیر پور ٹامیوالی بھی ہم لوگ حاضر ہوئے۔ غالباً بیعت ہونے کے دو دن بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے مجھے دوسرا سبق دیا اور پھر ایسی عنایات شروع ہوئیں کہ بقیہ اسباق جلد جلد طے کرادیئے۔ اللہ پاک کا بے حد احسان ہے کہ مجھ جیسے شخص پر ایسا کرم ہوا جو پیروں سے سخت بے زار تھا۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

تصویر تری ہم نے اے جلوۂ جانانہ
سو آئینے توڑے ہیں تب دل میں اتاری ہے

پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے بارہا کراچی میں ہم سب کو نوازا، کئی کئی دن صوفی صاحب کے یہاں قیام ہوتا تھا۔ ہم لوگ حاضر ہوتے تھے اور دیکھتے تھے کہ وہ اکثر پوری رات مراقبہ فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم لوگوں کی درخواست پر منگھو پیر (حضرت عبدالرحمٰنؒ) کے مزار کے قریب رات گزارنے کا اہتمام ہوا۔ عشا کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے (غالباً میری نیند کی وجہ سے) فرمایا کہ مجھے بہت نیند آتی ہے، بہتر ہے کہ سب لوگ سو جائیں۔ میں

حضرت شاہ صاحبؒ کے قریب ہی لیٹ گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ لیکن یکا یک میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ اپنے بستر پر نہیں تھے۔ میں سمجھ گیا کہ مسجد میں ہوں گے۔ میں چپ چاپ دبے پاؤں مسجد میں داخل ہوا۔ لیکن وہاں چٹائی پر میرا پاؤں پڑا تو آہٹ ہوئی جس کو سن کر حضرت شاہ صاحبؒ فوراً لیٹ گئے۔ میں مسکرانے لگا کہ کس قدر اخفائے حال فرماتے ہیں۔ ایسے واقعات کئی مرتبہ دوسرے مقامات میں بھی ہو چکے ہیں، مظفر گڑھ، مسکین پور شریف اور ملتان وغیرہ میں بھی ہم لوگ رات کو سو جاتے تھے لیکن حضرت شاہ صاحب ہمارے قریب ہی مراقب ہوتے تھے اور ہماری اور ہمارے سامان کی نگرانی بھی فرماتے رہتے تھے۔ ایسی سخت ریاضت کی وجہ سے جوانی ہی میں ان کی ڈاڑھی، سر اور سینے تک کے بال سفید ہو گئے تھے۔

اب میں دو طویل سفر بھی بیان کر دوں۔ ۱۶ جون ۱۹۵۳ء کو حضرت شاہ صاحبؒ اور اماں جی مدظلہا کی معیت میں صوفی محمد احمد صاحب، ڈاکٹر عبدالرحیم گاندھی صاحب، یہ عاجز اور کئی اعزا بحری جہاز سے حج کے لئے روانہ ہوئے۔ ۲۴ جون کو جدہ پہنچے۔ اور وہاں سے جمعہ ۲۶ جون کو عصر کے بعد ہم سب لوگ مدینہ منورہ کے لئے بس میں روانہ ہوئے۔ حاجی کیمپ سے تھوڑی دور چلنے کے بعد پولیس تھانے کے قریب بس رک گئی۔ پولیس کا کوئی افسر معائنے کے لئے آیا تو اس نے مجھے اور میری اہلیہ کو زیادہ سواریوں کی وجہ سے سفر کرنے سے روک دیا ڈرائیور ہم لوگوں کو واپس حاجی کیمپ لانے لگا۔ میری عجیب کیفیت ہو گئی اور سخت اضطراب ہوا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے دعا فرمائی۔ اللہ کی شان کہ حاجی کیمپ پہنچتے ہی ایک افسر دوڑتا ہوا آیا اور ڈرائیور سے عربی میں اور مجھ سے اردو میں کہنے لگا کہ آپ لوگ ہرگز نہ اتریں بلکہ چلے جائیں۔ اللہ کا بڑا فضل ہوا اور میرا اضطراب دور ہوا۔ بس روانہ ہوئی۔ اس وقت تک پکی سڑک رابغ تک بنی تھی۔ آگے پورا راستہ پتھریلا تھا۔ چنانچہ دن کے وقت بس میں پنکچر ہو گیا اور کچھ دوسری خرابی بھی ہو گئی۔ گرمی سخت تھی اور سب لوگ پریشان تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی ایسی دعا ہوئی کہ وہاں سے ایک ٹرک کا گزر ہوا جس کے بیٹھنے والے مجھ سے واقف تھے۔ انہوں نے ٹرک روک لیا اور مجھ سے کہا کہ آپ اور آپ کے سب رفقا اس ٹرک میں بیٹھ جائیں۔ آپ لوگوں کو ہم آگے منزل پر اتار دیں گے۔ وہاں آپ سب آرام کریں۔ بس ٹھیک ہو کر وہیں آجائے گی اور آپ لوگوں کو بٹھا لے گی۔ چنانچہ ہم لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ پاک کا

بڑا فضل ہوا۔ اور ہم لوگ راستے میں آرام کرتے ہوئے ۲۸ جون کو مدینہ منورہ پہنچ گئے اور حضرت مولانا عبدالغفور صاحب علیہ الرحمہ کے دولت کدے پر قیام کیا۔

مولانا صاحب نے حضرت شاہ صاحبؒ سے بعد سلام مسنون فرمایا کہ ''زوّار حسین'' تم تو میری اولاد ہو ابھی سے بوڑھے ہو گئے ہو۔'' (یعنی سخت ریاضت کی وجہ سے تمام بال سفید ہو چکے تھے) مدینہ طیبہ کی برکات اور فیوضات سے جس قدر ہم لوگ مستفیض ہوئے وہ سب حضرت شاہ صاحبؒ کے طفیل میں تھا۔ ۱۸ جولائی کو مغرب کے بعد وہاں سے مکہ معظمہ کے لئے روانگی ہوئی۔ رات بھر بس چلتی رہی۔ دن کو گرمی کی وجہ سے قانوناً سفر ترک کیا۔ لیکن عصر کے قریب روانہ ہو کر جدہ سے گزرتے ہوئے ہم سب لوگ وسطِ شب میں مکہ معظمہ پہنچ گئے اور وہاں قریب ایک ماہ کے قیام کے بعد ۱۹ اگست کو عرفات میں حج ادا کیا۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ۔

دوسرا طویل سفر ہندوستان کا ہوا۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں حضرت شاہ صاحبؒ کے لئے ہندوستان کا ویزا بنوا کر میں خیر پور ٹامے والی پہنچا۔ وہاں سیلاب آیا ہوا تھا اور حضرت شاہ صاحبؒ اور بہت سے لوگ ساوی مسجد کے قریب جو اونچائی پر واقع ہے ٹھہرے ہوئے تھے۔ سیلاب کم نہ ہوتا تھا۔ میں نے چاہا کہ واپس کراچی چلا جاؤں لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ تمہاری وجہ سے مجھے تقویت ہے اس لئے یہیں رہو۔ چنانچہ میں دس دن تک وہاں رہا۔ ایک دن اشراق کے بعد بلا کسی تمہید کے بعد میں کراچی آ گیا اور اپنا کام کرنے لگا۔ غالباً اپریل ۱۹۵۶ء میں سندھ یونیورسٹی کے رجسٹرار کا خط میرے پاس آیا کہ یہاں کے وائس چانسلر صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ فلاں تاریخ کو آجائیے۔ میں حاضر ہوا تو سلام کے بعد انہوں نے فرمایا کہ ''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی جو آپ یہاں آجائیں۔'' میں نے عرض کیا کہ حاضر ہوں۔ بس یہ میرا انٹرویو تھا۔ اس طرح مئی میں مجھے پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے مقرر فرما دیا لیکن میری گزارش پر مجھے ہندوستان کے سفر سے واپسی پر چارج لینے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ جون ۱۹۵۶ء میں حضرت شاہ صاحبؒ کے لئے اور اپنے لئے دوبارہ ہندوستان کا ویزا حاصل کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ خیر پور ٹامے والی سے کراچی تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ کراچی سے حیدر آباد کو روانگی ہوئی۔ اس وقت قریب ۱۱ بجے رات کو حیدر آباد سے کھوکھراپار کے لئے گاڑی ملتی تھی۔ رات کو ہم لوگوں نے حیدر آباد میں کھانا کھایا

اور کھوکھراپار کے لئے روانہ ہوئے۔ علی الصباح وہاں پہنچے۔ وہاں پاکستانی کسٹم کے معائنے کے بعد منا باؤ اور باڑمیل کے لئے گاڑی ملی۔ وہاں ہندوستان والوں کی طرف سے چیکنگ ہوئی۔ پھر گاڑی آگے بڑھی۔ دوپہر کو بچا ہوا کھانا کھالیا۔ مغرب کے وقت لونی جنکشن پہنچے۔ وہاں رس گلے فروخت ہو رہے تھے۔ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں نے چاہا کہ رس گلے خرید لوں۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے روک دیا کہ ہندو کی بنائی ہوئی چیز نہ کھائیں۔ آخر کار ہم لوگ بھوکے ہی رہے۔

اب گاڑی دوسری پکڑنی تھی۔ اس میں سوار ہو کر رات بھر کے سفر کے بعد صبح کو اجمیر شریف پہنچے۔ بھوک بہت لگی ہوئی تھی لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ پہلے مزار اقدس پر حاضری دیں گے۔ وہاں پہنچ کر حضرت شاہ صاحبؒ نے قریب ڈھائی گھنٹے مراقبہ فرمایا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے طفیل میں مجھے ایسا نظر آیا کہ ان کو حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تحریری اجازت نامہ (خلافتِ چشتیہ) عطا فرمایا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی عادت کے مطابق اس بات کو پوشیدہ رکھا لیکن میں نے دیکھا کہ مراقبے کے بعد وہ بہت خوش تھے۔

اب ہم لوگوں نے ایک مسلمان ہوٹل والے کے یہاں ناشتہ کیا۔ ناشتے کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے دوبارہ مراقبے کے لئے فرمایا اور اس مرتبہ بھی قریب دو گھنٹے تک حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مستفیض ہوئے۔ میں نے مسلمان ہوٹل والے سے راستے کے لئے کچھ کھانا لے لیا۔ اجمیر شریف سے قریب چار بجے سہ پہر کو گاڑی روانہ ہوئی اور نیمچ، جاورہ، رتلام، اندور ہوتی ہوئی کھنڈوہ پہنچی۔ وہاں سے اٹارسی کے لیے گاڑی میں سوار ہوئے اور وہاں سے عصر کے بعد جبل پور کے لئے روانہ ہوئے۔ بھوک کے مارے میرا برا حال تھا کیونکہ قریب ۲۴، ۲۵ گھنٹے پہلے کھانا کھایا تھا اور ہندو سے کھانا نہیں لے سکتے تھے۔ اتفاق سے گاڑی ایک ایسے اسٹیشن پر ٹھہری جہاں آم فروخت ہو رہے تھے۔ میں نے آم خریدے اور دھو کر حضرت شاہ صاحبؒ کو پیش کئے اور خود بھی کھائے۔ تب جان میں جان آئی۔

گاڑی قریب ۱۱ بجے رات کو جبل پور پہنچی۔ اس لئے ہم لوگ شہر نہیں گئے۔ بلکہ وہیں اسٹیشن کے مسافر خانے میں ٹھہر گئے۔ میں تو لیٹتے ہی سو گیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحبؒ حسب معمول جاگتے رہے۔ صبح ہوئی تو ہم لوگ محمد صابر خاں صاحب (جواب

ریاض میں ہیں) کے یہاں محلہ بھان تلیا گئے۔ اسی محلے میں پہلے میرا مکان تھا اور میرے خاندان والے بھی رہتے تھے۔ وہاں میرے تعلق کے لوگ بہ کثرت تھے اس لئے ملنے والوں کا ہجوم لگ گیا۔ حافظ عبدالرحیم صاحب اور ماسٹر عبدالکریم صاحب (جواب قصبہ کالونی، کراچی میں ہیں) اس وقت وہیں تھے۔ انہوں نے بھی بڑی خاطر تواضع کی۔ شام کو میرے بچپن کے دوست حافظ عبدالعزیز صاحب مرحوم اور محمد یوسف صاحب مرحوم نے ہم لوگوں کی دعوت کی۔ وہیں حافظ جمال الدین صاحب مرحوم بھی تشریف لے آئے۔ یہ ایسے استاد تھے جنہوں نے سیکڑوں حافظ تیار کئے تھے اور میرے بچپن ہی سے میرے شفیق دعا گو تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ سے میرے بچپن اور جوانی کے حالات بتاتے رہے۔ عصر کے وقت ہم لوگ تانگے میں بیٹھ کر رانی تالاب والے قبرستان میں فاتحہ پڑھنے گئے تھے۔ وہاں میرے والد صاحب مرحوم کی قبر ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ بھی مراقب رہے۔ پھر وہاں سے اس تالاب کے مشرقی رخ پر جو عیدگاہ ہے وہاں مغرب کی نماز پڑھی۔ وہیں حضرت مفتی برہان الحق صاحب مدظلہ سے بھی ملاقات ہوگئی۔ ان کے بزرگوں کے مزارات پر بھی فاتحہ پڑھی۔ پھر واپس محمد صابر خاں صاحب کے یہاں آکر آرام کیا۔ اس کے دوسرے دن جبل پور سے بس پکڑی۔ بس اسٹینڈ کے قریب ہی وہ بنگلہ ہے جس میں عبدالستار صاحب، عزیز الرحیم صاحب اور حاجی بشیر اللہ صاحب رہتے تھے۔ دور سے وہ بنگلہ حضرت شاہ صاحبؒ کو دکھلایا۔ بس سے ہم لوگ قریب ۳ گھنٹے میں لکھنادون پہنچے۔ جہاں میری اہلیہ کا گھر تھا۔ وہاں چند روز قیام رہا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ وہاں مسجد میں مراقب تھا تو دیکھا کہ محراب کی طرف سے ایک سانپ ہم لوگوں کی طرف آرہا ہے۔ میں گھبرا کر اٹھا تو وہاں کوئی سانپ نہیں تھا لیکن جب گھر پہنچا تو حضرت شاہ صاحبؒ کی چارپائی کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے مار کر باہر پھینکا۔ تو پھینکتے ہی خدا جانے کہاں غائب ہوگیا۔

لکھنادون سے ہم لوگ چھپارہ گئے۔ وہاں میرے آباؤاجداد کبھی رہا کرتے تھے اور انگریزوں سے نبرد آزما ہوا کرتے تھے۔ پھر انجینا گاؤں میں محمد خاں صاحب جاگیردار کے یہاں قیام رہا۔ وہاں سے سیونی پہنچے تو وہاں میری ممانی صاحبہ مرحومہ قبلہ حاجی محمد کشف الدجیٰ خاں صاحب، قبلہ وکیل سردار احمد خاں صاحب وغیرہ نے بہت زیادہ خاطر تواضع کی اور

بلا مبالغہ دور اور قریب کے ہزاروں آدمی حضرت شاہ صاحبؒ سے بیعت ہوئے۔ لوگوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ سیونی میں ان کے قیام تک کے لئے جگہ نہ ملتی تھی۔ اس کثرت کو سی آئی ڈی والوں نے دیکھ کر اسی وقت سے میرا ہندوستان جانا روک دیا۔ بزدل قومیں اسی طرح شک وشبہ میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ سیونی کے موٹر اسٹینڈ کے قریب میرے دادا کے دادا اور ان کے بھائی کے مزارات ہیں جو انگریزوں کے مقابلے میں شہید ہوئے تھے وہاں بھی حضرت شاہ صاحبؒ نے فاتحہ پڑھی۔ سیونی میں آخری مراقبے میں لوگوں کی بڑی کثرت تھی۔ میری زبان سے بے ساختہ یہ شعر نکل گیا۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
مولا ایسی رین کو بھور کبھو نہ ہوئے

لوگوں پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی اور گریہ وزاری شروع ہوگئی۔ بڑی دیر میں خاموشی ہوئی۔ حضرت شاہ صاحبؒ ان لوگوں کے خلوص سے بہت متاثر تھے اور آخر وقت تک وہاں دوبارہ جانے کے مشتاق رہے۔

وکیل سردار احمد خاں صاحب مرحوم کے بھائی مقبول احمد صاحب جو پہلے کمشنر رہ چکے تھے اور اب حکومت میں سکریٹری تھے اپنی کار میں سیونی سے ہم لوگوں کو ناگ پور لے گئے۔ وہاں انہوں نے اپنے بنگلے میں ٹھہرایا اور ایسے ایسے پرتکلف کھانے پیش کئے جن کے کھانے کا طریقہ بھی ہم کو معلوم نہیں تھا۔ پھر پروفیسر سیّد رفیع الدین صاحب کے بنگلے میں قیام رہا۔ ناگ پور کا ویزا تو نہیں تھا لیکن ہم لوگ ۳، ۴ دن وہاں ٹھہرے۔ حضرت بابا تاج الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر بھی حاضری دی۔ پھر ناگ پور سے گرانڈ ٹرنک ایکسپریس سے روانہ ہوئے۔ اٹارسی، بھوپال، گوالیار سے آگرہ تک بہت طویل سفر تھا۔ آگرہ کا ویزا بھی نہیں تھا لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے پہلے آگرہ نہیں دیکھا تھا اس لئے میں نے انہیں تاج محل اور قلعے کی سیر کرائی۔ بھوک لگی ہوئی تھی۔ ایک مسلمان کے ہوٹل سے چائے اور بسکٹ لئے۔ لیکن میں نے بسکٹ جلدی سے کھانے شروع کر دیئے اس خوف سے کہ کہیں حضرت شاہ صاحبؒ یہ نہ فرمادیں کہ وہ بسکٹ شاید ہندو کی بیکری کے ہوں گے۔ آگرہ سے قریب ۱۱ بجے دن کو دہلی کے لیے گاڑی روانہ ہوئی۔ راستے میں بھوک لگی تو ایک اسٹیشن پر آم خرید لئے اور انہیں دھو کر گزارا

کیا۔ دہلی رات کو پہنچے اور وہاں محلہ لال کنواں میں نیوصدر ہوٹل میں قیام کیا۔ دہلی میں کھانے کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی کیونکہ وہاں مسلمانوں کے ہوٹل بہ کثرت ہیں۔ پھر میرے شاگردوں نے بھی دعوت کر دی تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ دہلی میں بہت عرصے تک رہ چکے تھے اس لئے میں ان مقامات میں بھی گیا جہاں حضرت شاہ صاحبؒ جایا کرتے تھے۔ وہ مکان بھی دیکھا جہاں ان کا قیام تھا۔ مولوی تقریظ احمد صاحب مرحوم سے بھی ملاقات کی۔ یہ عالم بھی تھے اور معلم بھیؒ۔ تکیہ والی مسجد میں بھی حاضر ہوئے جہاں مولانا عبدالغفور صاحب علیہ الرحمہ کے بھائی عبدالرشید صاحب کا مزار بھی ہے۔ شہر کے تمام اولیائے کرامؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں حاضر ہوئے تو وہاں کوئی زائر نہیں تھا بڑا افسوس ہوا۔ حالانکہ وہاں پہلے بہ کثرت زائرین ہر وقت موجود رہتے تھے۔ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بزرگوں کے یہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ اور امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی کچھ لوگ تھے حضرت نور محمد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے، حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی اس مرتبہ کچھ لوگ نظر آئے (۱۹۵۳ء میں وہاں کوئی بھی نہیں تھا)۔ لیکن راستے میں ایک شخص ایسا ملا جو غالباً خفیہ پولیس کا تھا۔ اس نے بہت سے سوالات کئے اور ان میں بہت الٹ پھیر کی۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کی دعا سے میں نے اسے ایسے جوابات دیے کہ وہ یہ بھی پتا نہ چلا سکا کہ ہم لوگ پاکستان سے آئے ہوئے ہیں۔ دہلی میں حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ پانی پت آؤ تو بس میں آنا۔ اسٹیشن کے قریب ملے گی۔ اس میں سہولت ہو گی۔ ہم لوگ پھر بس ہی میں پانی پت گئے وہاں پہنچے تو راستے میں ایک ہندو ملا۔ اس نے کہا کہ کل ایک مسلمان یہاں آ گیا تھا تو ہم نے اسے مار ڈالا۔ میں نے کہا کہ تم نے کوئی خاص بات تو نہیں کی ہمارا وقت آ جائے گا تو ہم بھی مار دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد ہم لوگ حضرت محمد سعید قریشی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر قریب ڈھائی گھنٹے مراقب رہے لیکن کوئی سورما ہم لوگوں کو مارنے نہیں آیا۔ پھر ہم لوگ بس میں دہلی آ گئے۔

دہلی میں میری اہلیہ اپنے بھائی کے ساتھ اس ہوٹل میں آ گئیں۔ پھر ہم سب لوگ

سرہند شریف کو روانہ ہوئے۔ اب ہمارے ساتھ ایسے لوگ بھی تھے (خود میری اہلیہ بھی) جن کے پاس سرہند شریف کا ویزا نہیں تھا۔ ہم سب لوگ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کی خدمت میں پہنچے۔ مراقبے سے فارغ ہو کر باہر صحن میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک سکھ پولیس والا ہم سب کے پاسپورٹ دیکھنے کے لئے آیا۔ ہم لوگ اب فکرمند تھے کہ بعض کے پاس وہاں کا ویزا نہیں تھا۔ لیکن حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کی زندہ کرامت اور حضرت شاہ صاحبؒ کی دعا کی یہ شان دیکھی کہ اسے ہم میں سے صرف وہ لوگ نظر آئے جن کے پاس وہاں کا ویزا تھا بس ایسے ہی لوگوں سے اس نے پاسپورٹ لیا اور اندراج کر کے واپس دے گیا۔ یہ عجیب واقعہ ہوا۔ سرہند شریف سے روانہ ہو کر ہم لوگ امرتسر پہنچے۔ وہاں ہندوستان والوں کی طرف سے سامان کا معائنہ ہوا۔ ایک سکھ سی آئی ڈی والے نے حضرت شاہ صاحبؒ سے میرے متعلق تنہائی میں پوچھا کہ یہ کیا پاکستان کے کوئی لیڈر ہیں؟ حضرت شاہ صاحبؒ نے جواب دیا کہ ''اسے تو زور سے بولتے بھی نہیں بنتا۔ یہ کیا لیڈر ہوگا''۔ (حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ واقعہ بعد میں مجھے بتایا)۔ غالباً ہندوستان کی حکومت اپنی بزدلی کی وجہ سے یہاں بھی مجھے شک کی نظر سے دیکھ رہی تھی اور اسی لئے اس نے ہندوستان میں میرا داخلہ بند کر دیا ہے کہ میرے جانے سے وہاں کی حکومت کا فوراً تختہ الٹ جائے گا۔ ہندوستان سے واپسی پر حضرت شاہ صاحبؒ سمہ سٹہ جنکشن پر اتر کر خیرپور ٹامے والی تشریف لے گئے اور میں سیدھا کراچی چلا آیا اور چند روز کے بعد حیدرآباد جا کر سندھ یونیورسٹی میں ۱۴ جولائی ۱۹۵۶ء کو چارج لے لیا۔

قریب ڈیڑھ سال کے بعد حضرت مولانا عبدالغفور صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ سے کراچی تشریف لائے اور جمعرات ۲۳ جنوری ۱۹۵۸ء (۲ رجب ۱۳۷۷ھ) کو جماعت کے ساتھ غریب خانے میں (حیدرآباد میں) قدم رنجہ فرمایا (اس کے بعد بھی دو مرتبہ ان کی تشریف آوری یہاں ہوئی)۔ دوسرے دن حضرت شاہ صاحبؒ بھی تشریف لے آئے تو جماعت کے سامنے اعلان کرتے ہوئے مولانا صاحبؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ سے فرمایا کہ ''شاہ صاحب جو (چیز) آپ نے غلام مصطفٰی کو دی ہے میں بھی اسے دیتا ہوں۔'' اللہ اللہ۔

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

اب حضرت شاہ صاحبؒ کے مزاج کی چند خصوصیات بھی عرض کر دوں۔ ان کے

مزاج میں اخفائے حال اور نگاہ میں بڑی حیا تھی ۔ آج کل لوگ اپنی بیوی بچوں کا ذکر احباب کے سامنے کرنے میں عار نہیں سمجھتے بلکہ خوش ہو کر بیان کرتے ہیں ۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے کبھی ایسا ذکر نہیں کیا ۔ کسی شخص میں شرع کی رو سے کوئی خامی دیکھتے تھے تو اس سے روبرو کہنے کی بجائے اس شخص کے کسی قریبی تعلق والے سے عمومی طور پر ذکر فرما دیتے تھے ۔ مثلاً میرے ایک خاص کرم فرما کے متعلق (بغیر ان کا نام لئے ہوئے) مجھ سے فرمایا کہ بعض لوگ عجیب ہیں کہ ڈاڑھی تو رکھ لی لیکن انگریزی بال بھی رکھے ہوئے ہیں ۔ ٹخنوں سے نیچے پائنچے دیکھ کر عمومی طور پر ناپسندی کا اظہار فرما دیتے تھے ۔ جماعت والوں کو دیکھتے رہتے تھے کہ کون شخص کس طرح کپڑے یا موزے پہنتا یا اتارتا ہے ، جوتا کون سا پہلے پہنا اور کون سا پہلے اتارا ۔ کھانا کس طرح کھایا ، پانی کس طرح پیا ۔ ایک مرتبہ میں نے پانی کا گلاس صرف داہنے ہاتھ میں لے کر پیا ۔ تو تھوڑی دیر کے بعد عام طریقے پر فرمایا کہ میں نے اپنے علما کو دیکھا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے (داہنا ہاتھ اوپر اور بایاں نیچے) گلاس کو پکڑتے تھے ۔ ایک مرتبہ ایک صاحب کے یہاں اندر جانے کا اتفاق ہوا تو واپسی پر تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگوں سے فرمایا کہ شریعت کیسی پیاری چیز ہے اس نے مٹی سے ہر گندگی کو ڈھانپ دینے کی کیسی عمدہ ہدایت فرمائی ہے ۔ اکثر اوقات بہ کثرت لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور ہر شخص اپنے اپنے لئے دعا کراتا تھا ۔ حضرت شاہ صاحبؒ پھر بار بار دعا کے لیے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے بلکہ خاموشی سے دعا فرماتے جاتے تھے ۔

سنت کے مطابق حضرت شاہ صاحبؒ بہت تیز چلنے کے عادی تھے ۔ ایک مرتبہ صوفی محمد احمد صاحب اور یہ عاجز بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ مسکین پور شریف گیا ۔ شہر سلطان سے بس ملی لیکن اس نے بہت دور اتار دیا غالباً دو میل کا فاصلہ تھا ۔ عصر کا وقت تھا ۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے چلنا شروع کیا اور ہم لوگ پیچھے ہو لئے ۔ وہ چل رہے تھے کہ گویا زمین ان کے قدموں میں سمٹی جا رہی تھی اور ہم لوگ باقاعدہ دوڑ لگا رہے تھے ۔ آخر ہم لوگوں نے ہار مان لی اور راستے ہی میں نماز ادا کی ۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ مسکین پور شریف پہنچ گئے اور وہیں مسجد میں نماز پڑھی ۔ اسی طرح کئی مرتبہ علی پور سے مسکین پور شریف کا راستہ طے ہوا کہ وہ تو ہم لوگوں سے بہت زیادہ آگے تھے اور ہم لوگ راستہ ہی ناپ رہے تھے ۔

حافظے کی یہ شان تھی کہ زندگی کے بے شمار واقعات کی پوری تفصیل یاد تھی اور تبحر علمی

کا عالم یہ تھا کہ بعض مرتبہ عشا کے بعد کوئی مسئلہ چھڑ گیا تو اس کی جزئیات اس قدر تفصیل سے بیان فرمائیں کہ تہجد کا وقت آ گیا پھر تہجد کی نماز شروع ہوگئی اور مراقبے کے بعد فجر کی نماز ادا فرمائی۔

اب ہم اس واقعے کی طرف آتے ہیں جو سب کو پیش آتا ہے۔ حضرت مجددِ الف ثانی قدس سرہٗ کے عرس کے موقع پر جنوری ۱۹۸۰ء میں وہ حیدر آباد تشریف لائے۔ حیدر آباد ان کے قدوم میمنت لزوم کی یہ آخری سعادت تھی۔ یہاں سے واپسی پر کچھ عرصے کے بعد طبیعت کی ناسازی شروع ہوئی۔ پیٹ کی خرابی وغیرہ تو عرصے سے چل رہی تھی۔ اب چہرۂ مبارک اور تمام بدن میں ورم شروع ہوا۔ کراچی میں بہت علاج کیا۔ لیکن حکیم جمشید صاحب کے علاج سے فائدہ ہوا اور دو مرتبہ ورم بھی کم ہوگیا۔ (اس کی تفصیل قبلہ حاجی محمد اعلیٰ صاحب لکھیں گے)

میں نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ حیدر آباد کے کئی ڈاکٹر مل کر حاضر ہونا چاہتے ہیں تاکہ باہمی مشورے سے علاج کریں لیکن ڈاکٹری علاج پسند نہیں فرمایا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ اجازت ہو تو قبلہ مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب مدظلہ کو زحمت دوں کہ وہ ہومیو پیتھک علاج کریں۔ لیکن ایسا علاج بھی پسند نہیں تھا۔ آخر وہ وقت آ گیا جس کے دیکھنے کے لئے ہم لوگ تیار نہیں تھے۔ یعنی ۲۲ رمضان المبارک کو اشراق کے بعد کراچی سے حیدر آباد فون آیا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ہم سب کو یتیم چھوڑ دیا۔ حیدر آباد سے بہ کثرت حضرات روانہ ہوئے۔ کراچی کے حضرات بھی بے شمار تھے۔ عصر کے بعد اس سیاہ کار نے جنتی کفن میں ان کو ملبوس دیکھا۔ بے تاب ہو کر دوڑا اور پیشانی کا بوسہ لیا۔ شہر خموشاں کی طرف روانگی ہوئی۔

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے وقت کسی نے یہ دو شعر کہے تھے جو میں بھی دل ہی دل میں پڑھ رہا تھا:

سرو سیمینا بہ صحرا می روی
سخت بے مہری کہ بے ما می روی
اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

بعض آنکھوں نے دیکھا کہ انوار کی بارش ہو رہی ہے اور رحمت کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ مجھے امیر خسرو کا یہ شعر یاد آیا۔

ابر و باران و من و یار ستادہ بہ وداع
من جدا گریہ کناں، ابر جدا، یار جدا

افسوس کہ ۸۰ سال کا وہ خزینہ جس میں علوم ظاہری و باطنی کا گراں قدر سرمایہ پوشیدہ تھا گوشۂ زمین میں پوشیدہ کر دیا گیا۔ لوگ اپنی محرومی قسمت پر رو رہے تھے۔ لیکن

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

آج وہ کل ہماری باری ہے

لوحِ مزار کے لیے یہ قطعۂ تاریخ عرض کیا ہے:

آہ رفت آں شیخ ما، تسکین قلب وجانِ ما
رہنما و مقتدائے ہر کبیر و ہر صغیر
حافظ و حاجی کہ ہم ورع و تقویٰ داشتہ
باعمل عالم کہ ساعی بود در خیر کثیر
بے مثال اندر علوم فقہ و تفسیر و حدیث
بے ہمال اندر طریقت، در ریاضت بے نظیر
خوش بیان و خوش کلام و خوش مزاج و خوش عمل
از حیائے پاک عثمانؓ نگاہش مستعیر
قطب دیں، عین ولایت، شاہ زوار حسین

۰ ۰ ۴ ۱ ھ

دار جنت بقعۂ او ذالک الفوز الکبیر

۰ ۸ ۹ ۱ ء

سہ شنبہ ۲۲ رمضان المبارک ۵ اگست ۱۹۸۰ء ☆

☆ طریق النعیم۔ ص ۱۱

باب چہارم

اقربا

مولانا عبدالقادر خانؒ

مولانا میرے نانا تھے۔ یہاں ان کے بزرگوں اور عزیزوں کے حالات بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔

شہر کابل (افغانستان) میں قیس (عبدالرشید) بن لیث کا مزار ہے۔ راقم الحروف وہاں حاضر ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پٹھانوں میں پہلے مسلمان وہی تھے۔ پھر ان کی نسل سے پٹھانوں کے بہت سے قبیلے بن گئے۔ افغانستان کے علاقے سے جب وہ لوگ ہندوستان منتقل ہوئے تو انہوں نے یہاں آکر اپنے بعض مقامات کے نام قائم رکھے۔ مثلاً دریا سندھ کو سیحوں کہا (اسی سے سندھ میں سیحون شہر موسوم ہوا جسے اب سیہون کہتے ہیں)۔ اور دریائے گنگا کو جیحون کہا۔ اسی طرح غزنین کے قریب ایک مقام غرغشتی تھا۔ وہاں کے لوگوں نے یہاں کیمبل پور کے قریب ایک سرسبز مقام کا نام غُرغشتی رکھا۔ ان لوگوں کے سردار اخوند محمد بشارتؒ تھے جن کے صاحبزادے میرے پرنانا مولانا عبدالوہاب خان (عرف محمد موسیٰ خان) تھے۔ یہ لوگ کاکڑ کہلاتے تھے۔ اخوند صاحب نے یہاں آکر درس وتدریس کا کام شروع کیا۔ میرے پرنانا کی شادی یہیں ۱۸۰۵ء کے قریب ہوئی ہوگی۔ ان کے ایک صاحبزادے عبدالعزیز خان تھے جو بچپن ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ دوسرے سعدالدین تھے (غالباً ننھیال کے نام پر یہ نام تھا)۔ اور تیسرے محمد شہباز خان تھے۔ غالباً ۱۸۱۵ء میں اخوند صاحب کا انتقال ہوا۔ (غرغشتی کے قبرستان کے وسط میں ان کا مزار اب بھی موجود ہے)۔ اسی زمانے میں سعدالدینؒ کی دینی تعلیم مکمل ہوئی تو ان کو بعض عزیزوں کے سپرد کرکے میرے پرنانا اپنی والدہ صاحبہ، اہلیہ اور صاحبزادے محمد شہباز خان کو لے کر ٹونک چلے گئے۔ نواب امیر خان ۶ جنوری ۱۸۱۸ء کو وہاں

کے والی تسلیم کئے گئے۔نواب صاحب میرے پرنانا کے بہت معتقد تھے لیکن وہ غالباً حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء) سے بیعت تھے (مکاتیب شاہ غلام علیؒ کے مکتوب ۲۲ میں ذکر ہے کہ شاہ صاحب نے نواب صاحب کا وظیفہ قبول کرنے سے انکار کردیا تھا جو وہ خانقاہ کے لئے دینا چاہتے تھے)۔میرے پرنانا، نواب امیر خان (م ۱۸۳۴ء) سے تعلقات کے باوجود، ٹونک سے منتقل ہوکر جاورہ چلے گئے۔لیکن بڑے صاحبزادے محمد شہباز خان وہیں رہے اور وہاں کوتوال ہوئے پھر ان کے صاحبزادے حافظ محمد شفاعت خاں بھی وہاں کے کوتوال ہوئے۔

جاورہ میں نواب عبدالغفور خاں (م ۱۸۲۵ء) والی تھے۔ان کے بعد نواب غوث محمد خان والی ہوئے۔پرنانا صاحب کی پہلی اہلیہ (یعنی محمد شہباز خان کی والدہ صاحبہ) ٹونک میں فوت ہوگئی تھیں۔تو پرنانا صاحب نے جاورہ میں ایک سید خاندان سے شادی کرلی جہاں ان کے بڑے صاحبزادے حکیم عبدالکریم خان غالباً ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے اور ان کے چھوٹے بھائی (یعنی میرے نانا) مولانا عبدالقادر خان غالباً ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ان سے چھوٹی ایک بہن زینب بیگم تھیں۔غالباً ۱۸۴۵ء میں میرے نانا کو میرے پرنانا (مولانا عبدالوہاب خان) اپنے ساتھ لے کر کٹنی، پھر جبل پور چلے گئے۔(۱) انہوں نے وہاں بھی درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔جبل پور میں رانی تالاب کے شمالی مشرقی کنارے کے باہر مشہور چشتیہ بزرگ آغا محمد صاحبؒ کا مزار ہے۔یہ بزرگ میرے پرنانا کے شاگرد تھے۔ ۱۸۶۷ء سے کچھ پہلے میرے پرنانا صاحب کا انتقال ہوا۔رانی تالاب کے مغربی کنارے پر ایک عیدگاہ ہے (جہاں اب اہلِ حدیث حضرات عیدین کی نماز پڑھتے ہیں)۔اس کی شمالی فصیل کے باہر قریب ۲۰ قدم پر میرے پرنانا صاحب کی کچی قبر ہے۔جاورہ میں ۱۸۶۹ء میں ان کی اہلیہ صاحبہ (یعنی میری پرنانی صاحبہ) کا انتقال ہوا اور ۱۸۸۱ء میں میرے پرنانا کی والدہ صاحبہ (یعنی اخوند محمد بشارتؒ کی اہلیہ صاحبہ) کا انتقال کیا۔

میرے نانا صاحب نے اپنے والد صاحب سے عربی فارسی پڑھی تھی اور ایک بیش قیمت ذخیرۂ کتب، ورثے میں پایا تھا۔نانا صاحب ۱۸۹۲ء تک جبل پور میں رہے۔پھر کٹنی میں

۱۔میری کتاب تاریخ اسلاف، ص ۵۶ پر اس کی تفصیل ہے۔

مستقل قیام کیا اور وہیں پنج شنبہ ۲۹ صفر ۱۳۱۸ھ (۲۸ جون ۱۹۰۰ء) کو انتقال کیا۔ آپ واصل باقی نویس تھے اور مفت علاج کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بے لوث خدمت کی وجہ سے ان کے ہاتھ میں شفا بخشی تھی۔ بہت صابر و شاکر تھے۔ کھانے اور غلے کی بہت قدر کرتے تھے۔ سڑک پر روٹی یا غلہ پڑا ہوتا تھا تو اٹھا کر مویشیوں کو دیدیتے تھے۔ بڑے خوش الحان تھے۔ قرآن پاک اور نعتیں پڑھتے تھے تو لوگوں پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مجذوب آپ سے ملنے آئے تو آپ نے اپنی فارسی نعت سنائی جس کا مطلع یہ ہے:

اے وصفِ تو شمس الضحیٰ مشتاقِ دیدارِ توام
وے کشفِ تو بدرالدجیٰ مشتاقِ دیدارِ توام

مجذوب صاحب اس نعت کو سن کر لوٹ پوٹ ہو گئے اور بڑی دیر میں ان کی طبیعت قابو میں آئی۔

نانا صاحب بہت خوش اخلاق تھے۔ ہندو مسلمان سب ہی ان کے گرویدہ تھے۔ ہندوؤں میں کالکا پرشاد اور بالا پرشاد دو بھائی بڑے افسر تھے۔ وہ عمر بھر آپ کے معتقد اور مداح رہے۔ ان کے خط میرے پاس محفوظ ہیں۔

نانا صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادے عبدالعزیز خان صاحب ۱۸۹۳ء میں شہید ہو گئے تھے اس وقت سے نانا صاحب عموماً گوشہ نشین رہے۔

آپ نے فارسی، اردو اور ہندی میں کئی نعتیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ہندی کی ایک حمد بڑی پر کیف ہے:

ترپت ہے جیا پیا درشن کو کبھو آ کے دکھا جانین میں
تو اپنے ملن کا بھید پیا بھلا کچھ تو بتا جا بتین میں
ایک دن بیتے ہے ایک برس اور رین کٹے ہے ترس ترس
نہیں مانے جیا پل چین نہیں اسے دھیر دھرا جا سپنن میں
کیوں ادھر ادھر بہلاوت ہے اور ڈگر ڈگر بھٹکاوت ہے
گیل اپنی تو آون جاون میں مجھے اب تو بتا جا چنین میں
تو ملا جلا بھی ہے سب سے اور جدا جدا بھی ہے سب سے

سب ساتھ رہے اور ہاتھ نہ آوے دیکھوں سب جا اینن میں
جب من میں تو اور تجھ میں من، پھر جائے یہ کس سے جاپ چپن
دین رین رہے تیرا سمرن، جی آئے جائے جپنن میں
سب سادھو سنت فقیر تجھے، سب جگ میں ڈھونڈت پھرتے ہیں
اور تو من میں دیکھے یہ تماشا بیٹھ رہا جاچنین میں
اس پیتم پیارے سے اپنے کربنتی قادر ایسی تو
بس کرپا کر کے تن من میں آجا تو سما جا نینن میں

نانا صاحب کو اپنی اولاد میں میری والدہ صاحبہ اور ان کے بچوں سے بہت زیادہ محبت تھی۔ میرے بڑے بھائی نذیر احمد خاں صاحب سوا سال کے تھے جب نانا صاحب کا انتقال ہوا ان کو اکثر وہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ راقم الحروف ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا۔ جب میں قریب دس سال کا تھا (یعنی نانا صاحب کے انتقال کے بارہ سال بعد پیدا ہوا تھا) تو نانا خواب میں تشریف لائے۔ فرمایا کہ تم میرے نواسے ہو۔ تم ہر روز نہار منہ زعفران کی ۴۔۵ پتیاں کھا کر تھوڑی سی شکر کھالیا کرو۔ مجھے یہ تو نہیں بتایا کہ کس مقصد کے لئے ہے۔ لیکن اس کے استعمال سے میرا حافظہ بہت تیز ہوگیا اور میں پرائمری کے امتحان میں پورے شہر میں اول آیا اور مجھے چار سال تک چار روپے ماہانہ وظیفہ ملتا رہا۔ پھر جب علی گڑھ گیا تو وہاں بھی مجھے نمایاں کامیابی حاصل رہی۔ اسی طرح ایک مرتبہ جب میں کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراوتی (برار) میں پڑھتا تھا تو قریب تین ماہ تک مجھے مسلسل پیچش کی شکایت رہی اور میں بہت کمزور ہو گیا تھا، تو نانا صاحب خواب میں تشریف لائے اور فرمایا کہ آج تم شکر قند کھالو۔ میں بازار گیا اور شکر قند لایا۔ تو ایک ہی مرتبہ کھانے سے وہ تکلیف فوراً ختم ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ میرے نانا صاحب پر لاکھوں رحمتیں ہر وقت نازل فرماتا رہے۔

آمین۔ ثم آمین۔☆

☆ طوبیٰ الہم۔ ص ۶۰

میرے والدین

تاریخ اسلاف (۱۳۸۳ھ) میں ددھیال اور ننھیال کے عزیزوں کے حالات لکھ چکا ہوں۔ پردادا امیر موسیٰ خان نے انگریزوں سے جنگ میں چیف کمشنر I Stephne کو سیونی (سی۔پی) میں ۱۷ اگست ۱۸۲۷ء کو قتل کیا، خود بھی تلوار کا نشانہ بنے (کہ کندھے سے پیٹ تک ضرب آئی)۔ والد اور چچا وہیں شہید ہوئے۔ پھر پردادا اپنے بھائیوں کے ساتھ جبل پور کے قریب دس میل شمال میں قصبہ پناگر کو منتقل ہو گئے۔

میرے دادا وزیر خان غالباً ۳۰ سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی حافظ موسیٰ خان بھی نوجوانی میں فوت ہوئے۔ اس لئے پورے خاندان کی ذمے داری پردادا کے حصہ میں آئی۔ انہوں نے میرے والد کی شادی (غالباً ۲۰ سال کی عمر میں) ۱۸۹۵ء میں کردی تھی۔

میرے والد گلاب خان کے دو بھائی اکبر خان اور غازی خان (تراب خان) تھے۔ والد صاحب بہت خوب صورت تھے۔ لمبی ناک، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں کہ جب سوتے تھے تو پپوٹوں سے آنکھیں کھلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ چہرہ گلاب کا پھول نظر آتا تھا۔ اس لئے ان کی والدہ نے ان کا نام گلاب خان رکھا تھا۔ بہت ذہین اور سلیقہ مند تھے۔ پناگر چھوٹا سا قصبہ تھا۔ وہاں صرف ایک اسکول تھا اور وہ بھی ہندی کا تھا۔ والد صاحب نے وہاں سے پرائمری کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کر کے جبل پور کے ٹیچرز نارمل اسکول میں سب سے نمایاں کامیابی حاصل کی اور انعامات بھی حاصل کئے۔ لیکن اسکول ٹیچر بننے کے بجائے بعض حضرات کے مشورے سے ریلوے پولیس میں حوالدار ہو گئے۔ اپنے کام میں بہت کامیاب اور سخت کوش تھے تو بعض حاسدوں نے مختلف حربے مخالفت میں استعمال کئے تو آپ نے استعفا

دیا اور اسکول میں مدرس ہو گئے۔ آپ اردو اور ہندی میں بہت خوش خط تھے۔ نقشے اور خاکے بہت نفاست کے ساتھ بناتے تھے۔ میرے پردادا ۱۸۹۸ء میں فوت ہوئے تو میرے والد صاحب مستقل طور پر جبل پور میں قیام پذیر ہو گئے۔ پردادا کی جائیداد بہت تھی۔ ایک بہت بڑا کھیت تھا جس میں ایک سو بوریاں گندم کی بوئی جاتی تھیں۔ ایک باغ آموں کا تھا۔ دو زمینیں تھیں۔ مکان تھا۔ والد صاحب نے یہ سب جائیداد اپنے عزیزوں کو بہ خوشی بخش دی۔

والد صاحب سخاوت میں بہت پیش پیش تھے۔ عزیزوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ان کے گھر جب بھی جاتے تو بچوں کے ہاتھ میں ایک روپیہ رکھ دیتے تھے (اس زمانے میں ایک روپیہ بہت قیمتی تھا)۔ میرے بڑے بھائی نذیر احمد خان کو تعلیم دلوائی جب وہ نویں جماعت میں تھے تو والد صاحب بہت بیمار ہو گئے۔ مجبوراً ان کی تعلیم روک دی گئی۔ اور ان کو سیونی میں پوسٹ آفس کی کلرکی کرنا پڑی۔ یہ ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت تیس روپے ان کی تنخواہ تھی۔ پندرہ روپے اپنے پاس رکھتے تھے اور پندرہ روپے گھر بھیجتے تھے۔ پھر دوسرے سال ان کا تبادلہ کٹنی کو ہو گیا۔

والد صاحب نے اپنی جمع کردہ رقم میں سے ایک سو دس روپے میں ایک وسیع مکان جبل پور میں خریدا اور پھر اسکول میں مدرس ہو گئے۔ اسی زمانے میں ایک مرتبہ سردی کے موسم میں والد صاحب مجھے بازار لے گئے تو وہاں پہلی جنگِ عظیم کے سپاہیوں کے پرانے کوٹ فروخت ہو رہے تھے۔ درزیوں نے پرانے کوٹ سے بچوں کے لائق بھی کوٹ تیار کر لیے تھے۔ والد صاحب کے ایک دوست نے کہا کہ آپ کا بچہ سردی میں ٹھٹھر رہا ہے۔ اس کیلئے ایک کوٹ خرید لیجئے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ مجھے اس کا ٹھٹھرنا پسند ہے لیکن غیر کا اترا ہوا کپڑا پسند نہیں۔ ہاں اگر کسی بزرگ کا اتارا ہوا کپڑا ہو تو وہ پہن سکتا ہے۔

پرائمری کے امتحان میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے پورے شہر میں میرے نمبر سب سے زیادہ تھے تو مجھے چار سال تک چار روپے ماہوار بہ طور وظیفہ دیے گئے۔ والد صاحب نے اس وظیفے کی رقم سے ساٹھ روپے میں ایک اور مکان خرید لیا جو پہلے مکان سے ملحق تھا۔ پھر دونوں مکانوں کو ایک کر لیا۔ اس میں پانچ کمرے اور دو صحن بن گئے۔ بڑے بھائی صاحب نے اور ہم لوگوں نے مل کر وہاں ایک کنواں کھود لیا۔ اس کا پانی بہت صاف اور شیریں تھا۔ پورا کنواں

صرف دس ہاتھ گہرا تھا۔

والد صاحب نے ریلوے کی ملازمت کے زمانے میں کلکتے کا سفر کیا تھا۔ غالباً تھانہ بھون بھی گئے تھے۔ مولانا اشرف علیؒ نے ایک جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔

والد صاحب خوش خلق اور خوش مزاج تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بڑے ماموں مولوی عبدالمجید خان اپنے چھوٹے بھائی عبدالجمیل خان پر ناراض ہو رہے تھے۔ والد صاحب نے بڑے ماموں سے کہا کہ مولانا صاحب کھڑے کھڑے وعظ نہ فرمائیں۔ تخت پر بیٹھ کر اطمینان سے وعظ فرمائیں۔ پھر تو سب لوگ ہنسنے لگے اور ماموں صاحب کا غصہ ختم ہو گیا۔

والد صاحب نے اپنی آخری بیماری کے زمانے میں ایک دن مجھے اپنے پاس بٹھا کر نماز کا طریقہ سمجھایا، دعائیں یاد کرائیں اور استقامت کے لئے دعا بھی فرمائی۔ اس سے پہلے جب میں قریب پانچ سال کا تھا تو بڑے بھائی صاحب نے مجھے پہلے پارے کے چند رکوع خوب سمجھا کر پڑھا دیے تھے۔ پھر میں خود ہی ہر روز ایک پاؤ پارہ پڑھ لیتا تھا۔ جب میرا ناظرہ مکمل ہوا تو والد صاحب نے فرمایا کہ بیٹا میرا قرآن پاک سن لیا کرو اور اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اصلاح کر دیا کرو۔ میں سمجھا کہ میں والد صاحب کا استاد بن گیا ہوں۔ اس طرح پورے قرآن میں انہوں نے میری غلطیوں کی اصلاح فرما دی۔ پھر والدہ صاحبہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور میرا ناظرہ صحیح کرا دیا۔

والد صاحب سہ شنبہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ (۲۳ جولائی ۱۹۲۴ء) کو جبل پور میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ مجھ پر ان کی شفقت سب اولاد سے زیادہ تھی۔ انتقال سے چند روز پہلے وہ مجھ پر اس غرض سے ناراض ہوئے کہ میں انہیں زیادہ یاد نہ کروں۔ یہ بات انہوں نے والدہ صاحبہ کو بتا دی تھی۔ لیکن کون ہے جو اپنے ماں باپ کی جدائی پر روتا نہ ہو۔ میں تو اب بھی روتا ہوں کہ بزرگانہ شفقتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔ جبل پور میں جب تک قیام رہا ہر جمعہ کو ایصالِ ثواب کے لئے والد صاحب اور عزیزوں کے مزارات پر حاضری دینے کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔ افسوس کہ اب اس سعادت سے بھی محروم ہوں۔

اے آرزوئے دیدۂ بینا چگونہ
ما بے تو در غمیم تو بے ما چگونہ

۱۹۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ہوئی تو والد صاحب خواب میں تشریف لائے۔فوجی لباس میں تھے۔میں نے عرض کیا کہ بابا جان آپ کو فوجی لباس سے کیا تعلق ہے؟ فرمانے لگے کہ'' کچھ کام تھا''۔کام نہیں بتایا لیکن اندازہ ہوا کہ وہ (بحمد للہ) اللہ تعالٰی کی فوج میں شامل کر لئے گئے ہیں۔اور وہ یہاں حیدرآباد (سندھ) میں مسلمانوں کی خدمت کے لیے بھیجے تھے۔

میری والدہ محفوظ النساء حضرت مولانا عبدالقادر خان ٹونکی ثم جبل پوری (م۱۹۰۰ء) کی بہت چہیتی بیٹی تھیں۔بہت ذہین اور معاملہ فہم تھیں۔سخت عسرت کے زمانے میں کسی سے امداد کے لئے اشارہ بھی نہیں کیا۔ان کے بڑے بھائی قریب ہی رہتے تھے لیکن ان کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ ہم لوگ ضرورت مند ہیں۔چولہے پر دیگچی چڑھا دیتی تھیں تاکہ لوگ سمجھیں کھانا پک رہا ہے۔حالانکہ اس میں کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔اور خود فاقہ کر لیتی تھیں۔خوددار اس قدر تھیں کہ ضرورت کے وقت کسی سے برتن تو کیا، پانی بھی نہ مانگتی تھیں۔اگر کبھی مہمانوں کے لئے کچھ زیادہ پکانا پڑتا تو ایک ہی قسم کا کھانا دو برتنوں میں پکا لیتی تھیں۔اگر فرش کی ضرورت ہوتی تو دو چادریں بچھا لیتی تھیں لیکن کسی سے اپنی حاجت کا اشارہ کرنا بھی معیوب سمجھتی تھیں۔اکثر کہا کرتی تھیں کہ تنگ کھاؤ منگ نہ کھاؤ۔میری تربیت میری ہمت افزائی سے کرتی تھیں۔مجھے سنا سنا کر عورتوں سے کہتی تھیں کہ'' میرا بچہ بڑا فرماں بردار ہے!اور اسے پڑھنے کا اس قدر شوق ہے کہ کھانے تک کی پروا نہیں کرتا۔اور ابھی سے نماز اور قرآن پاک کی تلاوت کی پابندی کرتا ہے۔''

ایسے جملوں سے مجھے اپنی اصلاح کا شوق پیدا ہوتا تھا اور تعلیم کے لئے رغبت پیدا ہوتی تھی۔

میرے بچپن میں ماہ رمضان سخت گرمی کے موسم میں واقع ہوتا تھا۔والدہ صاحبہ مجھے روزہ رکھنے کا شوق دلانے کے لئے فرماتی تھیں کہ'' سحری آتی ہے تو عمدہ کھانے ساتھ لاتی ہے۔کباب، پراٹھے، مٹھائی وغیرہ لاتی ہے۔جو بچے جاگ جاتے ہیں انہیں یہ سب کھانے مل جاتے ہیں اور جو نہیں جاگتے وہ محروم رہ جاتے ہیں۔'' میں سمجھتا تھا کہ سحری کوئی عورت ہے جو رمضان شریف میں اچھے اچھے کھانے تقسیم کرتی ہے۔پھر میں والدہ سے کہتا کہ اماں مجھے ضرور جگا دینا۔میں بھی روزہ رکھوں گا۔چنانچہ والدہ صاحبہ جب حسب حیثیت کھانے تیار کر لیتی تھیں

تو مجھے جگا دیتی تھیں کہ اٹھ جاؤ، دیکھو سحری کیا کیا کھانے دے گئی ہے! نصف شعبان کی رات کی بیداری کے لئے بھی اسی طرح ایک ترکیب یہ تھی کہ دیکھو اس رات کو اللہ تعالیٰ ایک درخت ایسا لگا دیتا ہے جس کی ہر پتی میں ہر شخص کا نام (سلامتی کے لیے) لکھوا دیتا ہے۔ جو بچے جاگتے ہیں ان کو سلامتی حاصل ہوتی ہے اور جو نہیں جاگتے ان کے نام کا پتا کاٹ دیا جاتا ہے (شاید اسی طرح محاورہ بھی ہے اور ایک روایت بھی مشہور ہے میرے بچپن میں (قریب ۱۰۔۱۱ سال کی عمر میں) جبل پور میں طاعون کا زور تھا۔ ہر روز قریب ایک سو افراد فوت ہو جاتے تھے۔ شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ لوگ اپنے مکان چھوڑ کر جنگل میں جھونپڑیاں بنا کر رہنے لگے تھے۔ والدہ صاحبہ کا حکم تھا کہ ہرگز خوف مت کرو اور حتی الامکان ہر مسلمان کے جنازے کے ساتھ قبرستان جایا کرو اور ہر مسلمان مرحوم کے لئے (خواہ اخبار میں کسی کے انتقال کی خبر ہو) سورۃ الفاتحہ اور کم از کم تین مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ کر بخش دیا کرو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے بڑی ہمت عطا فرمائی اور ایصالِ ثواب کرنے کا جذبہ مرحمت فرمایا۔

ماں کی شفقت اولاد پر بہت ہوتی ہے۔ کوئی اچھی چیز تھوڑی ہوتی تو فرماتی تھیں کہ "تم کھالو، میرے پیٹ میں پہنچ جائے گی" کبھی غصہ آجاتا تو فرماتیں "تیرا گھر دھوپ میں بناؤں، اوپر سے پانی برساؤں"۔ اللہ اللہ، غصہ بھی رحمت تھا۔

ہم لوگوں کے لئے دعا اس طرح مانگتی تھیں کہ "اے اللہ ان لوگوں کے لئے تیرے در کی بھیک مانگتی ہوں اور تیرے پیاروں کا صدقہ مانگتی ہوں۔" میں نے ان کی ایسی دعا کو کبھی رد ہوتے نہیں دیکھا۔

میرے ایک عزیز جو ساتھ رہتے تھے محلے بھر کے لوگوں کو پریشان کیا کرتے تھے، کوئی جا رہا ہوتا تو اس کو پیچھے سے آکر دھکیل دیتے۔ کسی کے سر پر سامان ہوتا تو اس کا بوجھ ہلکا کر دیتے۔ درخت پر چڑھ جاتے اور آنے جانے والوں پر تھوک دیتے۔ ایسی شرارتوں سے لوگ تنگ آگئے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ گھر پر آئے اور کہا "اماں، اس لڑکے نے ہم سب کو ستا رکھا ہے۔" والدہ نے صرف ایک جملہ فرمایا کہ "لے جاؤ اس کو اور خوب مارو" اس جملے سے ان لوگوں کو تسلی ہوگئی اور یہ عزیز ڈر گئے کہ اگر اب شرارت کی تو وہ لوگ پٹائی کریں گے۔

والدہ صاحبہ بڑی ہمت اور حوصلے والی تھیں۔ ایک مرتبہ وہ گھر میں تھیں۔ رات

کو چوروں نے حملہ کرنا چاہا۔ اور دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔ والدہ نے زور سے فرمایا کہ ''کھڑے رہو اگر مرد کے بچے ہو۔ میں دروازہ کھولتی ہوں۔'' چنانچہ والدہ نے دروازہ کھولا اور تلوار لے کر آگے بڑھیں تو وہ سب بھاگ گئے۔

جبل پور کے مکان کے قریب ہی ایک ہندو کا مکان تھا۔ اس نے کچھ شرارت کی اور ہم لوگوں کو پریشان کیا، والدہ نے اس سے کہا کہ ٹھیک ہو جا، ورنہ تجھے تیرے گھر میں گھس کر ماروں گی۔'' اسی طرح کے کئی واقعات پیش آئے جن کی تفصیل کیا عرض کروں۔ والدہ صاحبہ کے انتقال پر ایک بزرگ میرے پاس آئے اور فرمایا:

> میاں، اب تک تو والدہ کی دعاؤں سے خوب عیش کیا ہے۔ لیکن اب محتاط زندگی گزارنا۔ کیونکہ اب وہ زندہ نہیں رہیں اور اب ان کی دعائیں تمہارے لے سپر نہیں بن سکتیں۔☆

☆ انعمت علیہم۔ ص ۵۰

حاجی نذیر احمد خان

میرے بڑے بھائی نذیر احمد خان صاحب مقام کٹنی (ضلع جبل پور) میں پنج شنبہ ۹ مارچ ۱۸۹۹ء (۲۷ شوال ۱۳۱۶ھ) ۶ بجے شام پیدا ہوئے۔ نانا صاحب (مولانا عبدالقادر خان صاحبؒ) نے کانوں میں اذان دی اور دعا فرمائی۔ شروع ہی سے بفضلہٖ تعالیٰ دینی ماحول حاصل رہا۔ قریب ۵ سال کی عمر سے قرآن پاک کی تلاوت اور نماز نصیب رہی۔ پھر جبل پور آ گئے اور وہاں انجمن اسلامیہ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ دسویں جماعت میں ۱۹۱۶ء میں تھے کہ والد صاحب سخت بیمار ہوئے۔ اس لئے مجبوراً تعلیم چھوڑ دی اور ملازمت کے لئے کوشش کی۔ سیونی میں ڈاک خانے میں کلرک ہوئے۔ اس زمانے میں صرف تین روپیہ تنخواہ تھی۔ ۱۵ روپے اپنے لئے رکھتے تھے اور ۱۵ روپے گھر بھیجتے تھے۔ اس قلیل رقم میں بھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل سے بڑی برکت دیتا تھا اور سب کا گزارہ ہو جاتا تھا۔ منجھلے بھائی عبدالرحمٰن خان صاحب کی تعلیم بھی اسی چھوٹی سی رقم سے ہو جاتی تھی۔ پھر بڑے بھائی صاحب کا تبادلہ سیونی سے کٹنی کو ہوا۔ اور وہاں سے کچھ عرصے کے بعد جبل پور کو ہوا۔ والد صاحب کی طبیعت سنبھل گئی تو وہ وہاں ایک اسکول میں ماسٹر ہو گئے۔ راقم الحروف کی ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ والد صاحب نے جبل پور کے محلہ بھان تلیا میں ایک مکان ۱۹۱۹ء میں ایک سو دس روپے میں خرید لیا جو بہت کشادہ تھا۔ دونوں بھائیوں کی شادیاں دو مختلف خاندانوں میں ہوئیں۔ بڑے بھائی صاحب کی شادی ولی محمد صاحب کے یہاں اور منجھلے بھائی صاحب کی شادی عبدالکریم صاحب کے یہاں ہوئی لیکن میری دونوں بھاوجیں جلد فوت ہو گئیں۔ پھر دونوں بھائیوں کی شادی نذیر الدین خان صاحب کے یہاں ہوئی۔ یہ اپنے عزیزوں میں سے تھے اور

بہت شائستہ تھے۔ اس لئے بحمد اللہ بہت خوشگوار تعلقات رہے۔ والد صاحب ۲۳ جولائی ۱۹۲۴ء (سہ شنبہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ) کو وفات پا گئے تو صرف بڑے بھائی صاحب نے گھر کی کفالت فرمائی اور مجھے تعلیم دلوائی۔ جب ۱۹۲۸ء میں نویں جماعت میں مجھے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تو انہوں نے مجھے علی گڑھ بھیج دیا۔ اس وقت ان کی تنخواہ صرف ساٹھ روپے تھی جس میں سے نصف مجھے بھیج دیتے تھے اور نصف میں پورے گھر کا گزارہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ان کو خط لکھا کہ میرے بعض اساتذہ مجھ پر بڑی شفقت فرماتے ہیں۔ میں اگر فیس کی معافی کے لئے درخواست دوں تو امید ہے یہ اساتذہ میری فیس معاف کرادیں گے۔ بھائی صاحب نے جواب دیا کہ ہرگز درخواست مت دینا۔ ممکن ہے کہ کوئی طالب علم تم سے زیادہ مستحق ہو اور اس کا حق مارا جائے۔ سبحان اللہ، کس قدر تقویٰ تھا۔ پھر ایثار کا جذبہ یہ تھا کہ میرے لئے کپڑے بنوادیتے تھے اور جب میں تعطیل کے زمانے میں علی گڑھ سے آتا تھا تو میرے کپڑے اپنے لئے مجھ سے لے لیتے تھے اور دوسرے کپڑے میرے لئے بنوادیتے تھے۔ اور یہ طریقہ میری پوری تعلیم تک قائم رہا۔

کم تنخواہ کے باوجود ان کو حج کا بہت شوق تھا۔ اس زمانے میں بحری سفر والا حج قریب پانچ سو روپے میں ہوجاتا تھا۔ بھائی صاحب شہر کے کسی علاقے میں بھی چھوٹا سا مکان ڈھائی تین سو روپے میں خرید کر اور کچھ مرمت کرا کرا سے فروخت کردیتے تھے اور اس طرح حج کا خرچ نکل آتا تھا۔ اس طرح انہوں نے پانچ حج کئے اور دو مرتبہ والدہ صاحبہ اور بھاوج صاحبہ کو بھی حج کرایا۔ ایک مرتبہ بہن اور بھانجے کو بھی حج کرایا۔ حج کے شوق کی وجہ سے بھائی صاحب نے عربی میں بڑی مہارت پیدا کرلی تھی اور بلا تکلف عربی بولتے تھے۔ فارسی، ہندی، سنسکرت، گجراتی، بنگالی، پنجابی، پشتو، سندھی بھی اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ انگریزی بہت صحیح لکھتے تھے اور بہت روانی کے ساتھ لکھتے تھے، اردو کا خط بہت پاکیزہ تھا۔ تصوف سے بھی لگاؤ تھا اور والدین کی طرح وہ بھی چشتیہ صابریہ سلسلے میں داخل تھے جس میں مزامیر نہیں تھے۔

بھائی صاحب کی مجھ پر شفقت بہت تھی۔ پھر میرے بچوں پر بھی بے حد شفقت فرماتے تھے۔ ہاجرہ اور سراج احمد اکثر و بیشتر انہی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کی وجہ سے انہوں نے جبل پور سے اپنا تبادلہ کراچی کو کرالیا تھا اور وہ اپنے ساتھ میرے

ان دونوں بچوں کو بھی کراچی لے آئے تھے۔ کراچی کے صدر ڈاک خانے میں پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ لوگوں نے ان سے بارہا کہا کہ ہندوؤں کے مکانات جو خالی پڑے ہوئے ہیں ان میں سے آپ ایک مکان آسانی سے الاٹ کرا سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا کرنا میں تقوے کے خلاف سمجھتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے محلہ چاکی واڑہ میں ایک چھوٹی سی زمین خریدی اور اس میں دو کمرے بنوا کر رہنے لگے۔ بعد میں منجھلے بھائی صاحب اور راقم الحروف بھی کراچی آ گیا اور دوسرے مکان میں پھر ہم سب لوگ منتقل ہو گئے۔

میری پہلی اہلیہ ۲۸ نومبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں فوت ہو گئیں۔ میری دوسری شادی ۳۰ اگست ۱۹۴۹ء کو ہوئی۔ اور اس شادی سے میری پہلی بچی سعدیہ ۲۰ اپریل ۱۹۶۴ء کو پیدا ہوئی۔ اس کی والدہ کو خواب میں بڑے بھائی صاحب نے فرمایا ''افسوس کہ میں دنیا میں نہیں ہوں، ورنہ سعدیہ کے لئے بھی کیا کچھ نہ کرتا۔'' اللہ تعالیٰ کی مرضی کہ بڑے بھائی صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ میری ہی اولاد کو اپنی اولاد سمجھتے تھے۔

بڑے بھائی صاحب کا ایک بڑا احسان مجھ پر یہ بھی ہے کہ وہ بچپن سے مجھے تین بجے رات کو اٹھا دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''بس اس وقت پڑھ لو' پھر دن بھر کھیلتے رہنا۔'' بچپن میں اس قدر جلد بیدار ہونا بے شک ناگوار تھا لیکن پھر ہمیشہ اس سے مجھے بے شمار فائدے حاصل ہوئے۔

افسوس کہ بھائی صاحب کو آخر میں استقا کی بیماری ہو گئی تھی ہاجرہ اور سراج احمد ہر وقت ان کی خدمت میں رہے اور اس عاجز نے بھی حتی الامکان علاج کرایا لیکن مشیتِ الٰہی سے وہ دوشنبہ ۹ ذی الحجہ (یوم الحج) ۱۳۷۶ھ (۸ جولائی ۱۹۵۷ء) کو کراچی میں فوت ہو گئے اور تین ہٹی کے قبرستان میں والدہ صاحبہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ انتقال سے چند روز پہلے (فجر کے قریب) میں نے خواب میں والدہ صاحبہ کو دیکھا (۷ اصفر ۱۳۷۶ھ کو فوت ہوئی تھیں)۔ وہ زور زور سے فرما رہی تھیں کہ ''نذیر نہیں آتا۔ ''نذیر نہیں آتا۔'' آواز اس زور کی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی اور میں سمجھ گیا کہ وہ بھائی صاحب کو اپنے پاس بلا رہی ہیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

والدہ صاحبہ کے انتقال پر لوحِ مزار کے لئے یہ اشعار لکھے تھے:

والدہ الحاجہ محفوظ النساء صاحبہ

۶ ۷ ۳ ۱ھ

اُم بندہ حیف محفوظ النساء

۶ ۷ ۳ ۱ ھ

ہمدمِ بے حالی مغموم رفت

۶ ۵ ۹ ۱ ء

حج، زیارت ہم عبادت روئے داد

۶ ۷ ۳ ۱ ھ

سربسر حق آشنا مرحوم رفت

۶ ۵ ۹ ۱ ء

دُر فشاں سرچشمۂ الطاف بود

۶ ۷ ۳ ۱ ھ

آنکہ از فضل الٰہ معصوم رفت

۶ ۵ ۹ ۱ ء

اور بھائی صاحب کے لوحِ مزار کے لئے یہ اشعار لکھے:

بیادگارِ اکرامِ برادرِ معظم

۷ ۵ ۹ ۱ء

حاجی گرامی نذیر احمد خان (علیہ الرحمۃ المتعالی)

۷ ۵ ۹ ۱ ء

۶ ۷ ۳ ۱ ھ

عالی منصب نذیر احمد خاں

۷ ۵ ۹ ۱ ء

پارسا، متقیِ شاد رواں

۶ ۷ ۳ ۱ ھ

در خصوص محبت والفت

۷ ۵ ۹ ۱ ۰

بے نظیر آمدہ بہ بزم زماں

۶ ۷ ۳ ۱ ھ

بخ ہار او مشرف حج ساخت

۷ ۵ ۹ ۱ ۰

آنکہ بخشد پناہ ہر غدواں

۶ ۷ ۳ ۱ ھ

افسوس کہ سب بزرگوں سے خاندان محروم ہو گیا۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

میری انگریزی کتاب Studies in literature بھائی صاحب ہی کے نام پر معنون ہے۔

میرے منجھلے بھائی عبدالرحمٰن خان بھی بہت عبادت گزار تھے۔ رات کو تین بجے کا الارم لگا کر اٹھتے تھے اور فجر تک مسلسل عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ شب دوشنبہ ۹ جمادی الاول ۱۳۸۳ھ (۲۷ اکتوبر ۱۹۶۳ء) کو قریب ۱۲ بجے انتقال ہوا اور انہی کا لگایا ہوا الارم ۳ بجے رات کو انہیں آواز دیتا رہا۔ لیکن:

خفتۂ مرگ کے شود بیدار؟

خانِ گرامی، جانِ برادر

سالکِ عرفاں، طالبِ غفراں

صابر و شاکر، ذاکر و طاہر

۳ ۶ ۹ ۱ء

خلد مقدر عبدالرحمٰن

۳ ۸ ۳ ۱ھ☆

☆ طوبیٰ الہم۔ ص ۶۵

مقامات قمر

اہلیہ مرحومہ

اہلیہ قمر بیگم کو پیٹ میں کچھ تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ناف ٹل جاتی ہے۔ وہ عورتوں سے ناف ٹھیک کرالیتی تھیں۔ پھر ۱۹۸۷ء کے شروع میں خیال ہوا اور ڈاکٹروں نے کہا کہ گردوں کی تکلیف ہے۔ چنانچہ سب کا مشورہ ہوا کہ کراچی میں ڈاکٹر ادیب رضوی کو دکھلایا جائے۔ انہوں نے دیکھتے ہی کہا کہ اب آئی ہیں جب کہ بالکل خراب حالت ہوچکی ہے۔ انہوں نے تشخیص کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی۔ کئی ڈاکٹروں نے دیکھا بہرحال رضوان ہسپتال (عزیز بھٹی پارک کے قریب) داخل کرادیا۔ وہاں بھی اناڑی قسم کا علاج ہوتا رہا۔ یعنی Drip وغیرہ لگائے یا گلوکوس دیا۔ آخر ان کو واپس حیدرآباد لے آئے۔ یہاں ڈاکٹر علی محمد چودھری نے معائنہ کیا اور فرمایا کہ سب رپورٹیں غلط ہیں۔ انشاء اللہ پانچ دن میں ٹھیک ہوجائیں گی۔ انہوں نے Tarivid کی ٹکیاں کھلائیں اور بفضلہٖ تعالیٰ پانچ دن میں بالکل اچھی ہوگئیں۔ اس کے بعد اسی سال (۱۹۸۷ء میں) صفیہ کی شادی ہوگئی اور بیٹی سعدیہ کی شادی کی اور ۱۹۸۹ء میں دوبارہ حج بھی کیا۔ وہاں صفیہ اور بچہ طیب احمد بھی (آفتاب میاں کے ساتھ) تھا۔ بہت خوش رہیں۔ ۱۹۹۰ء کے اگست تک اچھی رہیں۔ ان کو پھر تکلیف شروع ہوئی لیکن خیال تھا کہ ناف ٹل جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدوس، ڈاکٹر معین الحق انصاری صاحب، پھر ڈاکٹر محمد علی چودھری صاحب کا علاج کرایا۔ انہوں نے پھر اسی Tavivid کے دو کورس دیے۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور حالت گرتی رہی۔ کان بہرے ہوگئے تھے۔ رپورٹ Urea بڑھا ہوا

بتایا جاتا تھا۔ لیکن اس کی علامت یہ ہے کہ پاخانے میں بدبو ہو جاتی ہے۔ ایسی کیفیت انتقال سے صرف تین دن پہلے ہوئی تھی۔ آخر میں حکیم اکرام حسین صاحب کا علاج بھی کیا۔ انتقال سے ایک ہفتہ پہلے Belair Hospital میں بھی داخل کرایا۔ لیکن وہاں کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لئے ایک دن رات کے بعد واپس لے گئے۔ پھر ڈاکٹر سلیم قاضی نے Civil Hospital میں داخل کرایا۔ ۵ دن وہاں رہیں۔ انتقال سے ۲ دن پہلے بھی تھوڑا ہوش تھا۔ کہتی تھیں کہ ناک میں نلکی کیوں لگائی۔ Dialysis کئی مرتبہ کیا۔ لیکن سب بے سود ہوا اور وہی مشیت الٰہی تھی۔ یعنی شب پنج شنبہ ۲۱ رجب ۱۴۱۱ھ کو داغ مفارقت دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ مرحومہ کو قولنج کی تکلیف تھی۔ گردے کی نہیں۔ قولنج میں درد شروع ہوتا ہے اور درد گردہ، کمر میں ایک جگہ معلوم ہوتا ہے اور سانس پورا لینے میں تکلیف ہوتی محسوس کرتی تھیں۔ شب پنج شنبہ ۱۱ بج کر ۲۵ منٹ پر حیدرآباد کے سول ہسپتال میں اہلیہ قمر بیگم کا انتقال ہوا۔

(۲۱ رجب ۱۴۱۱ھ/ ۶ ۔ ۷ فروری ۱۹۹۱ء کی درمیانی شب)

یا صاحب الجمال ویاهادی البشر ۷۷۵

من وجهك المنير لقد نور القمر ۱۲۱۶

+۱۹۹۱ء

اہلیہ مرحومہ (قمر بیگم) کے والد وکیل عبدالحمید خان لکھنادون (سی۔ پی) کے بہت مقبول وکیل تھے۔ پوری بستی میں ہندو مسلمان سب ان کی عزت کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۳۶ء میں وہیں انتقال ہوا۔ قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ کی بہت سی کتابیں چھوڑ کر گئے ہیں۔ وہاں بڑا کشادہ مکان تھا۔ اور کچھ فاصلے پر بہت بڑا باغ اور کھیت تھا۔ باغ کے ساتھ ایک پختہ بنگلہ بھی تھا۔ افسوس کہ وہ سب جائداد ضائع ہو گئی۔

مرحومہ کی والدہ صاحبہ سیونی کے دیوان سجاد علی خان صاحب کی اہلیہ کی بہن تھیں۔ بہت سلیقہ مند تھیں۔ اہلیہ مرحومہ اپنے بڑے بھائی انوار الحق خان سے چھوٹی اور باقی سب بھائیوں، بہنوں میں بڑی تھیں۔ وہ بھی بہت سلیقہ مند تھیں۔ ۱۹۵۶ء میں حضرت شاہ زوار حسین صاحبؒ کے ساتھ یہ عاجز ہندوستان گیا۔ لکھنادون، چھپارہ، انجنیا، سیونی، ناگ پور ہوتا ہوا دہلی پہنچا۔ اہلیہ مرحومہ بھی ساتھ تھیں۔ دہلی میں خاص خاص اولیائے کرامؒ کی خدمت میں

حاضری دی۔ پھر سرہند شریف گئے راستے سے امرت سر ہوتے ہوئے لاہور سے کراچی آئے۔
مرحومہ قرآن پاک اچھا پڑھتی تھیں۔ مراقبہ کرتی تھیں بزرگانِ دینؒ کی زیارت ہوتی تھی۔ لیکن ڈر جاتی تھیں اور مراقبہ چھوڑ دیتی تھیں۔ سرہند شریف میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو ان کی طرف سے ایک پردہ لگ گیا اور مرحومہ نے باہر سے ان سے کچھ عرض کیا۔ تو جواب ملا کہ اپنے شوہر کے توسط سے کہلاؤ۔ تین مرتبہ مرحومہ نے کچھ عرض کیا تو تینوں مرتبہ یہی جواب ملا۔ سبحان اللہ، شریعت کی کس قدر اس دربار میں پابندی ہے۔ مراقبے کے بعد مرحومہ نے مجھے یہ واقعہ بتایا۔ مرحومہ نے غالباً اولاد کے لئے دعا کرنے کی درخواست کی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دعا سے ایک بچی کی وفات کے بعد سعدیہ اور صفیہ پیدا ہوئیں۔ الحمد للہ۔

۱۔ ۱۵ شعبان ۱۴۱۱ھ (۳ مارچ ۱۹۹۱ء) کی صبح کو خواب میں اہلیہ کو ان کے بڑے بھائی انوار الحق صاحب مرحوم کے ساتھ بیٹھا دیکھا۔ بہت خوش تھیں اور غالباً دودھ روٹی کھا رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ پندرہ روپے ان کو (ان کے بھائی صاحب) کو کپڑے کے دے دو، تو اہلیہ نے کہا کہ کپڑے کے نہیں، دودھ کے دودھ کے۔'' پھر میری آنکھ کھل گئی۔

۲۔ دوسرے دن ۴ مارچ کو عصر کے بعد مراقبے میں یکایک یہ منظر دکھلائی دیا کہ وہ اچھی حالت میں لیٹی ہوئی ہیں اور زینب بھی کھڑی ہوئی ہے۔ وہ زینب کے بارے میں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے یا سو رہی ہے۔ (صحیح الفاظ یاد نہیں)

۳۔ ۱۰ مارچ کی صبح کو دیکھا کہ اہلیہ ہلکے آسمانی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس ہیں، تندرست ہیں اور آرام کر رہی ہیں۔

۴۔ ۲۰ مارچ، ۳ رمضان المبارک کو قریب ۹ بجے صبح دیکھا کہ گھر میں اپنے پلنگ پر لیٹی ہوئی ہیں۔ تندرست ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ میں اچھی ہوں۔

۵۔ ۸ رمضان المبارک، ۲۵ مارچ کی صبح قریب ساڑھے پانچ بجے ایسی نظر آئی کہ ابھی غسل کر کے آئی ہیں اور ہشاش بشاش ہیں اور غور سے دیکھ رہی ہیں۔

۶۔ دوشنبہ ۱۵ رمضان المبارک، یکم اپریل ۱۹۹۱ء کی صبح قریب ۷ بجے دیکھا کہ بہت بڑی دستر خوان میں مختلف اقسام کے کھانے اہلیہ کے سامنے رکھے ہوئے ہیں اور بہت خوش ہیں۔

۷۔ یک شنبہ ۲۸، رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ، ۱۴؍اپریل ۱۹۹۱ء گزشتہ شب اپنی مسجد میں شبینہ تھا۔ میں فجر کے بعد سو گیا۔ تو دیکھا وہ بیٹھی ہیں۔ میں نے کہا کہ دودھ رکھا ہوا ہے، کسی کو دے دو تو کہنے لگیں کہ میں اسے کسی کام میں لوں گی۔ (خوش تھیں)

۸۔ جمعہ ۱۱ شوال، ۲۶۔ اپریل کی گزشتہ رات اور دن میں بھی خواب میں دیکھا کہ خوش ہیں اور سعدیہ صفیہ چھوٹی چھوٹی بچیاں ہیں۔

۹۔ جمعرات ۲۴ شوال، ۹ مئی ۱۹۹۱ء کی صبح کو دیکھا کہ کچھ کمزور ہیں اور میری طرف دیکھ رہی ہیں۔

۱۰۔ بدھ ۳۰ شوال، ۱۶ مئی کو دوپہر کے وقت سو گیا تو دیکھا کہ چارپائی پر بیٹھی ہوئی ہیں غالباً غسل کیا ہے اور جامنی رنگ کا کرتہ پہنے ہوئے ہیں اور تندرست ہیں۔

۱۱۔ جمعہ ۱۶ شوال، ۳۱ مئی کو نماز جمعہ کے بعد سو گیا تھا۔ صحت مند نظر آئیں۔ کسی کے ساتھ تھیں کہنے لگیں کہ میں زبیدہ آپا کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ ظہور میاں کو بھیج دینا تو ان کے ساتھ آ جاؤں گی۔

۱۲۔ جمعرات ۶ جون ۱۹۹۱ء، ۲۲ ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ کی دوپہر کو سو رہا تھا تو دیکھا کہ دسترخوان بچھا ہوا ہے۔ کسی کو کھانا کھلایا اور وہ مہمان جانے لگا تو میں نے مرحومہ سے کہا کہ اس کے ساتھ کچھ اور سلوک کر دو۔ کہنے لگیں کہ اس کو بٹھایا، کھانا کھلایا، اب اور کیا اس کے لیے کرنے کی ضرورت ہے؟ مرحومہ کو تندرست اور اچھی حالت میں دیکھا۔

۱۳۔ اتوار ۱۰ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ، ۲۳ جون ۱۹۹۱ء کو ظہر کے بعد خواب میں دیکھا۔ دل پر بڑا اثر ہوا۔ دیر تک آنسو جاری رہے۔ زبان سے یہی نکلا کہ اب تو صرف خوابوں اور مکاشفوں ہی میں دیکھ سکوں گا۔

داغِ دل جل رہا ہے بے روغن

۱۴۔ منگل ۳ محرم ۱۴۱۲ھ/۱۶ جولائی ۱۹۹۱ء کو دیکھا کہ گھر میں کئی رشتے دار ہیں اور سعدیہ صفیہ کی والدہ بہت خوش ہیں۔ زرد رنگ کی اوڑھنی ہے اور مجھ سے بہت خوش ہو کر ان رشتہ داروں کی باتیں بتا رہی ہیں۔ مجھے بڑی فرحت محسوس ہوئی۔

۱۵۔ شب سہ شنبہ یعنی ۱۶۔ ۱۷ محرم ۱۴۱۲ھ، ۲۹۔ ۳۰ جولائی ۱۹۹۱ء کی درمیانی شب

آفتاب میاں کی نانی زکیہ صاحبہ کا انتقال ہوا۔ سہ شنبہ کو ظہر کے بعد ان کو میری اہلیہ قمر بیگم کی بائیں طرف دفن کیا۔ میں نے دیکھا کہ اہلیہ سبز کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور کھکھلا کر ہنس رہی ہیں اور زکیہ صاحبہ بھی خوش ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت زیادہ خوش ہیں۔

۱۶۔ شب سہ شنبہ ۲۴ محرم ۱۴۱۲ھ، ۱۸ اگست ۱۹۹۱ء کی درمیانی شب میں دیکھا کہ گھر میں آئی ہیں اور تہجد کی نماز میں مشغول ہیں۔

۱۷۔ شنبہ ۷ صفر ۱۴۱۲ھ، ۱۸ ستمبر ۱۹۹۱ء کی صبح کو دیکھا کہ خوش خوش آئی ہیں اور زینب (نواسی) کو پیار کر رہی ہیں۔

۱۸۔ یک شنبہ ۱۳ ربیع الاول، ۲۳ ستمبر ۱۹۹۱ء سے پہلی شب میں دیکھا کہ مرحومہ اور میں کہیں باہر سفر پر گئے ہوئے تھے۔ کسی نے میری بہت سی رقم نکال لی۔ لیکن پھر بھی اتنی بچی کہ ہم دونوں اپنے گھر پہنچ سکتے تھے۔ راستے میں امرود کا ایک باغ ملا۔ امرود کی بہت سی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔ اور بیچنے والی عورتیں سلیقہ مند تھیں۔ مرحومہ نے امرود خریدنے کو مجھ سے کہا۔ میں نے ایک امرود ان کے لئے نکالا۔ ان عورتوں سے ایک نے وہ وزن کیا۔ میں نے ایک ایک کے کئی نوٹ اس کے سامنے رکھ دیے اس نے صرف دو نوٹ لیے۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔

پنج شنبہ ۱۶ ربیع الاول/۱۴۱۲ھ، ۲۶ ستمبر ۱۹۹۱ء کو دیکھا کہ مرحومہ مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ عامر کا کام ہے۔ میں اس کو لے جا کر اس کا کام کرا دوں گی۔ اس سے ایک دن پہلے دیکھا کہ میں مکان میں داخل ہوا تو صفیہ کو لے کر داخل ہوا۔ پھر مرحومہ بڑی بچی سعدیہ کو لے کر داخل ہوئیں۔ دونوں بچیاں چھوٹی چھوٹی نظر آئیں اور وہ اور ان کی والدہ سرخ لباس میں تھیں۔

۱۹۔ شنبہ ۹ نومبر ۱۹۹۱ء۔ گزشتہ شب خواب میں نظر آئیں۔ تندرست اور سرمئی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ گفتگو یاد نہیں۔

۲۰۔ دوشنبہ ۱۲ جمادی الاول ۱۴۱۳ھ، ۹ نومبر ۱۹۹۲ء گزشتہ شب خواب میں نظر آئیں۔ سفید کپڑے پہنے تھیں۔

۲۱۔ شب شنبہ ۳ شوال ۱۴۱۳ھ، ۲۷ مارچ ۱۹۹۳ء کو شعور احمد فاروقی صاحب کی اہلیہ صاحبہ کا حیدر آباد میں انتقال ہوا۔ دن کو (یعنی شنبہ) ان کو میری اہلیہ قمر بیگم کے سرہانے کی طرف دفن کرنے کے لئے گئے تو اہلیہ نے مڑ کر دیکھا کہ کس کو دفن کیا جا رہا ہے۔ پھر انہوں نے

قبر پر کسی برتن سے مٹی دی۔ اہلیہ مرحومہ گہرے سبز رنگ کا دوپٹا اوڑھے ہوئے تھیں اور سفید کرتہ اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھیں۔ بدن ہلکا پھلکا نظر آیا اور خوش تھیں۔

۲۲۔ شب دوشنبہ ۲۱ رجب ۱۴۱۴ھ، ۳ جنوری ۱۹۹۴ء کو اہلیہ کے انتقال کو پورے تین سال ہو گئے۔ رات کو انہیں سبز لباس میں دیکھا۔ جنتی لباس ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اور مجھے صبر عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

۲۳۔ اس کے بعد کئی مرتبہ اہلیہ کو خواب میں دیکھا۔ شب یک شنبہ ۴ شوال المکرم ۱۴۱۵ھ، ۶ مارچ ۱۹۹۵ء کو دیکھا کہ بہت خوش تھیں۔ پان کھائے ہوئے تھیں۔ دوسرا پان بھی بنا رہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

شب سہ شنبہ ۲۶ شوال ۱۴۱۵ھ، ۲۸ مارچ ۱۹۹۵ء کو خواب میں نظر آئیں۔ بہت تندرست اور نوعمر نوجوان لڑکی کی طرح۔ میری طرف بہت خوش ہو کر متوجہ تھیں۔ اور چاہتی تھیں کہ لوگوں کی طرف میں نہ جاؤں۔ بہت دیر تک خوش ہوتی رہیں۔ گویا جنتی عمر میں تھیں۔

۲۴۔ شب دوشنبہ ۹ شعبان ۱۴۱۶ھ، یکم جنوری ۱۹۹۶ء کو بہت اچھی صحت اور سبز لباس میں نظر آئیں۔ ان کے ساتھ دو خاتون اور بھی تھیں جن کو جانتا تھا۔ اب بھول گیا۔

دو دن کے بعد پھر خواب میں نظر آئیں۔ جمعہ ۱۹ جنوری ۱۹۹۶ء، ۲۷ شعبان ۱۴۱۶ھ کی صبح کو بہت افسردہ نظر آئیں۔ کہ اسی دن ان کی بہن خورشید کا انتقال ہونے والا تھا۔ خورشید بہن کا انتقال جمعہ ۱۹ جنوری ۱۹۹۶ء، ۲۷ شعبان المعظم ۱۴۱۶ھ کو کراچی میں ہوا۔

۲۵۔ چہار شنبہ ۲۱ ذی قعدہ ۱۴۱۶ھ، ۱۰ اپریل ۱۹۹۶ء کو صبح کو دیکھا کہ اہلیہ کا بہت بڑا مکان ہے۔ وہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ تندرست تھیں۔ سرخ دوپٹا اوڑھے ہوئے تھیں اور مجھے بلا رہی تھیں۔

۲۶۔ شب جمعہ ۲۱ ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ، ۱۰ مئی ۱۹۹۶ء کو دیکھا کہ وہ ہلکے سبز لباس میں ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ آپ کی والدہ صاحبہ کی آنکھوں کا آپریشن کرانے کے لئے میں ہسپتال آئی ہوں اور آپ کا دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔ بہت خوش تھیں اور بہت خوش ہو کر ایسا کہہ رہی تھیں۔

۲۷۔ شب جمعہ ۱۱ ذی قعدہ ۱۴۱۷ھ، ۲۱ مارچ ۱۹۹۷ء کو دیکھا کہ پروفیسر نجی احمد

ہاشمی صاحب مرحوم بہت خوش خوش آئے ہیں۔ مجھ سے کہا کہ سعدیہ اور صفیہ آئی ہوئی ہیں۔ خالہ (یعنی میری اہلیہ) کے لئے قرآن خوانی کرادیں۔

۲۸۔ چہارشنبہ ۲۴ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ، ۱۳ جنوری ۱۹۹۹ء کو ساڑھے چار بجے سہ پہر اہلیہ کی چھوٹی بہن شوکت بیگم کا کراچی میں یکایک انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون، شاید یہی وجہ ہے کہ جب میں جمعہ ۱۹ رمضان کو فاتحہ پڑھنے گیا تو ان کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو ٹپک رہے تھے۔ انہیں شاید معلوم ہوگیا ہوگا کہ شوکت کا انتقال ہونے والا ہے۔

۲۹۔ شب یک شنبہ ۱۵ محرم الحرام ۱۴۲۰ھ، ۶ مئی ۱۹۹۹ء کو اہلیہ مرحومہ نظر آئیں۔ وہ کہیں دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اپنے چھوٹے داماد آفتاب احمد خان سے بڑی شفقت سے باتیں کررہی تھیں۔ میں آگے بڑھا کہ سنوں کیا کہتی ہیں۔ لیکن پھر میری آنکھ کھل گئی۔

۲۰۔ شب سہ شنبہ ۲۸ شعبان ۱۴۲۰ھ، ۸ دسمبر ۱۹۹۹ء کو ایسا دیکھا کہ میں قبرستان گیا ہوں۔ اہلیہ اپنی قبر سے نکل رہی تھیں سر کے بال نظر آئے۔ کہنے لگیں کہ مجھے ٹائیفائیڈ بخار ہوا تھا۔ خواہ مخواہ مجھے دفن کردیا۔ پھر ذرا سرا اونچا کیا تو انہیں قبریں نظر آئیں اور گھبرا گئیں۔ میں نے کہا کہ گھبرائیں نہیں۔ گھر چلیں۔ (بس پھر یاد نہیں)۔☆

☆نور القمر۔ ص ۸۷

باب پنجم

علما

علامہ سید سلیمان ندویؒ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ اس کی مختلف مشاورتی کمیٹیوں میں بعض بڑے بڑے علماء بھی رکن کی حیثیت سے نامزد کئے جاتے تھے۔ راقم الحروف کی طالب علمی کے زمانے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ بھی ایسے رکن تھے اور جب وہ تشریف لاتے تو جامع مسجد میں نماز کے بعد ہم لوگ ان کے گرد جمع ہو کر مختلف مسائل میں ان سے مستفید ہوا کرتے تھے۔ ہمارے ایک محترم استاد محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب موسم گرما میں شیروانی پر ہیٹ لگا لیا کرتے تھے۔ ایک طالب علم نے علامہ سے دریافت کیا کہ شیروانی پر ہیٹ لگانا کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ''شیروانی پر ہیٹ لگانے میں تو حرج نہیں، لیکن دل پر نہ لگایا جائے۔'' اس چھوٹے سے جملے نے ہم لوگوں کو بہت متاثر کیا اور اس وقت سے علامہ کی تشریف آوری کا انتظار ہوتا رہتا تھا کہ وہ کب تشریف لائیں اور کب ان سے ایسے پیارے جملے سنیں۔

علی گڑھ میں ایم اے (اردو) کا پہلا امتحان (سال اول اور سال دوم کے تمام پرچوں میں) ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا۔ محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے علامہ کے بعض مقالات (مثلاً ہندوستان میں ہندوستانی، اردو کیونکر پیدا ہوئی وغیرہ) کا مطالعہ ہر طالب علم کے لئے ضروری قرار دیا تھا۔ ان مقالات کا فائدہ نہ صرف علمی تھا بلکہ تحقیق کے جذبے کو ابھارنے کے لئے بھی بہت مفید تھا۔ میں علی گڑھ سے فارسی اور اردو میں ایم اے (اور ایل ایل بی) کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں اپنے وطن جبل پور (سی۔ پی) واپس آیا۔ پبلک سروس کمیشن نے ۱۹۳۷ء میں کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراؤتی (برار) میں مجھے اردو کا استاد مقرر کیا۔ اس وقت

سے کچھ علمی کام کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ علامہ مرحوم سے بار بار رجوع کرتا (چند خطوط سے اندازہ ہوگا) اور ان کی شفقتوں سے مستفید ہوتا رہا۔ میرا پہلا انگریزی مقالہ ناگ پور یونیورسٹی کے سالانہ جرنل میں ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا اور اردو میں میرا پہلا مضمون معارف (جنوری ۱۹۴۰ء) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بفضلہ تعالیٰ مستقل طور پر جاری رہا۔

۱۹۴۷ء میں میرا تبادلہ مارس کالج ناگ پور کو ہوا تو ملکی فسادات کی وجہ سے مجھے کراچی آنا پڑا۔ ایک بچی ہندوستان میں فوت ہوگئی تھی۔ اہلیہ اور ایک بچہ کراچی میں فوت ہوگیا۔ یہاں ۱۹۴۸ء میں اسلامیہ کالج قائم ہوا۔ اس میں میرا تقرر ہوگیا۔ لیکن دو سال کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے جب بڑے پیمانے پر اردو کالج قائم کیا تو مجھے اس کے لئے بلوالیا۔ ان تمام حالات کا علم علامہ مرحوم کو نہیں تھا۔ چنانچہ جب وہ جون ۱۹۵۰ء میں کراچی تشریف لائے تو میرے حاضر ہونے پر انہوں نے پہلا جملہ یہ فرمایا کہ ''میری اجازت کے بغیر تم نے سی پی کو کیوں چھوڑا؟''

(اللہ اللہ۔ کس قدر شفقت کا جملہ تھا!) میں شرمندہ ہوکر رہ گیا۔ لیکن پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ ایک دن ان کے کمرے میں ایک کاغذ پر دفعتاً نظر پڑی جس میں انہوں نے حکومت کو میرے بارے میں کیا کیا لکھا تھا (اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور مجھے معاف فرمائے کہ میں نے وہ کاغذ بلا اجازت کیوں دیکھا)۔

یہاں ایک واقعہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ وہ کس طرح بزرگان دین کی طرف مائل ہوئے۔ مولانا ابوالحسن زید فاروقی صاحبؒ مدظلہ نے اپنی کتاب ''حضرت مجددؒ اور ان کے ناقدین'' (صفحہ ۲۴۸) میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے جو علامہ نے مولانا حافظ محمد ہاشم جان مجددیؒ (م ۱۳۹۵ھ) سے بیان فرمایا تھا۔ فرماتے ہیں:

> میرے تین دوست اپنی موٹر میں لاہور سے دہلی آئے۔ مراجعت کے وقت اصرار کر کے مجھ کو اپنے ساتھ لیا۔ جب سرہند پہنچے تو وہ زیارت وفاتحہ کے لئے حضرت امامؒ کے روضے پر گئے۔ چوں کہ مجھ کو اس زمانے میں بزرگانِ دین سے لگاؤ نہ تھا، میں برائے فاتحہ نہ گیا بلکہ مسجد کی دیوار پر بیٹھ گیا جو کہ ایک گز اونچی اور ڈیڑھ فٹ چوڑی رہی

ہوگی۔ میرا منہ گنبد کی طرف تھا۔ میں نے دیکھا ایک شخص اکہرے بدن کے، سر پر دستار رکھے۔ میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا ''تم فاتحہ پڑھنے کے واسطے نہیں گئے؟'' میں نے جواب دیا ''جی ہاں'' کہا۔ انہوں نے اپنی نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر وہ میری نظر سے غائب ہو گئے۔ اور میں بے ہوش ہو گیا۔ جب میرے رفقاء فاتحہ پڑھ کر آئے تو انہوں نے مجھ کو اٹھایا اور مجھ کو ہوش آیا۔ میرا یہ خیال ہے کہ حضرت امامؒ بہ شکلِ مثالی مجھ پر ظاہر ہوئے تھے۔ آپ کی نظرِ کیمیا اثر نے میرے خیالات پر اثر ڈالا اور اس دن سے میرے خیالات بدلنے شروع ہو گئے۔

راقم الحروف کو یہ واقعہ کچھ مختلف بتایا گیا تھا۔ علامہ کے رفقاء مولانا آزاد سبحانی، نواب حلیم کانپوری (اور ایک صاحب اور) تھے۔ علامہ کے ساتھ انہوں نے سیرتِ پاک کے جلسے میں رات کو بستی (سرہند کے قریب) مقام میں شرکت کی۔ صبح کو وہ حضرت مزارِ اقدس میں فاتحہ پڑھنے گئے اور علامہ وہاں مسجد کی فصیل پر بیٹھ گئے۔ سامنے سے حضرت مجددؒ (بہ شکلِ مثالی) تشریف لائے اور فرمایا۔ ''مکتوباتِ مرا نہ خواندہ ای''؟ (میرے مکتوبات تم نے نہیں پڑھے؟) عرض کیا کہ ''خواندہ ام'' (میں نے پڑھے ہیں)۔ پھر فرمایا ''نہ فہمیدہ ای۔''؟ (مکتوبات سمجھے نہیں ہوئے؟) عرض کیا ''اندک اندک فہمیدہ ام۔'' (تھوڑے تھوڑے سمجھ میں آئے ہیں)۔ اسکے بعد علامہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ رفقا فاتحہ پڑھ کر آئے تو علامہ کے چہرے پر پانی چھڑکا۔ ہوش آنے پر فرمایا کہ ''آج شکار ہو گیا ہوں۔'' اس دن سے خیالات میں تبدیلی آئی اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ (والعلم عند اللہ)۔

افسوس کہ علم و فضل، ورع و تقویٰ، شفقت اور محبت کا یہ خورشیدِ درخشاں ہمیشہ کے لئے کراچی میں ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو غروب ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

علامہ مرحوم دو مرتبہ خواب میں تشریف لائے۔ ایک مرتبہ تو حیاتِ شبلی، حصہ دوم کے سلسلے میں (جس کا ذکر ابھی مکتوب نمبر ۵ کے ذیل میں آئے گا) اور دوسری بار یکم اکتوبر ۱۹۸۶ء (۲۵ محرم ۱۴۰۷ھ) کو تشریف لائے۔ ان کے داہنے گھٹنے میں کچھ درد تھا۔ میں خواب میں ہی دوڑ

کران کے گھٹنے دبانے لگا۔ فرمایا کہ کراچی یونیورسٹی کے اس طالب علم کو پی ایچ ڈی میں پاس کر دینا۔ چنانچہ تعمیل کر دی گئی۔ سبحان اللہ انتقال کے بعد بھی ان کو دوسروں کا کتنا خیال ہے!

اب آپ کے چند مکتوبات پیش کئے جاتے ہیں جن سے مجھے سرفراز فرمایا گیا تھا۔

(۱)

مکرم۔ السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ یکم دسمبر ۱۹۳۸ء ملا تھا۔ مگر مجھے چند سفر درپیش تھے۔ اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔ آپ کا ارادہ اچھا ہے۔ امید ہے کہ آپ کی کوششوں سے ایک نئے شاعر (۱) سے ہم روشناس ہوں گے۔ ہمارے ہاں فارسی کا ذخیرہ بہت ہی کم ہے۔ اس لئے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔

۱۔ حدیقہ حکیم سنائی کے آخری تاریخی شعر میں ''پانصد و بست و پنج'' عموماً پایا جاتا ہے۔ اور بعض میں ''پانصد و چہل و پنج'' ہے۔ اب عام روایت کی بنا پر ۵۲۵ھ سنائی کی تاریخ وفات ہے اور بعض کے نزدیک، جس کی میں نے بھی تائید کی ہے، ۵۴۵ھ تاریخ وفات قرار دی ہے۔ میرا مضمون سنائی کی تاریخ وفات پر معارف میں چھپا ہے۔ اس لیے ''پانصد و شصت و پنج'' تو کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ دولت شاہ نے ۵۷۶ھ تاریخِ وفات بالکل غلط لکھی ہے۔

۲۔ آپ کے سامنے حدیقہ کا مطبوعہ بمبئی نسخہ ہے جو نول کشوری سے بھی زیادہ غلط ہے۔ یہی عبارت نول کشوری میں اس طرح ہے:

کتاب کتبہ فی بغداد وارسل الی امیر الاجل برھان الدین
جمال الاسلام ابو الحسن علی بن ناصر الغزنوی المقلب

۱۔ راقم الحروف نے سید حسن غزنوی (معاصر سنائی) پر کام کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ بحمد اللہ وہ کام بعد میں پورا ہوا اور اس کے ممدوح سلطان بہرام شاہ غزنوی کی تاریخ بھی (انگریزی میں) لکھی۔ اس شاعر کے ایک ترجیع بند کا یہ شعر ہمارے ملک میں بہت مشہور ہے۔

سلموا یا قوم بل صلوا علی الصدر الامین
مصطفی ما جآء الا رحمۃ للعالمین

بہ بریاں گر رحمة الله عليه، بسبب طعن الطاعن فی ھذا الکتاب

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ یہ ابوالحسن علی، امرا میں سے تھے۔ علماء وشعرا میں سے نہ تھے۔ گو حدیقہ کے اشعار سے ان کا ''سالارِ دیں'' ہونا ظاہر ہے۔ ''بریاں گر سے ملقب ہونا بھی شرط ہے۔ دولت شاہ نے سید حسین غزنوی کو سنائی کے معاصرین میں شمار کیا ہے (ص ۹۸۔ لندن) اور سید حسن غزنوی نے دولت شاہ کے مطابق ۵۳۵ھ میں وفات پائی ہے۔ (ص ۱۰۵)

بغداد میں بہ زمانہ خلیفہ راشد باللہ (المقتول ۵۳۲ھ)، سلطان مسعود بن محمد بن ملک شاہ نے سید حسن غزنوی سے ملاقات کی (دولت شاہ، ص ۱۰۵)۔ سلطان مسعود بغداد میں ۵۳۰ھ میں تھا۔ اس بناء پر سنائی کا سید حسن غزنوی کے پاس خط بھیجنے کا وقت زیادہ سے زیادہ ۵۳۰ھ یا ۵۳۲ھ تک ہوسکتا ہے۔ پھر آپ نے ۵۶۵ھ میں حسن غزنوی کا بغداد میں ہونا کس طرح قرینِ صواب قرار دیا ہے؟

طبقاتِ ناصری ص ۲۳ میں ہے کہ سید حسن غزنوی نے سلطان بہرام کی تخت نشینی پر یہ قصیدہ پڑھا:

منادی بر آمد ز ہفت آسماں
کہ بہرام شاہ است شاہِ جہاں

اس کی تخت نشینی ۵۱۱ھ میں ہوئی ہے۔ پھر وہ اس وقت بھی تھا جب بہرام شاہ نے سلطان سوری کو شکست دی ہے اور قتل کیا ہے (لباب الالباب ۲۔ ص ۲۷۶)

خزینۃ الاصفیاء (ص ۲۴۶)۔ جلد اول میں جس خواجہ ناصر الدین ابو یوسف کا ذکر ہے وہ سید حسن غزنوی کے والد نہیں ہوسکتے۔ خواجہ ابو یوسف چشتیؒ مشہور صوفی ہیں اور ان کے دو بیٹے ہیں۔ مودود چشتی اور ابوالفتح چشتی۔ دیکھیے خزینۃ الاصفیاء۔ صفحہ مذکورہ، سطر آخر۔

۳۔ شیخ آذری کی جواہر الاسرار ہمارے یہاں نہیں ہے۔

۴۔ ریاض الشعراء کا وہی مطلب ہے جو آپ سمجھے ہیں۔ یعنی صائب نے انتخاب میں اس کو لیا ہے۔

والسلام سید سلیمان ۲۷ دسمبر ۱۹۳۸ء

(۲)

مکرم۔السلام علیکم

عنایت نامہ ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے پوری کوشش کی ہے۔امید ہے آپ ہمت نہ ہاریں گے۔ایک بات عرض کردوں، اکثر تکثیرِ مواد کے لئے لوگ قیاسات کو دلائل کی جگہ دیدیتے ہیں۔آپ اس سے احتراز فرمائیے۔ جب تک کوئی بات محقق نہ ہوجائے قبول نہ کیجئے۔اس زمانے میں آداب والقابِ بے معنی کا بڑا کھیل تھا۔تاج الدین اور عزالدین اور خدا جانے کیا کیا لوگ کہتے تھے۔یہ نام نہیں ہیں۔ان سے دھوکا نہ کھایئے۔

دولت شاہ میں تاریخیں اور واقعات بھی معتبر نہیں ہیں۔ایک دل چسپ تذکرہ ہے اور بس۔تاریخی حیثیت اس کو بہت کم حاصل ہے۔

میرا مضمون سنائی کی وفات پر معارف مارچ ۱۹۳۳ء میں نکلا تھا۔آپ کا خط واپس جاتا ہے۔

والسلام

سید سلیمان ۲۱ جنوری ۱۹۳۹ء

(۳)

مکرمی۔ السلام علیکم

ذوق جیسے باکمال شاعر کے متعلق یہ سوئے ظن ہوگا کہ وہ سیۂ کے بجائے سیہ لکھیں۔ صحیح شعر اس طرح ہوگا۔

ترا تو سیئہ بھی یوں ہے داخلِ حسنات
کہ جیسے صحبتِ اصحابِ کہف میں قطمیر(۲)

والسلام۔سید سلیمان

۲۵ جولائی ۱۹۳۹ء

۲۔ناگ پور یونیورسٹی کے بعض کالجوں میں برادرانِ وطن نے اپنے لوگوں کو نااہلی کے باوجود اردو اور فارسی کا استاد مقرر کردیا تھا۔ایک کالج میں ایک استاد صرف میٹرک پاس تھے۔انہوں نے انٹرمیڈیٹ کے سالانہ امتحان بابت ۱۹۳۹ء میں ذوق کے چند اشعار تشریح کے لئے دیے تھے۔ایک شعر اس طرح لکھدیا تھا۔(بقیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ کیجئے)

(۴)

مکرم۔السلام علیکم

عنایت نامے کا شکریہ۔ریواں (۳) کے کتب خانے کی اطلاع کا شکریہ۔

کیا اچھا ہوتا کہ یہ کتب خانہ دارالمصنفین کو مل سکتا۔ کیا آپ اس کی تحریک نہ فرمائیں گے؟ یہاں کے رفقا ان کتابوں سے بہت کچھ فوائد اٹھا سکیں گے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ترا تو سیہ بھی یوں ہی ہے داخلِ حسنات

کہ جیسے صحبتِ اصحابِ کہف میں قطمیر

میں نے یونیورسٹی کو لکھا کہ سیہ کوئی لفظ نہیں۔سیئہ چاہئے اور پہلا مصرع اس طرح ہوگا۔

ترا تو سیئہ بھی یوں ہے داخلِ حسنات

وہ استاد نہیں مانے۔پھر میں نے قبلہ سید صاحب اور علی گڑھ کے بعض اپنے استادوں سے جوابات منگوا کر پیش کر دئے۔

وہاں ایک اور استاد اسی قوم کے تھے جو فرماتے تھے کہ غالب ترابی (تراویح) بہت پڑھا کرتے تھے کیونکہ ان کے ایک شعر میں ہے:

یہ مسائلِ تصوف یہ ترابیانِ غالب

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ایک اور استاد تھے جو مضامینِ رشید میں ''لقمہ دینا'' (محاورہ) کے عجیب معنی بتاتے تھے۔

۳۔ریاست ریواں میں مولانا رحمٰن علی مرحوم (صاحب تذکرۂ علمائے ہند وغیرہ) کی وفات کے بعد ان کا کتب خانہ ان کے صاحبزدے مولوی عیاض علی صاحب کی تحویل میں تھا اور خستہ حالت میں تھا۔ میں نے اپنے محترم دوست پروفیسر اختر حسین نظامی کے ساتھ اسے دیکھا تھا اور کوشش بھی کی تھی کہ وہ کتب خانہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کو دے دیا جائے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ وہیں مولانا شبلی کا ایک مکتوب مولانا رحمٰن علی صاحب کے نام ملا تھا۔اس کی نقل سید صاحب کو بھیج دی تھی۔اسی کو انہوں نے ''تبرّک نامہ'' فرمایا ہے۔وہ اس طرح تھا:''جہاں تک مجھ کو معلوم ہے جامے کا رواج ہندوستان کے سوا اور کہیں نہ تھا۔ دولتِ عباسیہ، اندلسین، اتراک کے لباس کا حال کتابوں میں ملتا ہے وہ جامہ سے بالکل الگ ہے۔ یہاں اس کا رواج غالباً اکبر کے عہد سے ہوا۔لیکن خاص حوالہ کا مجھ کو علم نہیں۔آپ کی کتاب تذکرۂ علماء کب تیار ہوگی؟ المامون چھپ رہی ہے۔والسلام۔شبلی ۲۶ نومبر ۱۸۹۱ء''

اس مکتوب سے معلوم ہوا کہ ۱۸۹۱ء میں المامون چھپ رہی تھی اور مولانا رحمٰن علی کا تذکرۂ علمائے ہند تیار ہو رہا تھا۔

مولانا شبلی مرحوم کا تبرک نامہ پہنچا۔ محفوظ رہے گا۔

مولانا رحمٰن علی صاحب کا تذکرۂ علماء بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔

ادیب صابر اور فرید کاتب اور فخر الدین خالد ہروی میں سے کسی کا فارسی دیوان یہاں نہیں ہے۔

والسلام

سید سلیمان۔ ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء

(۵)

مکرم۔ السلام علیکم

عنایت نامے کے جواب میں تاخیر ہوئی۔ میں نے حسب ایماء سامی مولوی عیاض علی صاحب کی خدمت میں (ریاست ریواں) نیاز نامہ آج لکھا ہے۔ دیکھئے کیا نتیجہ ہو۔ آپ اور مولوی اختر حسین صاحب اگر کوشش میں لگے رہیں گے تو کامیابی کی امید ہے۔ حیاتِ شبلی ابھی تک مسودے کی شکل میں ہے مگر الحمد للہ کہ قریبِ ختم ہے۔ چالیس برس کی قومی، علمی، تعلیمی اور سیاسی احوال وسوانح کا مجموعہ ہے۔ نقد وتبصرہ دوسرے حصے میں ہوگا۔ (۴) یہ صرف سوانح وخدمات پر مشتمل ہے۔ آئندہ سال یہ حصہ مطبع میں چلا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

ایک کتاب کا اشتہار بھیج رہا ہوں۔ (۵) اگر اس کے دس پانچ نسخے آپ کی تحریک سے فروخت ہو جائیں تو میں ممنون ہوں گا اور آپ ماجور۔

والسلام سید سلیمان

۲۸ رمضان ۱۳۵۹ھ۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۰ء

۴۔ قبلہ سید صاحب کی وفات کے بعد راقم الحروف نے خواب میں دیکھا۔ فرما رہے تھے حیاتِ شبلی کا دوسرا حصہ تم لکھ دو۔ راقم الحروف نے خود لکھنے کے بجائے عزیزِ گرامی پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی صاحب (حال صدر شعبۂ اردو۔ سندیونیورسٹی) کو اس کام کے لئے آمادہ کیا۔ اور انہوں نے سخت محنت کر کے ''مولانا شبلی کا ذہنی ارتقا'' بہت فاضلانہ مقالہ لکھا۔ افسوس کہ وہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

۵۔ اس کتاب سے مراد قبلہ سید صاحب کی ''رحمتِ عالم'' سے ہے جو ۲۰ بیں رجب ۱۳۵۹ھ کو مکمل ہوئی تھی۔ پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی صاحب کا انتقال ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی حیات ہی میں ہو گیا تھا۔ البتہ شبلی ذہنی ارتقا ان کی حیات میں کراچی سے شائع ہوئی تھی۔

(۶)

مکرم۔ السلام علیکم

عنایت نامہ کا شکریہ۔ اور ''نقوشِ سلیمانی'' (۶) کی پذیرائی پر ہدیۂ تشکر۔ پی ایچ ڈی کے لیے عنوانات (۷) تو بہت سے ہیں۔ مگر ضروری ہے کہ آپ کی مناسبتِ طبع اور ذوق کے مطابق ہو۔ حسبِ ذیل چند عنوانات ذہن میں آتے ہیں:

۱۔ ہندوستان میں فارسی شاعری۔ مسعود سعد سلمان سے شبلی تک۔

۲۔ ہندوستان میں ہندی علوم اور مسلمان۔

۳۔ ہندو شعرائے فارسی

۴۔ ہندوستانی تمدن میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر اور مسلمانوں نے ہندوؤں پر کیا اثرات ڈالے۔

آپ کا مضمون (۸) ادارتِ معارف کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

والسلام

سید سلیمان ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء☆

۶۔ قبلہ سید صاحب کی اس فاضلانہ کتاب پر راقم الحروف نے ایک حقیر سا تبصرہ لکھا تھا، اسی کا ذکر ہے۔ پھر انہوں نے تحریر فرمایا کہ اس کتاب پر نظرِ ثانی کر کے لکھو۔ چنانچہ ان کی عظمت کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ نقوشِ سلیمانی کے دوسرے ایڈیشن میں چار مقامات پر اس عاجز کا ذکر ہے۔

۷۔ راقم الحروف نے سید حسن غزنوی پر کام کرنے کا ارادہ کیا تھا تو ایک فاضل نے مشکلات کی وجہ سے مجھے اس ارادے سے باز رکھنا چاہا۔ اسی لئے قبلہ سید صاحب کو دوسرے عنوانات کے لئے زحمت دی تھی۔ لیکن نواب حبیب الرحمٰن شروانی مرحوم نے سید حسن غزنوی ہی پر کام کرنے کے لیے میری ہمت افزائی فرمائی۔

۸۔ یہ مضمون ''تاریخ ملک ارسلان غزنوی'' تھا جو معارف (نومبر ۱۹۳۹ء) میں شائع ہوا۔

☆ طوبیٰ لہم۔ ص ۴۰

مولانا راشد برہان پوری

مولانا سید محمد مطیع اللہ راشد، برہان پور، (سی۔پی) کے ایک نامور استاد تھے۔ سلسلۂ اجداد حضرت شیخ محمد ابن فضل اللہؒ (م ۱۰۲۹ھ) تک اور ننھیالی سلسلہ حضرت مسیح الاولیاء عیسیٰ جند اللہ سندھی ثم برہان پوری (۹۶۲ھ تا ۱۰۳۱ء) تک پہنچتا ہے۔ آپ برہان پور میں (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء) میں پیدا ہوئے۔ والد سید محمد فضل اللہ وہاں اپنے سلسلۂ قادریہ کے سجادہ نشین تھے۔ جاگیردار بھی تھے۔ تایا سید محمد کریم اللہ اپنے علم وفضل کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ شہر کے پیرزادگان اور عمائدین ان سے فارسی، عربی اور دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ راشد صاحب نے بھی ان سے اکتسابِ علم کیا۔ صَرف ونحو، عروض وقافیے میں خاص مہارت حاصل کی۔ فارسی کے تراجم اور فارسی تحریر وتقریر میں کامل عبور بہم پہنچایا۔ خطاطی میں متداولہ آٹھوں خطوط کی مشق کی اور کوئی بھی خط بلا تکلف لکھ سکتے تھے۔ آپ مشکل سے ۱۸ سال کے تھے کہ والد اور تایا دونوں فوت ہوگئے۔ آپ نے اور آپ کے بڑے بھائی سید محمد احمد اللہ نے آبائی جاگیر کے جھگڑے ختم کرنے کے لیے ایثار وقربانی سے کام لیا اور اپنے کاموں میں لگ گئے۔ بڑے بھائی نے تجارت شروع کی اور راشد صاحب ایک مدرسہ حکیمیہ میں معلم بن گئے۔ اضافی آمدنی کے لئے عمدہ جلد سازی اور خطاطی کا سہارا لیا۔ تاکہ خاندان کے غریب عزیزوں کی کفالت ہوسکے۔ قلمی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا اور خطِ شکستہ کے پڑھنے کی ایسی مشق بہم پہنچائی کہ روانی کے ساتھ مخطوطات پڑھ سکتے تھے۔ بعض مشہور اہلِ قلم حضرات آپ سے مستفیض ہوئے۔

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی۔ ڈاکٹر منظور احمد اور ڈاکٹر شیخ فرید نے خصوصیت سے استفادہ کیا اور پی ایچ ڈی کے مقالات میں آپ سے رہبری حاصل کی۔ مسٹر کیانی (کیوریٹر۔ وکٹوریہ میوزیم۔ بمبئی) اکثر آپ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ پنجاب کے وزیر تعلیم گوکل چند نارنگ نے جب بعض قریب الصوت عربی حروف کی تمیز کو ختم کرنے کی کوشش کی تو آپ نے سختی سے مخالفت کی اور کئی رسالوں میں مضامین شائع کرائے۔

ہندوستان کی سیاسی کش مکش کے زمانے میں متعدد نظمیں لکھیں اور مسلم لیگ کی پرزور حمایت کی۔ لیکن تقسیم ہند کے موقع پر حیدرآباد دکن کے نواب دوست محمد خان اور نواب محمد اشرف کے اصرار پر آپ مع اہل وعیال دکن چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد سقوطِ حیدرآباد کا سانحہ پیش آیا تو آپ مع اہل وعیال کراچی آگئے۔ یہاں وکیل محمد اصغر برہان پوری، ساغر اندوری، فنا ناگ پوری، پروفیسر امانت علی، پھر پیر حسام الدین راشدی کی معیت میں علمی اور ادبی کاموں کی طرف متوجہ ہوئے، پیر صاحب کے اصرار پر آپ نے ایک محققانہ کتاب ''برہان پور کے سندھی اولیاء'' ۱۹۵۷ء میں شائع کی۔ پھر عبدالحکیم عطا تتوی (گیارہویں صدی ہجری) کا فارسی دیوان جس محنت اور عرق ریزی سے مرتب کیا وہ وہی کرسکتے تھے۔ قلمی دیوان بہت کرم خوردہ اور آب رسیدہ تھا۔ آپ نے بڑی کاوش کی اور اس دیوان کو زندگی بخشی۔

ان دو کتابوں کے علاوہ ایک بہت بڑا کارنامہ تاریخ برہان پور ہے جس کے لئے انہوں نے اس قدر محنت کی ہے کہ تفصیل مشکل ہے۔ برہان پور کے چپے چپے سے علمی سرمایہ حاصل کیا۔ مخطوطات کی تلاش اور تاریخی قطعات کی تحقیق بہت بڑا کام تھا۔ عمارتوں پر چڑھ کر بہ کثرت ادبی اور علمی تحریروں کے عکس حاصل کئے۔ مزارات اور قبوں کی تحریروں کو (جو اکثر کٹی پھٹی تھیں) مقروء کیا اور بہت بڑا علمی سرمایہ جمع کردیا۔ اس کتاب میں برہان پور کے ساڑھے چھ سو سال کے تاریخی واقعات ہیں۔ سلاطین، امرا، علما، اولیا، مشائخ وغیرہ کے حالات ہیں۔ کم وبیش ڈیڑھ سو عکسی تصاویر ہیں جن میں مساجد، مقابر، مسکوکات، مخطوطات وغیرہ کے فوٹو ہیں اور پندرہ سو صفحات پر محیط ہیں۔ پھر آقائے کاظم زادہ ایرانی کی فارسی کتاب رہبر نژادِ نو کا اردو ترجمہ بھی آپ نے کیا ہے جو مدینہ پریس بجنور سے شائع ہوا ہے۔

آخر عمر میں بہت کمزور ہوگئے تھے۔ پہلے بھی کمزور ہی تھے۔ کراچی میں ۲۹ شوال

۱۳۷۹ھ (سہ شنبہ ۲۶ اپریل ۱۹۶۰ء) کوتلاوتِ قرآن پاک کرتے ہوئے واصل بحق ہوئے۔
آپ کے بھتیجے سید محمد حبیب اللہ نے (جو داماد بھی تھے) آپ کے نام (مطیع اللہ) کی مناسبت سے انتقال کی یہ تاریخ نکالی تھی۔

بسم اللہ الرحیم اطیعو اللہ واطیعوا الرسول

۹ ۷ ۳ ۱ ھ

کراچی ایئر پورٹ کے قبرستان میں خوابیدہ ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ضمیمہ

۱۔ سید محمد حبیب اللہ آپ کے بھتیجے اور داماد بھی تھے۔ جرمنی سے ڈپلوما معذور بچوں کی تربیت کے لئے حاصل کیا تھا اور کراچی میں معذور بچوں کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) بھی پاس کیا تھا۔ بہت مخلص تھے اور علم دوست بھی۔

۲۔ مولانا مطیع اللہ راشد صاحب کے ایک شاگرد مقبول نیازی کھنڈوا (سی۔ پی) میں پرائمری اسکول میں مدرس تھے۔ اس اسکول ہی کے زمانے میں انہوں نے میٹرک سے ایم اے (فارسی) تک کے امتحانات پرائیویٹ طریقے سے پاس کیے۔ راقم الحروف جب ناگ پور یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو ہوا تو نیازی صاحب سے بارہا کہا کہ کسی پرائیویٹ کالج میں تقرر ہو سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی بے نیازی کی وجہ سے پسند نہیں کیا۔ فرماتے تھے کہ اگر میں گورنر بھی ہو جاؤں تو دو روٹیاں ہی کھا سکوں گا، اس لیے کالج میں جا کر کیا کروں گا، آخر انہیں کئی احباب نے مجبور کر کے بمبئی کے صابو صدیق ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر بنوا دیا۔ وہ فرماتے تھے کہ ایم اے (فارسی) کے ایک پرچے میں سہ نثری ظہوری بھی داخل نصاب تھی۔ مولانا راشد صاحب مجھے یہ کتاب اس روانی کے ساتھ سمجھاتے تھے کہ گویا انہیں وہ حفظ تھی۔ مقبول نیازی (بے نیازی) کی ایک پرلطف کتاب ''برگِ سبز'' بمبئی سے شائع ہوئی ہے۔

۳۔ مقبول نیازی کھنڈوا میں تھے۔ انہی کے ساتھ مولانا راشد صاحب سے ملنے کے لئے راقم الحروف برہان پور گیا تھا۔ وہاں ان کے مکان کے سامنے ایک باغ تھا جس میں شاہ جہاں بادشاہ کی بیگم ممتاز محل کو پہلے دفن کیا گیا تھا۔ پھر تاج محل (آگرہ) کی تعمیر کے بعد ان کی نعش کو وہاں منتقل کیا گیا۔

۴۔ مولانا راشد صاحب بہترین جلد سازی کرتے تھے۔ اس کی ایک دکان کراچی میں بندر روڈ والی میمن مسجد کے پاس کھولی تھی۔ مخدومی ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم (لاہور) کو ایک مرتبہ یہ عاجز اس دکان

پر لے گیا تھا۔ وہاں مولانا کے بہ کثرت مخطوطات تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بہت اشتیاق کے ساتھ دیکھے۔ بعد میں یہ مخطوطات سندھ یونیورسٹی نے اپنی لائبریری کے لئے خرید لیے تھے۔

۵۔ مولانا راشد صاحب ایک واقعہ حضرت محمد ہاشم کشمی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق (جو حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے) سناتے تھے کہ پہلے ان بزرگ کا مزار برہان پور میں ''باندہ رول'' ندی کے قریب تھا۔ مزار کے قریب پانی آنے لگا تو انہوں نے شہر کی کئی مسجدوں کے اماموں کو خواب میں فرمایا کہ میرا جسم کسی اونچی جگہ پر منتقل کردو۔ چنانچہ ایک دن مقرر ہوا۔ شہر اور اطراف کے بہ کثرت لوگ موجود تھے۔ ان کی قبر کو کھولا گیا تو ان کا جسم بالکل سلامت تھا اور ایسی خوشبو اڑی کہ کبھی ایسی خوشبو میسر نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے ہندو اس واقعے سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے۔ حضرت محمد ہاشم رحمۃ اللہ علیہ کو پھر ایک اونچے مقام پر (ایک ہائی اسکول کے قریب) دفن کیا گیا۔

۶۔ مولانا شیخ محمد ابن فضل اللہ برہان پوری (م ۱۰۲۹ھ) کا ''التحفۃ المرسلہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' (۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۸ء) میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اس رسالے میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے اختلاف کو دور کیا گیا تھا۔ اس رسالے کا فارسی ترجمہ مصنف کے خلیفہ مولانا عبدالغفور نے کیا تھا اور اردو ترجمہ خود مولانا راشد نے شامل کیا تھا۔ مولانا راشد نے اس رسالے پر (راقم الحروف کو) لکھا ہے کہ ''بظاہر اسباب یہ آخری تحفہ معلوم ہوتا ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف''

راشد برہان پوری۔ یکم محرم ۱۳۷۸ھ مطابق ۳۰ جولائی ۱۹۵۸ء☆

☆ انعمت علیہم۔ ص ۶

مولانا محمد یوسف بنوریؒ

یا اسفیٰ علیٰ یوسف وابیضّت عنہ من الحزنِ (ی)

۷ ۷ ۹ ۱ء

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری علیہ الرحمہ سے اس عاجز کو سب سے پہلے ۱۹۵۳ء میں حج کے دوران مدینہ منورہ میں شرف نیاز حاصل ہوا تھا۔ اس وقت ان کی رفاقت میں افریقہ کے بزرگ حاجی عبدالرحمٰن مرحوم تھے اور حضرت مولانا ہی کی وجہ سے ان کی شفقتیں بھی مجھے حاصل رہیں۔ حج کے بعد حضرت مولانا غریب خانے پر (۳۲۸ پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی) تشریف لاتے رہے اور اپنے ساتھ مجھے بھی مختلف مقامات پر لے جاتے تھے، بالخصوص حاجی وجیہ الدین صاحب مرحوم کے دولت کدے پر حاضری ہوتی تھی۔ پھر جب مدرسۃ العربیہ الاسلامیہ کے قیام کا ارادہ ہوا تو حضرت مولانا نے ازراہ شفقت مجھے بھی استخارہ کرنے کی سعادت بخشی۔ پھر میں حیدرآباد آ گیا لیکن حج کے کئی سفر ان کی ہم رکابی میں نصیب ہوئے۔

حضرت مولانا کو ملکی مسائل سے بھی خاص تعلق رہا ہے لیکن صرف اسی حد تک جہاں تک کہ دین ان سے متاثر ہوتا تھا۔ چنانچہ مجھے کبھی کبھی حیدرآباد سے کراچی بھی طلب فرمایا ہے۔ ایک مرتبہ یوں بھی شفقت فرمائی کہ اب تم حیدرآباد چھوڑ کر ہمارے پاس آ جاؤ اور اس کو چلاؤ۔ پھر جب ہمارے ملک میں لسانی ہنگامے کرائے گئے اور بعض علماء نے یہاں تک

فرمایا کہ ہندوستان سے آنے والوں کو چاہئے کہ جو کچھ انہوں نے یہاں کمایا ہے وہ سب مقامی حضرات کو دے دیں تو حضرت مولانا کو بہت قلق ہوا اور وہ کراچی سے حیدرآباد تشریف لائے، مجھے بھی طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اس فتنے کو روکنے کے لئے تمہارا کیا مشورہ ہے؟

حضرت مولانا کو چونکہ اپنے جد اعلیٰ حضرت آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ نقشبندیہ سے بھی وابستگی تھی اس لئے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہٗ کے عرس مبارک پر ان کو دعوت عرض کی جاتی تھی۔ ۱۹۷۶ء کے عرس مبارک پر انہوں نے تقریر بھی فرمائی تھی لیکن پھر دوسرے سال انہوں نے معذرت فرمائی اور یہ گرامی نامہ لکھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گرامی قدر محترم حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب زیدت معالیہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے اس دفعہ آپ کی بابرکت مجلس میں حاضر نہ ہو سکنے کا افسوس ہے۔ کچھ ہفتوں سے اتوار کے روز کو دماغی توازن کو صحیح رکھنے کے لئے گوشہ تنہائی میں گزارنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ آج اتفاق سے ۱۱۔۱۲ تک کا وقت ایک جگہ مدرسہ ومسجد کی بنیاد رکھنے کے لئے گلشن اقبال میں دیا تھا۔ جو مکان گوشۂ تنہائی کے لئے تجویز کیا ہے وہ وہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں انتظار رہتا ہے۔ ٹیلی فون بھی نہیں۔ دراصل بزرگوں کی ''تجدید ذکری'' کے لئے تاریخ کا تعین میرے مسلکی ذوق کے خلاف بھی ہے، مجھے امید ہے کہ آپ میری ان معذوریوں کی وجہ سے معاف فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

ولکم الشکر الجزیل

والسلام محمد یوسف بنوری عفا اللہ

حضرت مولانا کی وفاتِ حسرت آیات کی ایک تاریخ تو اوپر ہی سورۃ یوسف سے حاصل کی ہے اور اس قطعۂ تاریخ میں بھی ایک مصرع ہجری اور دوسرا عیسوی (کامل الاعداد) عرض کیا ہے:

آہ بگذشت شہیرِ عالم
علمِ دیں را نماندہ ہست شباب

فخرِ علماء و نازشِ عرفاء

مزرعِ خشکِ قوم راچو سحاب

''جانِ خلد است محمد یوسف''

۷ ۹ ۳ ۱ ھ

''عزتِ فضل، ماہ عالمتاب''

۷ ۹ ۷ ۱ ء☆

☆انعمت علیہم۔ص۴

مولانا ابوالفتح صغیر الدینؒ

حضرت مولانا پروفیسر ڈاکٹر ابوالفتح صغیر الدینؒ اپنے خاندان اور احباب کے لئے باعث فخر تھے۔ آپ گوپی چک (ضلع پورنیہ، بہار) میں جہاں ان کے والد (محمد نظیر الدین ابنِ امیر علی) بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے ۱۱ نومبر ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ لیکن جلد ہی آپ کا پورا خاندان اپنے آبائی گاؤں بھنڈاری (بہار شریف، ضلع پٹنہ) منتقل ہوگیا۔ وہاں ابتدائی تعلیم آپ نے والد صاحب ہی سے حاصل کی جو خود بھی معلم رہ چکے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں مدرسہ عزیزیہ (بہار شریف) میں داخل ہوئے۔ ابتدائی درجوں میں مختلف اساتذہ کی خدمت میں رہے۔ پھر وہاں کے مختلف اساتذہ مولانا محمد ابراہیم معقولی، محدث محمد یوسف، مفسر محمد ریاض احمد، مولانا حنیف احمد اور ادیب مولانا عبداللہ ملک (رحمہم اللہ) کے زیر تعلیم رہے۔

۱۹۴۳ء میں عام علومِ دینیہ وغیرہ کا امتحان دے کر عالم کی سند حاصل کی۔ وہیں آپ نے حدیث کا شعبہ اختیار کر کے ۱۹۴۵ء میں ''فاضل حدیث'' کی (درجہ اول میں) سند حاصل کی۔ پھر بہار شریف کی درس گاہ میں عربی اور فارسی پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصے کے لئے مدرسۂ محمدیہ اور مدرسۂ عزیزیہ میں بھی مدرس رہے۔ ساتھ ہی موخر الذکر مدرسے میں لائبریرین کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔

علومِ دینیہ کے ساتھ آپ نے انگریزی بھی پڑھنی شروع کی۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں آپ نے پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ پھر ریلوے کی

میل سروس RMS میں ملازمت اختیار کی۔ لیکن وہ ملازمت آپ کے مزاج کے خلاف تھی اس لئے استعفیٰ دیدیا۔ اور ۱۹۵۱ء میں والدین کے ساتھ سابقہ مشرقی پاکستان کے راستے سے کراچی آگئے۔ یہاں بھی آپ نے اپنے علمی ذوق کو قائم رکھنے کے لیے ۱۹۵۳ء میں پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل کے امتحان میں شرکت کی اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پھر ۱۹۵۵ء میں صرف انگریزی کا امتحان پاس کرکے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۵۵ء میں لینگویج ٹیچر کی حیثیت سے آپ نے گورنمنٹ ہائی اسکول جیکب لائن کراچی میں ملازمت اختیار کی۔ اور ساتھ ہی اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۱۹۵۹ء میں ایم اے فارسی (فرسٹ ڈویژن) اور ۱۹۶۱ء میں ایم اے عربی (فرسٹ ڈویژن) پاس کیا۔

۱۹۶۲ء میں مفتی محمد مظہر بقا صاحب سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک کلچر چھوڑ کر جب کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات میں (بہ حیثیت استاد) جانے لگے تو انہوں نے شعبۂ کے صدر محترم ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ صاحب سے عرض کرکے اپنی جگہ پر آپ کو لیکچر مقرر کرادیا۔ پھر آپ نے سندھ یونیورسٹی سے ۱۹۷۱ء میں محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اور اسی شعبے میں ترقی کرکے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور کم وبیش دس سال تک اس شعبے کے صدر بھی رہے۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو ریٹائر ہوئے لیکن اپنے طور پر درس وتدریس میں مصروف رہے اور بہ کثرت طلبہ کو پی ایچ ڈی کرایا۔ بعض کو عربی درسیات سے بھی نوازا اور عزیزوں، نیز پڑوسیوں کی حتی الامکان مدد فرمائی۔

آخر عمر میں چند ماہ آپ صاحب فراش رہے۔ آپ کے صاحبزادے جو ماشاء اللہ ڈاکٹر بھی ہیں انہوں نے ہر طرح علاج ومعالجہ کیا۔ پھر کراچی کے لیاقت نیشنل ہسپتال لے گئے۔ لیکن وہاں دوسرے دن یعنی یکم جون ۱۹۹۶ء کو دن کے تین بجے اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کے پس ماندگان میں محترمہ بیوہ، پانچ صاحبزادے سہیل احمد، ڈاکٹر حافظ محمد شعیب، حافظ محسن مظفر، ڈاکٹر حافظ عبدالباسط، ڈاکٹر حافظ عبدالواسع، اور دو صاحبزادیاں ہیں۔ آپ کے چھوٹے بھائی محترم پروفیسر ڈاکٹر طاہر احمد ملک صاحب کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ

۱۔ چند برس پیش تر ان کا انتقال ہوگیا۔ (مرتب)

اسلامیات کے صدر تھے۔ اب ریٹائر ہیں۔(۱)

راقم الحروف سے مولانا ابوالفتح کے تعلقات ۱۹۵۵ء سے بہت مخلصانہ رہے ہیں۔ غالباً اسی سال آپ میرے پیرومرشد حضرت مولانا شاہ زوار حسین صاحب علیہ الرحمہ (م ۱۴۰۰ھ) سے بیعت ہوئے تھے۔ پھر جب آپ ۱۹۶۲ء میں مستقل طور پر حیدرآباد تشریف لے آئے تو یہ تعلقات روز افزوں ہوئے۔ شعبہ اسلامک کلچر و تقابل ادیان آپ کا شعبہ تھا لیکن کلاس لینے کے بعد آپ اکثر ہمارے شعبۂ اردو میں آجاتے تھے۔ اسی لیے محترم ڈاکٹر ہالی پوتہ صاحب مذاق میں فرماتے تھے کہ وہ اپنے شعبہ اردو میں گئے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر ہالی پوتہ صاحب اور پروفیسر علی نواز جتوئی صاحب (صدر شعبۂ سندھی) کو ہم لوگوں سے اس قدر محبت تھی کہ ہر روز آپس میں ملاقات کیے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ مولانا ابوالفتح صاحب کو خصوصی طور پر ہم لوگوں سے بہت تعلق رہا۔ ہنسی مذاق کے بغیر کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر خان رشید، ڈاکٹر سخی احمد ہاشمی، ڈاکٹر سید نعیم ندوی (افسوس کہ سب رخصت ہوگئے) آپ کو گھیرے رہتے تھے اور سب کے سب آپ کی بذلہ سنجی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر خان رشید نے کہا کہ مولانا آج آپ کو میرے اسکوٹر پر بیٹھنا پڑے گا۔ (مولانا اس وقت تک کسی اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر نہیں بیٹھے تھے) آپ جو نہی سیٹ پر بیٹھے ڈاکٹر خان رشید نے تیزی سے اسکوٹر کو بھگایا۔ مولانا کہتے رہے کہ ارے روکنا، لیکن خان رشید اپنی حرکت سے باز نہیں آئے اور پورا راستہ بہت تیزی سے طے کرایا۔

ایک دن جام شورو سے ڈاکٹر خان رشید نے آپ کو اسکوٹر پر بٹھایا اور کوٹڑی کی طرف سے سنسان راستے پر روانہ ہوئے۔ جب وہاں کوئی شخص نظر نہیں آیا تو اسکوٹر کو روک کر مولانا کو اس پر سے اتارا اور چاقو نکال کر آپ سے کہا کہ ''مولانا، بہت گڑبڑ کرتے ہو، اب بتاؤ کیا کرلو گے؟ تمہاری خبر لیتا ہوں۔'' بناوٹی غصے کا اظہار کیا۔ مولانا اس غیر معمولی رویے سے پہلے تو کچھ گھبرائے، پھر دونوں قہقہے لگانے لگے۔ اس طرح کا مذاق ہمارے شعبۂ اردو میں ہوتا ہی رہتا تھا۔ سب سے زیادہ سخی احمد ہاشمی آپ کو چھیڑا کرتے تھے۔ افسوس کہ سب کے سب اللہ کو پیارے ہوئے اور ہماری محفلیں ویران ہوگئیں۔ اب تو بقول راسخ دہلوی۔

داغِ دل جل رہا ہے بے روغن

یہ طلسمی چراغ ہے کس کا؟

آپ کے انتقال سے ۴۔۵ دن پہلے حاضر ہوا تو نقاہت کی وجہ سے آپ کچھ نہ بول سکے۔ لیکن آنکھوں میں آنسو جاری تھے۔ میں نے کہا کہ مولانا آپ سے میں نے وعدہ لیا تھا کہ آپ میری نمازِ جنازہ پڑھائیں گے۔ لیکن اب آپ یہ کیا کررہے ہیں؟

عرفی نے سچ کہا ہے:

نہ گنجد نورِ خورشیدِ ازل در ظرفِ ہر دیدہ
بہ آبِ دیدۂ مرداں نگر تا عکسِ آں بینی

راقم الحروف آپ کے احسانات کے بار سے دبا ہوا ہے۔ بہ کثرت مواقع پر آپ سے علمی مشورہ کیا کرتا تھا۔ محمد ہاشم کشمی رحمۃ اللہ علیہ (حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خلیفہ) کی زبدۃ المقامات کا اردو ترجمہ میرے ذمے تھا اس کے ۳۔۴ ابواب کا آپ ہی نے ترجمہ کیا تھا۔ پھر کسی بات پر مجھے آپ ''استاذی'' لکھا کرتے تھے۔ آہ، میں کچھ بھی نہ کرسکا۔

میں نے اپنی ریڈیائی تقاریر کا ایک مجموعہ آپ کے نام ''مُعنون'' کیا تو کیا کیا؟ میرے چھوٹے داماد ڈاکٹر آفتاب احمد خان نے آپ کے احسانات کے اعتراف میں اپنی کتاب ''اولیائے نقشبندیہؒ کی علمی خدمات'' آپ کے نام معنون کی تھی۔ لیکن آپ کا ایک بہت بڑا احسان ہے کہ آپ نے میرے پوتے حافظ منیر احمد خان سلمہ کو عربی درسیات کی کئی کتابیں لفظ بہ لفظ پڑھائی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کا اجر دے سکتا ہے؟

مولانا کیا گئے کہ ہماری محفل ویران ہوگئی۔ کاش آخرت میں راقم الحروف ان کے طفیلیوں میں شامل ہوجائے۔ آمین

صد افسوس آج دنیا میں نہیں ہیں
وہ جن سے تھی ہماری محفل آباد
نہایت پاک طینت، پاک سیرت
بہ غایت متقی و فخرِ زُہاد
علومِ دینیہ میں تھے وہ یکتا
علومِ دنیوی بھی تھے بہت یاد

معلم، ہم محقق، ہم مدقق
یقیناً نازشِ اسلافِ امجاد
بہت ہی خوش مزاج وخوش بیاں تھے
سبھی کے واسطے نعمت خداداد
خدا نے ہر طرح ان کو نوازا
عطا کی ہے بہت ہی نیک اولاد
ہمیشہ مطمئن تھے اس جہاں میں
رہیں جنت میں بھی وہ شاد ہی شاد
لک فتح مبینا رمزِ ابوالفتح
۷ ۱ ۴ ۱ھ
صغیر الدین محمد بالیقیں شاد
۶ ۹ ۹ ۱ء
شنبہ ۱۴ محرم الحرام ۱۴۱۷ھ، یکم جون ۱۹۹۶ء☆

☆انعمت علیہم۔ ص ۱۲

باب ششم

زعما

مخدومی نواب حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ

علی گڑھ کے قرب وجوار میں بھیکم پور، دادوں، حبیب گنج، بھموری، دھرم پور، چھتاری وغیرہ بڑی بڑی جاگیریں تھیں جو شروانی خاندان اور اس کے قریبی عزیزوں سے متعلق تھیں۔ نواب حبیب الرحمٰن خان اسی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ آپ ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اور اپنے وقت کے مشاہیر علماء سے دینی درسیات کی تکمیل کی۔ انگریزی میں خاص دست گاہ حاصل کی بلکہ بعض انگریز اساتذہ سے انگریزی میں تحریر وتقریر کی مشق بھی کرتے رہے اور حضرت فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی علیہ الرحمہ (م ۱۳۲۵ھ) سے نقشبندی سلسلے میں بیعت ہوئے۔ حج کے موقع پر مدینہ منورہ میں تجوید وقرأت کی سند بھی حاصل کی تھی۔

۱۳۲۵ھ میں آپ کو حیدرآباد (دکن) میں صدر الصدور کا عہدہ ملا۔ اسی سال غرۂ ذی الحجہ میں جامعہ عثمانیہ کا قیام ہوا اور آپ اس کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ تیرہ سال حیدرآباد میں قیام ہوا اور وہیں آپ کو ''صدر یار جنگ بہادر'' کا خطاب ملا۔ وہاں آپ نے امورِ شرعیہ، توسیعِ مساجد، مدارسِ حفاظ، ۔احترام ماہ صیام، اصلاحات مسلخاں، اہتمام برائے حجاج وغیرہ کاموں میں خصوصی دل چسپی لی۔

حیدرآباد سے وطن آنے پر آپ نے مختلف تعلیمی اور دینی اداروں کی امداد فرمائی اور تعلیمی معیار کو بلند کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے آپ کی علمی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۴۳ء میں آپ کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی۔ آپ نے مسلم لیگ اور قائداعظم محمد علی جناح کا آخری وقت تک ساتھ دیا اور معاونت فرمائی۔

حبیب گنج میں آپ کے ذاتی کتب خانے میں قریب سات ہزار مخطوطات تھے جن

میں سے متعدد ایسے بھی تھے جو مصنفین کے قلم سے مرتب ہوئے تھے۔ مطبوعات بے شمار تھیں جو کتب خانے کی وسیع عمارت میں بہ مشکل رکھی جاتی تھیں۔ آپ نے بہ کثرت مقالے اور کتابیں مرتب کیں۔ چند نام یہ ہیں:

اسلامی اخلاق، پیغامِ رحمت تبصرہ بر تاریخ خطیب بغدادی، تذکرۂ بابر، ذکرِ جمیل، ذکرِ حبیب، ذکرِ محبوب، حالاتِ حزیں، میر درد، سرسید کی یاد، فقہِ حنفی، قرۃ العین (حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے حالات)۔ مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا نصب العین، علمائے سلف، نابینا علماء، مقدمۂ مثنوی لیلیٰ و مجنون وغیرہ۔

فارسی اور اردو میں شعر بھی لکھتے تھے اور حسرت تخلص فرماتے تھے۔

تحریر و تقریر میں بڑی فاضلانہ شان تھی اور ایسی نکتہ رسی تھی کہ حیرت ہوتی تھی کہ بڑے بڑے فضلا کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی تھی۔

مسلم یونیورسٹی میں جتنے علماء اور دینی مدرسین کا تقرر ہوتا تھا نواب صاحب کا مشورہ اور فیصلہ مقدم سمجھا جاتا تھا۔

نواب صاحب کے خاص تعلق والے حضرات میں مولانا شبلی، مفتی عبداللطیف، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سلیمان اشرف، مولانا ابوبکر محمد شیث جون پوری (رحمہم اللہ) تھے اور جب تک نواب صاحب علی گڑھ میں قیام فرماتے اکثر و بیشتر مولانا سلیمان اشرفؒ اور مولانا ابوبکرؒ کے ساتھ علمی مباحث میں شریک ہوتے اور سب ایک ساتھ جامع مسجد میں نماز کے لئے تشریف لے جاتے۔

نواب صاحب نہایت خوب صورت، نہایت خوب سیرت تھے پاکیزہ اوصاف اور پاکیزہ اخلاق والے محاسن میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ علم دوست اور علم پرور تھے اور کبھی کسی سائل کو رد نہیں فرماتے تھے۔ آپ نے انتقال سے پہلے اپنا پورا کتب خانہ، مسلم یونیورسٹی کو وقف فرما دیا تھا۔

راقم الحروف ۱۹۳۶ء تک علی گڑھ میں زیرِ تعلیم رہا۔ ۱۹۳۷ء میں پبلک سروس کمیشن نے کنگ ایڈورڈ کالج، امراؤتی (برار) میں استادِ اردو کی حیثیت سے میرا تقرر کر دیا۔ پھر استاذی پروفیسر ضیاء احمد بدایونی مرحوم نے مجھے سید حسن غزنوی (م ۵۵۶ھ) پر کام کرنے

کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ہندوستان کے متعدد کتب خانوں کی سیر کی۔ جب نواب صاحب کو حبیب گنج خط لکھا تو انہوں نے مجھے بلا کر اپنا پورا کتب خانہ میرے مطالعے کے لئے کھول دیا۔ متعدد مخطوطات دیکھے۔ سید حسن غزنوی کے کئی غیر معروف معاصرین کا کلام بھی دیکھا جس سے اس شاعر کے علاوہ اس کے ممدوح سلطان بہرام شاہ غزنوی کی تاریخ مرتب کرنے میں بڑی مدد ملی۔ رام پور وغیرہ بھی اسی زمانے میں گیا۔ لیکن نواب صاحب کی فراخ دلی کا کہیں جواب نہ تھا۔ نواب صاحب ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔ پھر دن بھر کے کام کی تفصیل دریافت فرماتے تھے۔ آٹھ دس دن کام کر کے امراؤتی واپس ہوا تو ایک فاضل کا خط ملا کہ اس شاعر پر کام کرنا بہت مشکل ہے۔ میری دل شکنی ہوئی تو نواب صاحب کو خط لکھا۔ انہوں نے ۲۶ نومبر ۱۹۳۸ء کو بہت شفقت سے مجھے یہ جواب دیا۔

کنگ ایڈورڈ کالج، امراؤتی

عزیز القدر سلمہ   السلام علیکم

کارڈ پہنچا۔ علالت پر تاسف، صحت پر مسرت ہوئی۔

ارادے کے تذبذب کا حال پڑھ کر تعجب ہوا۔ جنہوں نے دوسرا مشورہ دیا ان کا خیال صحیح نہیں۔ ہرگز خیال نہ بدلنا۔ ورنہ ہمیشہ مشکلات سے گھبرا کر منہ موڑو گے اور یہ زندگی کی شکست ہے۔ جو کام کر رہے ہو استقلال سے اللہ تعالیٰ پر بھروسا کر کے کئے جاؤ۔ کامیابی مبارکباد دے گی۔ اپنی ہی یونیورسٹی سے ڈگری لو۔

سید حسن غزنوی پر مقالہ لکھنا مردانہ کام ہے۔ پس مرد بنو جیسے کہ ہو۔ کیا رام پور کے نو ورقوں میں کلام سے یہاں کے ذخیرہ کا کلام مختلف ہے؟ عرشی صاحب کو نقل کے واسطے لکھتا ہوں۔

برٹش میوزیم اور انڈیا آفس سے عکس منگواؤ۔ کار برآری کے بعد یہاں بھیج دینا۔ عکس کے مصارف بھیج دئے جائیں گے۔ تمہاری محنت کی یادگار یہاں بھی رہے گی۔

میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ ارادہ نہ بدلنا۔

الحمد للہ خیریت ہے۔ سب کو سلام، عید مبارک۔

امید ہے کہ اب مزید قوت و صحت حاصل ہوئی ہوگی۔

مکرمی مولوی عبدالقادر صاحب (۱) کو سلام شوق۔

حبیب گنج۔ (محمد حبیب الرحمن خان)

(۲۶ نومبر ۱۹۳۸ء)

اس گرامی نامے سے کس قدر خلوص اور کس قدر شفقت ظاہر ہوتی ہے جو ان کی علم پروری کی دلیل ہے۔ اس ہمت افزائی کے بعد میں نے اسی شاعر پر کام جاری رکھا اور لندن اور پیرس سے شاعر کے کلام کے عکس منگوائے اور پورے ملک کے متعدد کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ ۱۹۳۹ء میں پھر حبیب گنج حاضر ہوا اور اسی طرح کی سابقہ شفقتوں سے مستفیض ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں بھی بعض مخطوطات کے لئے ایک بار پھر حبیب گنج جانے کا ارادہ کیا تو نواب صاحب نے لکھا کہ جن مخطوطات کو تم دیکھنا چاہتے ہو ان کے نام لکھو۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۲۸ نومبر ۱۹۴۰ء سے پونا میں ہونے والی ہے، تم بھی پونا آجاؤ اور وہاں مقالہ بھی پڑھو اور میرے ساتھ قیام بھی کرو۔ میں تمہارے لئے وہاں مخطوطات لیتا آؤں گا۔ سبحان اللہ، کیا شفقت تھی۔

نواب صاحب 108 Koregoan Park, camp, poona میں قیام فرما تھے۔ مجھے اپنے پاس ٹھہرایا اور وہ مخطوطات مجھے عنایت فرمائے۔ کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں نواب صاحب مجھے اس طرح لیے پھرتے تھے کہ جیسے میں ان کی اولاد تھا۔ (مجھ حقیر پر ایسی شفقت۔ اللہ اللہ)۔ نواب صاحب علم پروری اور غریب پروری میں جواب نہیں رکھتے تھے۔

نواب صاحب کے متعدد خطوط راقم الحروف کے پاس موجود ہیں جن میں ہمت افزائی کے کلمات ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد مستقل طور پر میں کراچی آگیا تھا اور اسلامیہ کالج

۱۔ اس وقت راقم الحروف امراؤتی کالج میں تھا۔ خان بہادر عبدالقادر صاحب وہاں کے مشہور وکیل اور بڑے مخیّر بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس انہی کی کوششوں سے امراؤتی میں منعقد ہوئی تھی اور نواب صاحب وہاں تشریف لے گئے تھے۔ ایک بار جب میں علی گڑھ جا رہا تھا تو خان بہادر مرحوم نے نواب صاحب کو سلام کہلایا اور حافظ کا یہ شعر پڑھا

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی

بیاد آر حریفانِ بادہ پیمارا

جو نیا نیا قائم ہوا تھا اس میں میرا تقرر بھی ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں نواب صاحب کا ایک خط اس طرح آیا۔

حبیب گنج۔ علی گڑھ

۲۹ جنوری ۱۹۴۹ء

گرامی قدر سلمہٗ

ابھی کارڈ پڑھا۔ خوش ہوا۔

اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ من خوش کردی

یہ محض وقتی بات نہیں۔ جدا لکھتا ہوں کہ کسی موقع پر رخصت لے کر یہاں آجاؤ۔ ہم باہم مل کر کتب خانے پر نظر ڈالیں۔ شاہجہاں کے عہدِ انزوا پر نگاہ کرو۔ ایک نایاب کتاب اور ذخیرہ یہاں موجود ہے۔ ایک یادگار قائم ہو جائے۔

اس پر غور کر کے جواب لکھو۔ جہاں تک ممکن ہو مستعد ہو جاؤ۔

والدعا۔ محمد حبیب الرحمٰن خان

کراچی، اسلامیہ کالج بہ مطالعۂ عزیز القدر غلام مصطفیٰ خان سلمہٗ۔

پھر کچھ دنوں کے بعد علی گڑھ کے ارشاد بک ڈپو کے مالک مجھے کراچی میں ملے اور کہنے لگے کہ نواب صاحب بہت بیمار ہیں۔ میں نے فوراً ان کی مزاج پُرسی کے لئے خط لکھا۔ نواب صاحب نے جواب میں لکھا:

''عزیز القدر سلمہٗ۔ السلام علیکم

تمہارا خط ملا۔ تم سے کس نے کہا کہ بیمار ہوں؟ بفضلہٖ تعالیٰ میں بالکل اچھا ہوں۔

اس گرامی نامے کے بعد ان کا کوئی اور گرامی نامہ نہیں آیا۔ اور افسوس کہ وہ جمعہ ۲۶ شوال ۱۳۶۹ھ (۱۱ اگست ۱۹۵۰ء) کو ہم سے جدا ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

راقم الحروف نے تاریخ لکھی تھی۔

عالمِ صدر نشیں، فیضِ دہور

۱۹۵۰ء

بحرِ زخّار حبیب الرحمٰن

۹ ۶ ۳ ۱ ھ

جمعہ ۱۱، اگست ۱۹۵۰ء، ۲۶ شوال ۱۹۶۹ء

قطعۂ تاریخ کے دوسرے اشعار محفوظ نہیں۔ راقم الحروف نے ایک کتاب ''باقیاتِ باقیؔ'' آپ کے نام معنون کی ہے اور اس کے ساتھ امیر خسروؔ کا یہ شعر بھی ہے:

بہارِ من ز جُنبیدانِ صبا خفت است
بگوی بہرِ دلم کای صبا کجا خفت است

یہاں تک لکھنے کے بعد نواب صاحب کے چند خطوط اور مل گئے۔ اگر ان کو نقل نہ کروں گا تو میں اپنی محرومی سمجھوں گا۔ وہ خطوط یہ ہیں:

(۱)

حبیب گنج کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراوتی

۵ جولائی ۴۰

گرامی قدر سلمہٗ السلام علیکم

انگریزی مقالہ ولی ویلوری کی بابت پہنچا۔ متعدد مقامات سے پڑھا۔ شاباش، تمہاری محنت سے اردو ادب کی تحقیقات میں نیا اضافہ ہوا۔ ولی ویلوری سے بہت کم لوگ واقف ہیں، اسی لئے ولی اورنگ آبادی ان کے کلام کے بھی مؤلف مان لئے جاتے ہیں۔

محمد حبیب الرحمٰن خان

(۲)

حبیب گنج کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراوتی

۷ مارچ ۱۹۴۲ء

گرامی قدر سلمہٗ السلام علیکم

ولی کا دیوان قلمی آ گیا۔(۲) تمہاری سعادتِ مزید سے مزید مسرت حاصل ہوئی۔ اس عرصے میں طبیعت نادرست رہی۔ اسی لئے اس رسید میں دیر ہوئی۔ اب بھی زیادہ لکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ ماسٹر سید مظہر علیم صاحب (۳) نے دیوان پر کام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

محمد حبیب الرحمٰن خان

(۳)

حبیب گنج کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراوتی

۱۲ مئی ۱۹۴۲ء

گرامی قدر سلمہٗ السلام علیکم

کل کارڈ ملا۔ علالت کی خبر سے افسوس ہوا۔ صحت وقوت کی دعا ہے۔

بفضلہٖ تعالیٰ میں اب بخیر ہوں۔ صحت درست ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

تمہارا مقالہ پڑھنے کا برابر اشتیاق ہے۔ خیریت سے پورا ہو۔

ٹونک میں نواب عبدالرحیم خان صاحب مرحوم کا کتاب خانہ بہت جامع تھا۔ اب معلوم نہیں کیا حال ہے۔ مولانا حیدر حسن خان صاحب صدر مدرس مدرسۂ ریاست سے میرے حوالے سے مراسلت کر سکتے ہو۔ مولانا انشاء اللہ اطمینانی جواب دیں گے۔ ڈگری کا فلسفہ ہنوز سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ خاکی پر تمہارا مضمون معارف میں شوق سے پڑھا تھا۔

محمد حبیب الرحمٰن خان

۲۔ بھوپال میں ولی کا یہ دیوان ایک کتب فروش سے حاصل کیا۔ وہ نواب صاحب کے کتب خانے کے لئے پیش کر دیا تھا۔ بعد میں افضل جھنجھانوی کی بکٹ کہانی اور خلاصۃ الاخبار کا قلمی نسخہ بھی خدمت میں بھیجا تھا۔

۳۔ سید مظہر علیم صاحب، نواب صاحب کے کتب خانے کے ناظم تھے۔ انہوں نے فارسی اور اردو شعر کے کلام کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔

(۴)

حبیب گنج مارِس کالج۔ ناگ پور

۲۲ اگست ۱۹۴۷ء

عزیزم سلمہٗ۔ عید مبارک تم کو بھی۔ کارڈ پہنچا۔ تبادلے (امراوتی سے ناگ پور) کا حال معلوم ہوا۔ استقلال سے کام لو۔ گرم و سردِ زمانہ کا تجربہ مردانہ کرو۔ میری نظر میں کوئی جگہ نہیں، اس لئے کہ تعلق نہیں۔ تم پتا لگاؤ، مجھ کو بتاؤ۔ کوشش میرا کام ہوگا۔

بعونہٖ تعالیٰ وحولہٖ۔

للہ الحمد ہمہ عافیت طالبِ عافیت۔ محمد حبیب الرحمٰن خان

بہ مطالعۂ گرامی قدر عزیز غلام مصطفیٰ خان۔ ایم اے، پی ایچ ڈی، صدر شعبۂ اردو۔

(افسوس کہ۔ آں قدے بشکست وآں ساقی نماند) ☆

☆ طوبیٰ البم: ص ۳۲

علامہ آئی آئی قاضی

۱۹۵۶ء میں سندھ یونیورسٹی کے رجسٹرار صاحب کا خط مجھے کراچی میں ملا کہ علامہ صاحب آپ سے فلاں تاریخ کو ملنا چاہتے ہیں۔ میں حاضر ہوا تو سلام کے بعد علامہ صاحب نے فرمایا کہ ''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی جو آپ یہاں آجائیں گے۔'' میں نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں۔ محترم ڈاکٹر ہالی پوتہ صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے آرڈر ملا کہ آپ کو پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی جگہ (ایک اضافے کے ساتھ) دی جاتی ہے۔ میں شکریہ ادا کرنے کے بعد کراچی آیا۔ لیکن چند روز کے لئے ہندوستان جانا تھا تو وہاں سے واپسی پر یونیورسٹی میں حاضری دی۔ اس واقعے سے چند ماہ پہلے علامہ صاحب نے مجھے یہاں کے چند نصابات تیار کرنے کے لیے طلب فرمایا تھا اور انہیں پسند فرمایا تھا۔ گویا اس وقت علامہ صاحب سے پہلی ملاقات کا موقع حاصل ہوا تھا۔

بحمدللہ جب حیدرآباد آکر چارج لیا تو پہلے دن اور پہلی فرصت میں پروفیسر علی نواز جتوئی صاحب (صدر شعبۂ سندھی) مجھ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ ان کی محبت اور اخلاص نے مجھے بہت متاثر کیا۔ پھر تعلقات بڑھتے گئے۔ گھروں میں آنا جانا بھی شروع ہوا۔ اور ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ان کی معیت میں مجھے سندھ کے چپے چپے کے اولیائے کرامؒ کے مزارات پر حاضری نصیب ہوئی۔ محترم ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ صاحب، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب، ڈاکٹر نبی بخش قاضی صاحب، ڈاکٹر محمد علی قاضی صاحب اور رضا محمد بھٹو صاحب (خازن) وغیرہ سب ہی نے بڑا کرم فرمایا۔ پھر وقتاً فوقتاً علامہ صاحب کے دردولت پر بھی حاضری حاصل رہی۔ بڑی شفقت فرماتے تھے بلکہ بعض اساتذہ کے تقرر کے لئے مجھے یاد فرماتے تھے۔ ان کی شفقت

علامہ آئی آئی قاضی

۱۹۵۶ء میں سندھ یونیورسٹی کے رجسٹرار صاحب کا خط مجھے کراچی میں ملا کہ علامہ صاحب آپ سے فلاں تاریخ کو ملنا چاہتے ہیں۔ میں حاضر ہوا تو سلام کے بعد علامہ صاحب نے فرمایا کہ ''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی جو آپ یہاں آجائیں گے۔'' میں نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں۔ محترم ڈاکٹر ہالی پوتہ صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے آرڈر ملا کہ آپ کو پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی جگہ (ایک اضافے کے ساتھ) دی جاتی ہے۔ میں شکریہ ادا کرنے کے بعد کے بعد کراچی آیا۔ لیکن چند روز کے لئے ہندوستان جانا تھا تو وہاں سے واپسی پر یونیورسٹی میں حاضری دی۔ اس واقعے سے چند ماہ پہلے علامہ صاحب نے مجھے یہاں کے چند نصابات تیار کرنے کے لیے طلب فرمایا تھا اور انہیں پسند فرمایا تھا۔ گویا اس وقت علامہ صاحب سے پہلی ملاقات کا موقع حاصل ہوا تھا۔

بحمد للہ جب حیدرآباد آکر چارج لیا تو پہلے دن اور پہلی فرصت میں پروفیسر علی نواز جتوئی صاحب (صدر شعبۂ سندھی) مجھ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ ان کی محبت اور اخلاص نے مجھے بہت متاثر کیا۔ پھر تعلقات بڑھتے گئے۔ گھروں میں آنا جانا بھی شروع ہوا۔ اور ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ان کی معیت میں مجھے سندھ کے چپے چپے کے اولیائے کرامؒ کے مزارات پر حاضری نصیب ہوئی۔ محترم ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ صاحب، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب، ڈاکٹر نبی بخش قاضی صاحب، ڈاکٹر محمد علی قاضی صاحب اور رضا محمد بھٹو صاحب (خازن) وغیرہ سب ہی نے بڑا کرم فرمایا۔ پھر وقتاً فوقتاً علامہ صاحب کے درِ دولت پر بھی حاضری حاصل رہی۔ بڑی شفقت فرماتے تھے بلکہ بعض اساتذہ کے تقرر کے لئے مجھے یاد فرماتے تھے۔ ان کی شفقت

ایک روحانی باپ کی طرح تھی۔ میرے بچوں کے لئے مٹھائی بھیجا کرتے تھے۔ کبھی ان کے لئے کپڑے بھی بھیجے ہیں اور عزیزوں کی حیات و ممات پر پوچھنا اور تسلی دینا ان کا عام شیوہ تھا۔

عرصے کے بعد جب یونیورسٹی سے ان کی وابستگی نہ رہی اور ایک صاحب کے آجانے سے مجھے بہاول پور یونیورسٹی جانے کا خیال ہوا تو علامہ صاحب کو افسوس ہوا اور مجھے صبر کی تلقین فرمائی۔

Mother Elsa بھی بڑی شفقت فرماتی تھیں۔ میری موجودگی میں انہوں نے فرمایا تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سب انبیاء سے افضل ہیں۔ ایک انگریزی نظم میں انہوں نے اسی طرح کا مضمون لکھا ہے۔ ان کا انتقال ہوا تو حیدرآباد میں ٹنڈو یوسف کے قبرستان میں ان کو دفن کیا تھا۔ ایک دن علامہ صاحب ان کے مزار پر مجھے لے گئے تھے۔ پھر جب علامہ صاحب کا وقت قریب آیا تو مجھ سے دریافت کیا کہ قرآن پاک میں کوئی صریح آیت ایسی ہے جو خودکشی کی ممانعت میں ہو؟ میں نے آیتیں پڑھیں تو فرمایا کہ وہ آیتیں دوسرے سلسلے کے متعلق بھی ہو سکتی ہیں۔ پھر ایک دن فرمایا کہ پانی میں ڈوبنے والوں کو تکلیف نہیں ہوتی۔ لیکن ان اشاروں سے مجھے ان کا مقصد معلوم نہ ہو سکا۔ اور دوسری باتیں ہوتی رہیں۔ بہر حال جب انہوں نے سفرِ آخرت اختیار فرمایا تو سندھ کے ایک بزرگ نے مجھ سے فرمایا کہ ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھنا چاہئے۔ میں نے عرض کیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تحقیق کے ساتھ معلوم ہو جاتا تھا (خواہ فرشتوں کے ذریعے)۔ لیکن ہم لوگوں کو تحقیق کے ساتھ معلوم نہیں کہ یہ سانحہ کس سبب سے ہوا ہے۔ بہر حال میں نے نماز جنازہ پڑھائی اور وائس چانسلر قریشی صاحب نے Mother elsa کے جسد کو بھی ٹنڈو یوسف سے لا کر علامہ صاحب کے پہلو میں دفن کرا دیا۔

یہ واقعہ ۱۳ اپریل کا تھا۔ میں گھر آ کر سو گیا تو ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ جسے عقل تسلیم نہیں کرے گی۔ وہ یہ ہوا کہ رات کو قریب ۳ بجے علامہ صاحب تشریف لائے۔ میں گرمی کی وجہ سے صحن میں سو رہا تھا۔ مجھے جگایا اور فرمایا کہ تم نے ابھی تک تہجد کی نماز نہیں پڑھی۔ میں نے وضو کیا اور نماز شروع کی تو علامہ صاحب میرے مصلے کے قریب بیٹھے رہے۔ پھر فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے۔ میرا دل بہت متاثر ہوا۔ میں ان کے لئے دعا کرتا ہوں۔

علامہ صاحب اور Mother elsa کے مزارات پر کتبے کے لئے فارسی میں

قطعاتِ تاریخ عرض کیے تھے۔ ان کی کتابت اور حکا کی بھی کرادی تھی۔ پھر جب الحاج غلام مصطفیٰ شاہ صاحب وائس چانسلر ہوئے تو انہوں نے اوراے کے بروہی صاحب نے گنبد کے اندر علامہ صاحب کی پسندیدہ آیاتِ قرآنی کو کندہ کرانے کا کام محترم ڈاکٹر ہالی پوتہ صاحب اور میرے سپرد کیا جو بحمد للہ خیر وخوبی کے ساتھ مکمل ہوا۔

علامہ صاحب نے قریب تیس سال تک لندن میں رہ کر اسلام کی تبلیغ کی تھی اور عیسائیت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ فرماتے تھے کہ بائبل کا کوئی ایڈیشن، قرآن پاک سے پہلے کا موجود نہیں ہے یعنی قرآن ہی کو دیکھ کر بائبل کو تیار کیا گیا ہے اور جو اس کے ہر ایڈیشن کو پہلے کے ایڈیشن سے زیادہ مستند کہا جاتا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ پہلے والا ایڈیشن مستند نہیں تھا۔ یعنی وہ خود اس کی تردید کر رہے ہیں۔

ایک دن قادیانیوں کا ذکر آیا تو فرمانے لگے کہ تم ان کی مساجد میں جا کر پانچوں وقت اذان دیا کرو اور وہیں نماز ادا کرو۔ اگر وہ اعتراض کریں تو ان سے کہو کہ آپ ہماری مسجد میں آئیں اور وہاں اذان دے کر نماز ادا کریں (لیکن وہ لوگ ایسا نہیں کریں گے)۔

ایک دن فرمایا کہ شاہ عبداللطیفؒ کے رسالے میں بعض لوگوں نے الحاقی کلام شائع کیا ہے اور ثابت کرنا چاہا ہے کہ شاہ صاحب سُنی نہیں تھے۔ یہ بات غلط سمجھو۔

کبھی کبھی راقم الحروف سے بعض ایسی باتیں بھی تنہائی میں فرماتے تھے جو القا کی صورت میں ہوتی تھیں۔ بعض اوقات فرماتے تھے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ پہلے ہی میں نے نوٹ کر کے رکھا ہے۔ دیکھو فلاں کتاب میں۔

محترم قاضی احمد محمد صاحب نے علامہ کے خطوط کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے اور مجھ حقیر کے مشورے پر اس کا نام The gems divine رکھا ہے اور مجھ حقیر کے کچھ معروضات (انگریزی میں) اس کے شروع میں شامل کیے ہیں۔

آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ علامہ صاحب کی خطاؤں کو معاف فرمادے۔ آمین۔ ربنا فاغفرلنا ذنوبنا وکفر عنّا سیاتنا وتوفنّا مع الابرار۔

بجاہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم☆

☆ انعمت علیہم۔ ص ۱۸

پیر الٰہی بخش مرحوم

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنے تعلیمی معیار اور قومی بے داری کے جذبے کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔ وہاں ہندوستان کے چپے چپے سے طلبہ آتے تھے۔ ایران، شمالی اور جنوبی افریقہ، الجزائر، برما اور سیلون وغیرہ کے طلبہ (بلکہ گرلز کالج میں طالبات بھی) پہنچتے تھے۔ وہاں بڑے بڑے علماء، ادبا، شعرا اور ہر فکر کے لیڈر بھی آتے رہتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، گاندھی، نہرو، مولانا ظفر علی خان، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ثناء اللہ امرت سری، مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال، حفیظ جالندھری اور پورے ملک کے بڑے چھوٹے شعرا بھی مختلف تقاریب میں شرکت کرتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے تُرک امیر البحر رؤف بے، بلکہ کبھی افغانستان اور ایران کے حکمران بھی وہاں آتے تھے۔ وائس رائے اور گورنر، نیز ہندوستان کے نوّابین بھی مدعو ہوا کرتے تھے۔ ایسی زندگی پورے برصغیر پاک وہند میں صرف علی گڑھ میں تھی اور اسی وجہ سے بالواسطہ وہاں کے طلبہ میں سیاسی اور قومی بیداری کا جذبہ سب سے زیادہ تھا۔

ہمارے پیر الٰہی بخش مرحوم بھی علی گڑھ کے مشہور طالب علم رہ چکے تھے۔ وہ مجھ سے چار سال آگے تھے۔ جنرل محمد ایوب خان مرحوم، مولانا نثار احمد ڈبائیوی اور میرے سینئر دوست ڈاکٹر خطیب ناگپوری (نواب صدیق علی خان مرحوم کے عزیز) ان کے ہم جماعت تھے۔ جنرل محمد ایوب خان کے بھائی سردار خان مجھ سے دو سال آگے تھے۔ ایسے بڑے اور مشہور حضرات مولانا حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، نواب زادہ لیاقت علی خان وغیرہ بہ کثرت لیڈر بلکہ جی ایم سید بھی وہیں کی تعلیم اور ماحول کے پروردہ تھے۔

پیر الٰہی بخش بھی قومی جذبے سے سرشار تھے اور قوم کی خدمت کا عزم لے کر علی گڑھ سے آئے تھے۔ چنانچہ مسلم لیگ کے لئے انہوں نے ہر موقع پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور وہ یقیناً پاکستان کے بانیوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ قائداعظم کے خاص معاونین میں سے تھے۔ انہوں نے سندھ کے گوشے گوشے میں مسلم لیگ کے رشتے قائم کئے۔ لوگوں میں سیاسی بے داری اور یک جہتی پیدا کی اور دامے درمے سخنے قوم کی امداد فرمائی۔ پاکستان قائم ہوا تو قائداعظم نے ان کے تعاون سے کراچی میں دارالحکومت قائم کیا۔ پیر صاحب سندھ کے وزیر اعلیٰ بھی تھے۔ انہوں نے بڑی کوشش سے کراچی میں سیکریٹریٹ کی تاسیس اور تعمیر میں بھرپور حصہ لیا۔ بندر روڈ (کراچی) پر بہت بڑی عمارت تعمیر کروائی جس میں بڑے بڑے دفتر تھے۔ پھر وہیں سندھ یونیورسٹی کی انتظامیہ کے دفاتر بھی قائم ہوئے اور سندھی ادبی بورڈ بھی وہیں قائم ہوا۔

پیر صاحب نے ۱۹۴۸ء میں ہزاروں مہاجروں کی آبادکاری کی اسکیم تیار کی اور ایک وسیع رقبے میں ان کے لئے کالونی قائم کی جس میں صرف ساڑھے چھ ہزار فی کوارٹر خرچ آیا۔ پیر صاحب نے شان دار وسیع مسجد بھی بنوائی۔ بہت بڑا موٹر اسٹینڈ بنوایا۔ کالونی کی انتظامیہ کا دفتر بھی بنوایا۔ اور مسجد کے قریب ہی اپنا مکان بنوالیا تا کہ مسجد اور مسجد والوں کی خدمت کی جاسکے۔ ظاہر ہے کہ اس وسیع پروگرام کے لئے دوسرے حضرات کے تعاون کی بھی ضرورت تھی لیکن اصل منصوبہ پیر صاحب ہی کا تھا اور انہی سے سب لوگ مشورہ لیا کرتے تھے۔

راقم الحروف بھی اسی پیر الٰہی بخش کالونی کے مکان نمبر ۳۲۸ میں مقیم تھا۔ نماز کے لئے مسجد میں حاضر ہوتا، تو پیر صاحب سے نیاز حاصل ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ان کے دولت کدے پر بھی حاضر ہوتا تھا۔ اس وقت ان کے صاحب زادے اور پوتے (جو ماشاءاللہ اب بہت معزز ہیں) چھوٹے چھوٹے تھے۔ پیر صاحب خوب صورت اور خوب سیرت تھے۔ ہمیشہ علی گڑھ والی ترکی ٹوپی (سرخ رنگ والی) پہنتے تھے تو اور بھی حسین نظر آتے تھے۔

راقم الحروف کو علامہ آئی آئی قاضی نے ازراہِ کرم سندھ یونیورسٹی میں ۱۹۵۶ء میں بلوالیا۔ اس وقت سے اب تک یہیں قیام ہے۔ لیکن جب کبھی کراچی حاضر ہوتا تو پیر صاحب سے نیاز حاصل کرتا تھا۔ غالباً ۱۹۷۲ء میں وہ سندھ یونیورسٹی کے نئے کیمپس جام شورو تشریف

لائے تو مجھے تلاش کرتے ہوئے شعبۂ اردو میں پہنچے۔ وہاں ایک صاحب کچھ سر پھرے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کوئی بات پیر صاحب سے پاکستان کے خلاف کہہ دی تو پیر صاحب کو غصہ آگیا۔ فرمایا کہ تم کیا جانو کہ ہم نے پاکستان کس طرح بنایا ہے اور کیا کیا تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ پھر وہ صاحب جو سر پھرے تھے خاموش ہو گئے اور ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

افسوس کہ پیر صاحب جیسے مخلص بزرگ اب نہیں ہیں اور جو ہیں انہیں پاکستان کی اصل حقیقت سے واسطہ بہت کم ہے۔

پیر صاحب کے انتقال پر راقم الحروف نے یہ قطعۂ تاریخ لکھا جو ان کے مزار پر (مسجد کے جنوبی حصے میں) کندہ کیا گیا ہے:

آہ بگذشت آں شہیرِ ملک و قوم
آں وزیرِ اعلیٰ آں فخرِ زماں
حُب دین و حب قوم و ملک داشت
حب پاکستان و پاکستانیاں
کرد تعمیراتِ قومی را بناء
حسنِ خلق و حسنِ سیرت را نشاں
بود ہر دم مستعد در رَدِ کفر
بود دائم حق پسند و حق نشاں
حق پسند و مخلص و ہمدردِ قوم
۵ ۹ ۳ ۱ ھ
پیر الٰہی بخش جنت آشیاں
۵ ۷ ۹ ۱ ء

سہ شنبہ یکم شوال ۱۳۹۵ھ، ۷ اکتوبر ۱۹۷۵ء

پیر صاحب کے صاحب زادے پیر شاہ نواز صاحب کے انتقال پر یہ قطعۂ تاریخ لکھا تھا:

آہ بگذشت حضرتِ مخدوم
مخلصِ قوم، ہم غریب نواز
از شرافت و از نجابتِ خویش
در رئیسانِ سندھ شد ممتاز
پدرش پیر الٰہی بخش علیگ
بر درش خیر کردہ ناز و نیاز
بود از بانیانِ پاکستان
کرد احکامِ شرع را آغاز
ہمہ اسلافِ او سراپا قُدس
ہمہ اخلاف بہرِ دین بناز
این مکرم کہ بود فخرِ تمام
با صفا، با سخا و با اعزاز
از صفا گشت داخلِ جنت
۲ ۹ ۹ ۱ ء
ہادیِ خیر پیر شاہ نواز
۲ ۱ ۴ ۱ ھ
سہ شنبہ ۲۸۔ اپریل ۱۹۹۲ء، ۲۵، اپریل ۱۴۱۲ھ☆

☆انعمت علیہم ۔ ص ۲۳

پروفیسر علی نواز جتوئی مرحوم

۱۹۵۶ء میں سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جس دن داخل ہوا تو پہلی فرصت میں پروفیسر علی نواز جتوئی (صدر شعبۂ سندھی) ملاقات کے لئے تشریف لائے اور ایسی محبت اور اخلاص سے پیش آئے کہ میں ان کا گرویدہ ہو گیا اور ان کی یہ محبت ان کے آخری ایام تک روز افزوں رہی۔

ان کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں کہ ان کے ساتھ مجھے سندھ کے چپے چپے کے اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری نصیب ہوئی۔ بھٹ شاہ، بارو چو باغ، ہالا، سیہون، قبہ شریف (ٹنڈو سائیں داد)۔ ٹکڑی شریف، ملاقاتِ یار، جھرک، مکلی، گجو، پیر پٹھو، تاج پور نصر پور، بدین، گرھوڑی شریف، میر پور خاص، قاضی احمد، مورو، سکھر، پریاں لوئے، خیر پور، شکار پور، جیکب آباد، روہڑی، پیر جو گوٹھ، گڑھی مولانا حماد اللہ، لواری شریف، لاڑکانہ، دادو، پیر بلاول وغیرہ اور ان کے قرب و جوار کے بھی بہ کثرت مزارات پر حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی بلکہ بعض مقامات پر کئی بار حاضری نصیب ہوئی اور سب کے لئے دعا کی سعادت بھی حاصل رہی۔ اسی طرح لاہور، راولپنڈی، پشاور، بالا کوٹ اور مظفر آباد وغیرہ میں بھی ساتھ رہا۔ شمالی پاکستان کے اس سفر میں پروفیسر حضور احمد سلیم اور برخوردار سراج احمد سلمہٗ بھی ساتھ تھے۔

جتوئی صاحب نے بعض رسالے تصوف سے متعلق بھی شائع کئے ہیں۔ حضرت بہاء الدین نقشبند بخاری قدس سرہٗ کے کلماتِ قدسیہ کا اردو ترجمہ۔ آسان تصوف اور حضرت پیر ایرانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں بھی انہوں نے شائع کی ہیں۔

شعبۂ سندھی اور شعبۂ اردو ساتھ ساتھ واقع تھے تو دونوں شعبوں کے اساتذہ میں باہمی محبت بھی بہت تھی۔ ہمیشہ شعبوں کے جلسوں میں شرکت رہتی اور علمی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ محترم ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ صاحب کا شعبۂ عربی اور شعبہ تقابلِ ادیان مع اسلامیات گو کہ کچھ فاصلے پر تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کی شفقتیں ہم سب پر ہمیشہ رہتی تھیں۔ اور ان کا شعبہ بھی ہمارا شعبہ کہلاتا تھا۔

جتوئی صاحب بڑے حق گو تھے۔ ایک وائس چانسلر آئے تو انہوں نے تنخواہ کے سالانہ اضافے کے لئے شرط لگادی کہ ریسرچ کا کام دکھلانا ہوگا۔ جتوئی صاحب نے دلیری سے ان سے بحث کی اور اس شرط کو ختم کرایا۔

جتوئی صاحب نے ایم اے کے علاوہ بی ٹی بھی پاس کیا تھا۔ غالباً شروع میں تھوڑے عرصے کے لئے کسی اسکول میں بھی مدرّس رہے تھے۔ پھر کالج میں اور ۱۹۵۵ء سے یونیورسٹی میں استاد رہے۔ پنشن کے بعد ملازمت میں توسیع بھی ملی تھی۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے میں کچھ عرصے کے لئے لندن کا بھی علمی سفر کیا تھا۔ بعد میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی بن گئے تھے۔

اوپر عرض کیا گیا کہ ان کو اولیاء کرامؒ سے بڑی عقیدت تھی اور سلسلۂ نقشبندیہ زیادہ پسند تھا۔ اسی لئے وہ ٹنڈو سائیں داد کے نقشبندی بزرگوں سے اپنے اسلاف کی طرح بیعت ہوئے تھے۔ پھر حضرت پیر ایرانی علیہ الرحمہ سے بیعت ہوئے اور خلافت بھی حاصل کی۔

جتوئی صاحب بہت خوش مزاج اور خوش طبع تھے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے سندھی سکھادو۔ کہنے لگے کہ کیا بڈھے طوطے بھی کچھ سیکھ سکتے ہیں؟

ایک لطیفہ ان کی زندگی کا ایسا ہے جس کو وہ اکثر سنایا کرتے تھے کہ میں ہمیشہ یہ دعا کرتا تھا کہ مدینہ منورہ جاؤں تو وہیں فوت ہوجاؤں۔ چنانچہ (غالباً ۱۹۵۱ء) میں حج کے لئے حاضری دی تو مدینہ منورہ میں تیز بخار آگیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اب وقت (فوت ہونے کا) آگیا ہے۔ تو میں نے دعا کی کہ اللہ میاں ابھی نہ مروں۔ دوبارہ جب آؤں تو مجھے یہاں موت دے دیجیے گا۔ اس کے بعد (ازراہِ دوراندیشی) دوبارہ وہاں حاضر نہ ہوا۔

یہ لطیفہ وہ ہنس ہنس کر سناتے تھے اور ہم لوگ بھی مزے لیتے تھے۔

جتوئی صاحب کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی پانی پت کے ایک خاندان میں ہوئی۔ اس شادی سے جو بچے ہوئے وہ ماشاءاللہ بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ بعد میں دوسری شادی ایک سندھی خاندان میں کی۔ اس شادی سے جو بچے ہیں وہ بھی بہت سعادت مند ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر خصوصی فضل فرمائے۔ آمین۔

جتوئی صاحب کا انتقال یک شنبہ ۲۹ ستمبر ۱۹۹۶ء۔ ۱۶ جمادی الاول ۱۴۱۷ھ کو ہوا) اور بحمد للہ اس حقیر کو ان کی نماز جنازہ پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ انہوں نے یونیورسٹی کو درخواست دی تھی کہ ان کو علامہ قاضی صاحب کے قریب دفن کی اجازت دی جائے لیکن وہ درخواست کسی سبب سے منظور نہ ہو سکی۔

جتوئی صاحب کے پیر ایرانی صاحب علیہ الرحمہ کے خطبات پر انگریزی میں ایک حقیر مضمون عرض کیا تھا۔ وہ بھی یہاں شامل کرنا بے محل نہ ہوگا۔

مضمون اس طرح ہے:

Pir-e-Irani Sahib (D.1407 / 1986) has been & renowned preacher of Islam, who had come over from Iran to India and finally settled at Hyderabad (Sindh). He had, around him,a large gathering of devotees, who used to get theoritcal and practical lessons every evening. Thanks are due to professor Ahmd Muhammad Qazi Sahib, who had translated those lessons from Urdu into English and is now presenting them in two volumes. They contain a deep study of the self, its nature, its scope and its merits. How happy will be the person who would purify his soul with them. But a sinner, like myself, (if and when) finds no solace and

perceives a yawning gap between virtue and vice, he cries out for the divine help. Sometimes, the blessings pour down from Heaven for his blooming fate, yet he is bewildered and he asks his inner soul, "Really is it so"?

This question awaites a reply for a life in the Hereafter. These lectures bear fruits for that life, no doubt.

Ghulam Mustafa Khan.☆

☆ انعمت علیم ۔ص ۲۷

باب هفتم

ادبا

ابوالعجز ساجد علی ساجد اسدی

ولادت، جے پور (۱۳۳۱ھ/۱۹۱۱ء) وفات حیدرآباد (۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء)

حضرت ساجد اسدی مرحوم مشہور اہلِ قلم تھے۔ انہوں نے نثر و نظم میں کئی بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، فارسی نثر و نظم میں بھی انہیں پوری مہارت حاصل تھی اور وہ خوش فکر اور خوش گو شاعر حضرت ''آفتابِ شعرا'' قاضی نور احمد تنویر کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔

مرحوم ساجد جے پور کے ایک ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جس میں قرآن وحدیث کے چرچے عام تھے اور اٹھتے بیٹھتے قال اللہ اور قال الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیاری باتیں اکثر سنائی دیتی تھیں اور ان کے والدین ماجدین نے گھر کا ماحول ایسا بنا رکھا تھا جس سے اپنے پرائے سب ہی مستفید ہوتے تھے اور دینی فیوض و برکات حاصل کرتے تھے۔ حضرت ساجد نے مخزن نعت مقبول ایسے زمانے میں شروع کی جب کہ وہ خاصے ضعیف ہو چکے تھے اور بینائی بھی جواب دے رہی تھی، لیکن ضمیر کہہ رہا تھا (جیسا کہ انہوں نے خود ہی کتاب کے شروع میں لکھا ہے) کہ ''عمر بھر شاعری کرتے رہے ہو۔ اس کا کفارہ ادا کرو اور اللہ تعالیٰ نے جو طبع موزوں کی نعمت عطا کی ہے اس کا شکر ادا کرو۔ شاعری کا کفارہ یہ ہے کہ حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے لکھو'' حضرت ساجد نے اسی جذبے کے تحت یہ نعتیں لکھی تھیں جن کو وہ اپنے لئے وسیلۂ مغفرت سمجھتے تھے اور بہترین مشغلہ بھی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

دن رات شعر لکھتا ہوں نعتِ رسول ﷺ کے
مصرف یہی نکالا ہے میں نے دماغ کا

انہوں نے اپنی نعتوں کے لئے غالب کی زمینیں اختیار کی ہیں، کیونکہ یہ زمینیں

عموماً شہرت رکھتی ہیں۔ لیکن ان کا اصل مذاق دینی ہے اور اکثر و بیشتر مقامات پر قرآن وحدیث ہی کی تلمیحات ہیں۔ مثلاً:

لاتقنطوا من رحمة الله ''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا'' سے یہ مضمون اختیار کیا:

تسلی دی مجھے لا تقنطوا لا تقنطوا کہہ کر
نہ جب دیکھا گیا اللہ کی رحمت سے غم میرا

حدیث الدنیا سجن المؤمن ''دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے'' سے یہ شعر اختیار کیا:

دولتِ صبر حدیثِ نبوی ﷺ نے بخشی
میں نے اس غم کدۂ دہر کو زنداں سمجھا

آیت و نحن اقرب الیہ من حبل الورید ''ہم تمہاری شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں'' سے یہ شعر متاثر ہے:

مٹ گیا خوف وخطر دل سے ہمارے ساجد
جب قریب رگ جاں ہم نے نگہباں سمجھا

وما ینطق عن الھویٰ ان ھوالا وحی یوحیٰ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کی شان ہے۔ حضرت ساجد لکھتے ہیں۔

تھا حقیقت میں کلام اس کا کلام اللہ
خود وہ قرآن بھی قرآن کی تفسیر بھی تھا

دوسرے مصرعے میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ کسی نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دریافت کیا کہ وہ کیسے تھے، تو آپ نے فرمایا کہ ''کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟''

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ''حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میں یقیناً بہترین کردار ہے''۔

وہ پیمبر بھی تھے اور مصلح اخلاق بھی تھے
ان کا ہر ایک عمل خلق کی تصویر بھی تھا

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی ہے کہ بعثت لاتمم مکارم

الاخلاق ''میں بہترین اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں'' اسی حدیث کا مضمون مذکورہ بالا شعر میں ہے۔

وما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین ''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر'' کی آیت مبارکہ سے یہ شعر ماخوذ ہے۔

اللہ کا محبوب ہو اور رحمت عالم
حضرت ﷺ کے سوا کوئی پیمبر نہ ہوا تھا

لولاک لما خلقت الافلاک ''اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو (بھی) پیدا نہ کرتا'' کا مضمون اس شعر میں ہے:

شہ ﷺ لولاک ہے باعث جہان مرغ و ماہی کا
نہ کیوں محبوب حق محبوب ہو ساری خدائی کا

ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ''عبد'' ہوں۔ یہ مضمون اس شعر میں آتا ہے:

عمرؓ آقا انہیں کہتے تھے یہ شان بلالی تھی
یہاں مفہوم ہوتا ہے عیاں بندہ نوازی کا

ایک حدیث میں ہے اشراف امتی حملۃ القران واصحاب اللیل ''میری امت میں اشراف وہ ہیں جو قرآن اٹھاتے ہیں (پڑھتے ہیں) اور رات والے ہیں (رات کو تہجد وغیرہ میں مصروف رہتے ہیں''۔ حضرت ساجد کہتے ہیں۔

مجھے تو اپنے سجدے اس لئے محبوب ہیں ساجد
کہ محبوب خدا کو پاس خاطر ہے نمازی کا

آیت قلنا ینار کونی بردا وسلما ابراہیم علیہ السلام کو نمرود نے آگ میں پھینکا تو ''اللہ نے فرمایا، اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا'' (ابراہیم پر) سے یہ مضمون لیا گیا ہے:

دوست کو آیا نظر جب جذبۂ ایثار دوست
آتش نمرود کو فوراً کیا گلزار دوست

ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ قرآن

کے منکروں کے متعلق ہے کہ "اللہ نے ان دلوں پر مہر لگا دی اور ان کے کانوں پر (بھی) اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا"۔ سے یہ مضمون اخذ کیا ہے۔

بوجہل پاس رہ کے بھی ایمان نہ لا سکا
قلب و نظر پہ مہر لگی ہو تو کیا علاج؟

لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا۔ "کسی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ پابند نہیں کیا گیا"۔ سے یہ شعر ماخوذ ہے۔

برداشت سے سوا نہیں دیتے وہ کلفتیں
دیتے ہر ایک شخص کو ہیں بار دیکھ کر

الیوم اکملتُ لکم دینکم سے یہ مضمون لیا ہوگا۔

ہوئی تھی جو خوشی خلاق کو تخلیقِ انساں سے
ہوئی تکمیل اس کی بعثتِ شاہ رسولاں ﷺ سے

قال ابوھم انی لاجد ریح یوسف "ان کے والد یعنی یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ میں بے شک یوسفؑ کی خوشبو پاتا ہوں" سے اس شعر کا مضمون ہوگا۔

یوسفؑ کی ان کو آنے لگی بوئے پیرہن
یعقوبؑ تک تو پہنچا نہ تھا پیرہن ہنوز

لا تحزن ان اللہ معنا غارِ ثور میں کافروں کی آہٹ سننے پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "فکر نہ کر، بے شک اللہ ہم لوگوں کے ساتھ ہے" سے ضرورتِ شعری کی بنا پر یوں کہا ہے:

لاتخف حضرتِ صدیقؓ سے کہتے تھے حضور ﷺ
پہنچے کفار کے جس وقت قدم غار کے پاس

والضحی والیل اذا سجی 'حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور کو ضحیٰ' سے تشبیہ دیتے ہیں اور ان کے گیسو کو لیل (رات) سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس سے یہ مضمون لیا ہوگا۔

والضحیٰ جیسے پڑھی جاتی ہو واللیل کے ساتھ
اس طرح گیسوئے سرکار ﷺ تھے رخسار کے پاس

وما ارسلنك الا كافةً للناس بشيراً و نذيراً ''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر سارے لوگوں کے لئے کافی خوش خبری سنانے والا اور اللہ کا خوف دلانے والا''۔

آپ نے تنہا زمانے کو کیا اپنا مطیع
آپ سے بڑھ کر نہیں سارے زمانے میں شجاع

هل اتیٰ اعلی الانسان حین من الدهر لم یکن شیاً مذکورا

سورۃ الدھر کی پہلی آیت ہے ''کیا انسان پر زمانے کا ایک وقت ایسا نہیں آیا جب کہ وہ جانا بھی نہیں جاتا تھا۔''

پیش تخلیق حضرت آدمؑ
تھے شب وروز ماہ وسال کہاں

رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ''اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے'' عظیم انسانوں کی علامت ہے شعر میں:

وہی انسان حقیقت میں ہے انسانِ عظیم
اس کی مرضی کے سوا کچھ جسے منظور نہیں

سبحٰن الذی اسریٰ بعبدهٖ لیلا ''پاک ہے وہ ذات جس نے بھیجا اپنے بندے کو راتوں رات (معراج شریف پر)'' سے یہ شعر ماخوذ ہوگا۔

قرب خدا کا راستہ ہم کو دکھادیا کہ یوں
خود بھی رسول ﷺ پاک نے چل کر دکھادیا کہ یوں

اس طرح کے بہ کثرت اشعار ہیں جن میں قرآن وحدیث کی تلمیحات ملتی ہیں۔ اور جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ساجد نے کس ماحول میں پرورش پائی تھی۔ ان تلمیحات کے علاوہ ان کے اشعار میں شعری نکتہ آفرینیاں بھی بہت پائی جاتی ہیں اور جدتِ اسالیب بھی ہے۔ مثلاً۔ اس مجموعے کا پہلا شعر ہے۔

ہے درخشاں ایک پہلو یہ مری تقدیر کا
واسطہ ہے اس کی رحمت سے مری تقصیر کا

تقصیر کا واسطۂ رحمت سے ہونا شعری طور پر ندرت رکھتا ہے۔

قلب را عرشِ الٰہی گفتہ اند
ایں زمیں را آسمانے دیگر است

کسی کا شعر ہے اور اسی قلب میں جب مدینہ طیبہ کا نقشہ بھی ہو تو اس کی قدر و منزلت کس قدر بڑھ جائے گی! ساجد کہتے ہیں:

یہ خود کعبہ بھی ہے، اس میں مدینے کا بھی نقشہ ہے
بہر صورت ہے افضل تجھ سے دل، اے جامِ جم میرا

صرف ایمان ہی اصل قوت ہے اور اس عقیدے کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں دس پر ایک کا بھاری ہونا مذکور ہے۔

حضرت ساجد کہتے ہیں:

عطا کی قوتِ ایماں نے وہ ہمت مسلماں کو
کہ ہو کر رہ گیا اک لفظ مہمل، لفظ مشکل کا

خدا سے خدا ہی کے محبوب کو طلب کرنا ''گستاخی'' سہی لیکن یہ بھی بڑے حوصلے کی بات ہے۔ حضرت ساجد کہتے ہیں:

خدا سے اس کے ہی محبوب کا گستاخ طالب ہے(۵)
ذرا دیکھے کوئی یہ حوصلہ ساجد سے سائل کا

موت وحیات کا شاعرانہ فلسفہ بہت سے شاعروں نے بیان کیا ہے۔ ساجد کہتے ہیں:

پھول کرتا ہے عیاں فلسفۂ موت وحیات
زندگی اس کی ہنسی، موت پریشاں ہونا

ندرتِ مضمون اس شعر میں بھی ملاحظہ ہو:

حقیقت میں ہیں یہ دونوں بھکاری نورِ احمد ﷺ کے
نہیں یہ چاند سورج، ہے ہر اک کاسہ گدائی کا

۵۔ مسیحا پانی پتی کا شعر ہے:

زعشقِ مصطفیٰ دل ریش دارم
رقابت باخدائے خویش دارم

رعایت لفظی و معنوی بھی حضرت ساجد کے یہاں ہے لیکن کم ہے اور خوب ہے۔ مثلاً:

مرے الجھے ہوئے سب کام دم بھر میں سلجھتے ہیں
تصور زلفِ احمد ﷺ کا جو کرتا ہوں میں الجھن میں

حبیب ﷺ کبریا گر اک نگاہِ مہر سے دیکھیں
تو اک ذرہ بنے مہرِ مبیں ، اک قطرہ دریا ہو

لذتِ سجدہ ہمیں ہوتی نہیں ساجد نصیب
دور ہے اس در سے پیش آنی ہماری ہائے ہائے

جھولیاں بھرتے ہیں سب دریائے رحمت سے وہاں
احمدِ مختار کا دربار وہ دربار ہے

اے عرب کے چاند اپنی چاندنی کر کے عطا
جگمگا دے یہ اندھیرے دل کی بستی ایک دن

کتنا پیارا ہے غم عشق رسول عربی ﷺ
شاد ہے یہ دل، ناشاد بھی ناشاد نہیں

اور امتوں کو اور بہت راہ بر ملے
خیر الامم کو خیر سے خیر البشر ﷺ ملے

بعض عمدہ نعتوں کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:

شاخ سے جب کوئی تازہ گلِ خنداں نکلا
احمریں لب سے محمد ﷺ کا ثنا خواں نکلا

اس سے میں کروں آخر درد کیا بیاں اپنا
جب کہ اس پہ اے ہم دم حال ہے عیاں اپنا

دور نظروں سے ہیں دل سے وہ مگر دور نہیں
میں ہوں مہجور مگر اصل میں مہجور نہیں

یوں جلوہ گر ہوئے وہ حجاب گلاب میں
جیسے کسی حسیں کا تبسم نقاب میں

ان کا احساں کیا گلوں پر گلستانوں پر نہیں؟
اہلِ دنیا پر نہیں یا آسمانوں پر نہیں؟
دردِ عشق مصطفیٰ ﷺ بھی کیا سُرور انگیز ہے
زخم دل ہر اک مرا گل پوش ہے گل ریز ہے
کیا کرتا ہوں شب کو یاد میں زلفِ پیمبر ﷺ کی
گرہ والیل پڑھ کر کھول لیتا ہوں مقدر کی

بعض اچھے اشعار ایسے بھی ہیں جن سے ہر شخص لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ مثلاً:

یاس میں، رنج ومصیبت میں، بلا میں، غم میں
نام اللہ کا، کب وجہِ تسلی نہ ہوا
خط گلزار میں لکھی گئی ہے نعت احمد ﷺ کی
مجھے معلوم ہے یہ رازِ تخلیقِ گلستاں کا
جذبۂ ذوقِ نظر کی ہے معراجِ کمال
ان کا باوصفِ حجابات، نمایاں ہونا
تصور نے مرے تصویر طیبہ کھینچ کر دل پر
بڑھادی شان وشوکت اور بھی اللہ کے گھر کی
میں داغ لے کے جاؤں گا عشقِ حبیب ﷺ کا
کچھ تو خدا کی نذر کو سوغات چاہئے
میرے پہلو میں سمٹ کر آگئی ہے کائنات
دل ہے کعبہ اور گلزار مدینہ دل میں ہے

لیکن ان تمام نعتوں کا ماحصل (جیسا کہ حضرت ساجد نے فرمایا ہے) حضور انور ﷺ کی غلامی اور پیروی ہے اور یہی انسانی زندگی کا عین مقصد ہے۔ ساجد اس طرح فرماتے ہیں:

مجھ کو پابندِ شریعت کرگیا عشقِ رسول
کیوں بھلا پابند ہو میرا جنوں زنجیر کا؟☆

☆ انعمت علیہم۔ ص ۳۷

ادب گلشن آبادی

حضرت ادبؔ کا تعلق گلشن آباد (یعنی ریاست جاورہ) سے تھا جو میرے بزرگوں کا بھی مسکن رہا ہے۔ آپ کے والدین ماجدین کی اعلیٰ تربیت، پھر آپ کے شیخ علیہ الرحمہ کی صحبت نے آپ کے اخلاقِ حمیدہ اور اوصاف پاکیزہ کو اس قدر پرکشش بنا دیا تھا کہ آپ سے ملنے والا پہلی ملاقات ہی میں آپ کا گرویدہ بن جاتا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد آپ کا قیام شروع میں میرپور خاص (سندھ) میں تھا۔ راقم الحروف کسی تقریب میں وہاں شریک ہوا تو آپ کے غیر معمولی انکسار، تواضع، ورع وتقویٰ سے بہت متاثر ہوا۔ آپ کے یہی وہ اوصاف تھے جنہوں نے آپ کو مرجع خلائق بنا دیا تھا اور بکثرت لوگ آپ سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ ان کو دیکھ کر یہ قول یاد آتا تھا۔

الطریق کله ادب

پھر کراچی کے قیام کے زمانے میں آپ کے شیخ علیہ الرحمہ کے عرس کے موقع پر حاضری نصیب ہوئی تو وہاں بھی آپ کی شرعی زندگی دیکھ کر دل کو بڑی فرحت حاصل ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب آپ کی زبانِ مبارک سے یہ نعت سنی:

کشتی ہے منجدھار محمد
کیجئے بیڑا پار محمد
اسریٰ کے انوار محمد
طور پہ جلوہ بار محمد

میری غلامی سبحان اللہ
میرے ہیں سرکار محمد
جیسے قرآں بول رہا ہو
تیری ہے گفتار محمد
سازِ ہستی جب بھی چھیڑا
تیری ہے گفتار محمد
قافلہ وہ کیوں راہ سے بھٹکے
جس کے ہوں سالار محمد
خلدِ بریں کی حدِ فاضل
روضے کی دیوار محمد

سبحان اللہ، کس قدر پر کیف نعت ہے! حضرت ادب خود بھی جھوم رہے تھے اور سامعین پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ حقیقت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے ایسے لمحات مجھے بہت کم نصیب ہوئے ہوں گے۔ اس وقت علامہ اقبالؒ کا یہ شعر یاد آرہا تھا۔

تُو فرمودی رہِ بطحا گرفتیم
وگرنہ جز تُو ما را منزلے نیست

حضرت ادب کی نعت میں کیف و مستی زیادہ ہے اور سادگی و پرکاری کم ہے۔ افسوس کہ آپ کا بہت سا کلام اب دست یاب نہیں، تاہم جو کچھ ہے وہ آپ کے اعلیٰ ذوق کا شاہد ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کوئی کیا سمجھے ہمارا رازِ دریوزہ گری
مانگتے ہیں رب سے رب کو ہم برائے مصطفیٰ
بجز خلاقِ عالم، تم سے ہے تخلیقِ ہر عالم
بنائے کُن فکاں تم اور وجہِ ماسوا تم ہو
دل میں مہماں کیا ہے یوں ان کو
عرش کو آئینہ دکھانا ہے

ہر گام پہ جو بڑھتا نہ رہے وہ عشق نبی کا عشق نہیں
وہ راہ غم احمد کی نہیں جس راہ میں منزل آجائے
ادب کعبۂ عقل، محراب و منبر
مرا کعبۂ عشق، روئے محمد
آنچہ در روئے محمد ﷺ مصطفیٰ من دیدہ ام
اے ادب گیرد زباں از گفتنش شرع متیں
بہ عقبیٰ جز عطائے تو، بہ دنیا ولائے تو
سروساماں نمی دارم اغثنی یا رسول اللہ ﷺ

پھر یہ شعر حضرت ادب کے ارمان کو پورا کرنے کے لئے مقبول ہوا۔

ادب کاش پوری ہو دل کی یہ حسرت
بنے اپنا مدفن دیارِ مدینہ

دیارِ مدینہ، دیار مکہ پر محیط ہے اس لئے وہیں کے ہو رہے اور مستقل حاجی بن گئے۔
اقبالؒ نے سچ کہا ہے کہ:

منزلِ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

اللہ تعالیٰ ان پر لاکھوں رحمتیں ہر لحظہ نازل فرماتا رہے! آمین ☆

☆ انعمت علیہم ۔ص ۴۷

حافظ حکیم عبدالغفار ذوقی الہ آبادی

حضرت حکیم حافظ عبدالغفار ذوقی الہٰ آبادی مرحوم جامع الکمالات بزرگ تھے۔ بچپن میں قرآن پاک حفظ کیا۔ پھر استاذ الہند قاری ضیاء الدین احمد صاحب علیہ الرحمہ کے مدرسۂ سبحانیہ الہٰ آباد میں تجوید و قرأت کی تحصیل کی۔ پھر شاعر و ادیب بھی ہوئے لیکن علم الادیان کے ساتھ علم الابدان کا شوق غالب ہوا تو یونانی طب، نیز ہومیو پیتھی اور ہائیڈرو پیتھی میں مہارت حاصل کی۔ خوش نویسی اور خطاطی (ثلث ورقاع وغیرہ) کے فن میں بہت مشق کی۔ چنانچہ خفی اور جلی بڑی خوبی کے ساتھ لکھتے تھے۔ راقم الحروف کی متعدد کتابیں آپ نے کتابت فرمائی تھیں۔ حیدرآباد منتقل ہوئے تو حضرت پیر ایرانی علیہ الرحمہ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوکر ان سے خلافت بھی حاصل کی۔ پھر خوش اخلاق، خوش اطوار اور خوش گفتار ایسے تھے کہ ان سے ایک مرتبہ بھی ملنے والا انہیں فراموش نہیں کرسکتا تھا۔ خوددار ایسے کہ بڑے بڑے افسروں سے عزیز داری ہونے کے باوجود کبھی ان سے اپنی حاجت بیان نہیں کی۔ اور کبھی اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ بقولِ داغ:

آپ کی جس میں ہو مرضی وہ مصیبت بہتر
آپ کی جس میں خوشی ہو وہ ملال اچھا ہے

سلیقہ اور معاملہ فہمی ایسی تھی کہ لوگ ان سے اپنے معاشرتی معاملات میں مشورہ لینا موجبِ خیر و فلاح سمجھتے تھے۔ قرآن پاک سے شغف ایسا تھا کہ ہر روز دور کرتے اور بڑھاپے تک محراب سناتے رہے اور محراب سنانے میں اتنی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے کہ آیاتِ سجدہ کی تلاوت کے وقت اپنی تلاوت کی آواز کو پست کرلیتے تھے تاکہ دوسرے لوگ جو تراویح میں

شریک نہیں ہیں وہ سجدہ کرنے کے مکلف نہ ہونے پائیں۔ مذکورۂ بالا محاسن کا پرتو صراحتاً یا کنایتاً ان کی اس آخری تصنیف ''تجزیۂ حیات'' میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

تجزیۂ حیات کا ابتدائیہ حمد ونعت پر مشتمل ہے اور نئے انداز میں ہے۔ پھر مخلوقات کی زندگی کا تجزیہ ہے۔ موالیدِ ثلاثہ یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات کی زندگیوں کی چار اقسام پر بحث ہے۔ یعنی ۱۔ ظاہر ادنیٰ باطن ادنیٰ ۲۔ ظاہر اعلیٰ باطن ادنیٰ ۳۔ ظاہر ادنیٰ باطن اعلیٰ اور ۴۔ ظاہر اعلیٰ باطن اعلیٰ کی تفصیل ہے۔ اور حیوانات کی زندگی کے ذیل میں موجودہ مسائل کا ذکر بھی ہے۔ مثلاً مردہ اور ذبیحہ کا فرق۔ جھٹکا اور ذبیحہ کا فرق۔ ذبیحے پر اللہ کا نام۔ نذور نیاز اور فاتحہ۔ ہندو قوم کا ماش کی دال کھانے کا مقصد وغیرہ۔

پھر انسانی زندگی کا ذکر ہے کہ وہ موالیدِ ثلاثہ سے کیوں افضل ہے۔ اور جنات، ملائکہ اور ارواح سے کیوں مختلف ہے؟ وہ معتدل المزاج، معتدل الافعال اور معتدل النتائج کیوں ہے؟ اور اس کی بھی چار اقسام مذکورہ کے ذیل میں اس کے مختلف فضائل اور رذائل کا تجزیہ ہے۔ اور موجودہ سائنسی دور سے متعلق ضروری مباحث کا مفصل جائزہ ہے۔ اس کے بعد اسلام، مزاجِ اسلام، قبولِ اسلام، حقوق اللہ، توحید (اس کی مختلف اقسام)، ایمانیات، طہارت، تزکیہ وغیرہ پر سیر حاصل بحث ہے اور انسان کی اشرف واعلیٰ زندگی (ظاہر اعلیٰ باطن اعلیٰ) کے متعلق فرمایا ہے:

> یہ زندگی، اللہ تعالیٰ کی صفت، حیات سے اس قدر قریب ہوتی ہے کہ اسی زندگی کے حامل انسان کو خدارسیدہ...... وغیرہ کہتے ہیں۔

حضرت ذوقی صاحب نے اسی زندگی کو زندگی کی معراج کہا ہے۔ موضوع کا تمام وکمال تجزیہ یہیں مکمل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرحوم نے جس خوبی سے اس تجزیے کی تفصیل فرمائی ہے اور جس انداز سے اس کی تکمیل پر روشنی ڈالی ہے وہ اس دور کی مادی اور روحانی زندگی کے لئے بے حد مفید بھی ہے اور سہل الحصول بھی۔

ان کی ولادت الہٰ آباد میں ۱۳۲۴ھ۔۱۹۰۴ء میں ہوئی اور وفات حیدرآباد سندھ میں دوشنبہ ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء کو ہوئی۔ اللہ پاک مرحوم پر بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔ بجاہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم۔ راقم الحروف نے قطعۂ تاریخ اس طرح عرض کیا تھا:

صد افسوس آج دنیا میں نہیں وہ
کہ جن کے غم سے افسردہ سب ہی ہیں
حکیم و حافظ و قاری و عالم
سب اوصاف ان کے فخرِ زندگی ہیں
سراپا زہد و تقویٰ مثلِ اسلاف
''یہ زاہد زادہ ذوقی جنتی ہیں''
۳ ۹ ۳ ۱ ھ

اب ان کے چند مختلف اشعار ملاحظہ ہوں:

با جامِ شراب الا اللہ، سرمست، دلِ دیوانہ ہے
دیوانے کے اس پیمانے میں توحید کا وہ میخانہ ہے
وہ ہم میں نبی ﷺ بن کر آئے، کیا خوب یہ ان کا آنا ہے
فرمان لقد منّ اللہ میں، احسان اسے فرمانا ہے
تحمیدِ خدا بے نعت نہیں اور نعت نہیں بے حمدِ خدا
گر حمد کریں تو نعت ہے وہ اور نعتِ نبیؐ شکرانہ ہے
والشمس وہی، واللیل وہی، یٰسین وہی، طٰہٰ وہ ہی
یہ ماضی وحال و مستقبل، میلاد کا ان کی بہانہ ہے

☆☆☆

ہوا ہے ظاہر وہ نورِ اولٰ جو کُن فکاں کی ترنگ ہوکر
فرشتے سجدے میں گر گئے ہیں، کھڑا ہے شیطان دنگ ہوکر
بٹھا کے محراب دل میں ان کو نثار کردیں گے ان پہ سجدے
صنم پرستی کریں گے کعبے میں ہم فقیرِ ملنگ ہو کر
ہم آتے جاتے ہیں سب سے چھپ کر، ہمارے سینے میں ہے مدینہ
کھلا ہے رستہ ہمارے دل سے درِ نبی تک سُرنگ ہوکر
یہ میرا دل ہے ہوائی کاغذ، ہے ربطِ طیبہ کی مانجھ ڈوری

خدا اڑا دے یہاں سے مجھ کو، گروں وہاں میں پتنگ ہوکر

افسانہ بن گیا جو تجلیِ طور کا
گوشہ سرک گیا تھا رسالت کے نور کا
تھا کس کا نور آتشِ ایمن میں اے کلیمؑ
رستہ دکھایا جس نے تمہیں شمعِ طور کا
تھا غیب میں وہ جوشِ جمالِ محمدیؐ
عالم میں حسن پھوٹ پڑا ہے ظہور کا
وہ باوجودِ بندگی ہیں ربِ کائنات
رتبہ تو دیکھے کوئی یہ عبدِ شکور کا

☆☆☆

کہاں ڈھونڈوں، کسے ڈھونڈوں، کہاں پاؤں، کسے پاؤں
جہاں ڈھونڈوں وہیں ہوگا، جہاں ہوگا نہاں ہوگا

☆☆☆

بندہ اگر ہے بندہ، مجبور وناتواں ہے
مجبوریاں نہ ہوں تو پھر بندگی کہاں ہے
ساقی نے ایک جام میں یہ کیا پلادیا
قطرے میں بحرِ کُل کا تماشا دکھادیا
ادنیٰ سا اشارہ تھا اور چاند تھا دوٹکڑے
اس رحمت ﷺ عالم کی شمشیر کا کیا کہنا
ذوقی تھا بحرِ ہستی میں جس بلبلے کا نام
وہ نقشِ آب موج مٹا دیا

☆☆☆

میں کس کو ڈھونڈتا ہوں، کیا سعی رائیگاں ہے
وہ ہے تو میں کہاں ہوں میں ہوں تو وہ کہاں ہے

دیکھ دامن نہ چھڑا ہاتھ سے، جانے والے
ایک دنیا ہے مرے ہاتھ میں ارمانوں کی
مرے بعد آنے والو دیکھ کر رکھنا قدم آگے
الجھ کر رہ گئی ہیں راہ میں کچھ بیڑیاں میری
غضب ہوتا ہے جب زخمِ جگر خنداں نہیں ہوتا
قلق ہوتا ہے جب دل میں کوئی پیکاں نہیں ہوتا
بتائے گا کوئی کیا رازِ وحدت کا پتا مجھ کو
وہ خود ہی راز ہو جائے گا جس دم راز داں ہوگا
اف یہ تکمیل جنوں اور سرِ فتنہ ذوقی
میں بیابان میں اور شہر میں رسوائی ہے
عجیب چیز ہے قسمت کی نارسائی بھی
کہاں پہنچ کے مرے پاؤں ڈگمگائے ہیں
ہمیں تو خار میں بھی لطفِ گل ملا ذوقی
یہ لوگ کیوں گل وبلبل سے خار کھاتے ہیں
ہر گل ہے چاک، بو ہے پریشاں، کلی اداس
دیوانگی کا اپنی اثر دیکھتا ہوں میں
ذوقی جنوں نصیب سا دیوانہ اب کہاں
ڈھونڈیں نہ آپ شمع فروزاں لیے ہوئے
اپنے کمال پر ہے ہر اک چیز کو زوال
ذوقی کمال یہ ہے کہ کامل نہیں ہوں میں
کسی سے ہے نہ دولت کی طمع دنیا میں ذوقی کو
نہ عزت کی طلب امروز یا فردا میں ذوقی کو
بڑی ثروت ملی ہے فقرِ بے پروا میں ذوقی کو
مزاجِ خسروی حاصل ہے استغنا میں ذوقی کو

یہ ذوقی تو گدا ہے خواجۂ قاسمؒ کیانی کا
کہیں گل آدمی، نوحی، براہیمی، کلیمانی
کہیں رنگِ مسیحی اور بوئے محبوب یزدانی
بہارِ بے خزاں کی ہر طرف ہے طرفہ سامانی
بحمداللہ جس کے باغباں ہیں پیر ایرانیؒ
چمن پھولا پھلا ہے خواجہ قاسمؒ کیانی کا☆

☆ انعت علیہم ۔ ص ۳۲

حضرت ذوقی صاحب الہ آبادی

حضرت حکیم ذوقی صاحب مرحوم سے میرے تعلقات ۱۹۵۶ء سے شروع ہوئے جب کہ سندھ یونیورسٹی میں میرا تقرر ہوا تھا۔ تعارف تو صرف اس وجہ سے ہوا تھا کہ وہ اچھے کاتب تھے۔ لیکن ملاقات کے بعد ان سے دو رشتے نکل آئے۔ ایک تو یہ کہ وہ نقشبندی سلسلے میں منسلک تھے جس سے میرا تعلق ایسا ہے گویا:

بدنام کنندہ نکو نامے چند

دوسرا رشتہ یہ تھا کہ وہ الہ آباد میں میرے بزرگ استاد قاری ضیاء الدین احمد صاحبؒ کے چھوٹے صاحب زادے قاری محب الدین صاحب مدظلہ کے شاگرد رہ چکے تھے۔ میرے لئے یہ دو رشتے بہت اہم تھے اور انہی کی وجہ سے میں ان سے قریب سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ عالم ہیں اور عربی درسیات میں بہت کچھ بہرہ مند ہیں۔ فارسی میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ حافظ ہیں۔ قاری ہیں۔ شاعر ہیں۔ ادیب ہیں۔ حکیم ہیں۔ ہومیو پیتھ ہیں۔ ہائیڈرو پیتھ ہیں۔

یعنی کاتب ہونے کے علاوہ یہ تمام اوصاف بھی ہیں۔ لیکن ان تمام اوصاف حمیدہ پر ان کے اخلاق کریمانہ غالب تھے اور تواضع وانکسار ان کی طبیعت کا خاص رنگ تھا۔ ان تمام اوصاف اور کمالات کی وجہ سے ان کا گھریلو ماحول خاصا دینی تھا اور اسی وجہ سے ماشاءاللہ ان کی تمام اولاد نیک اور صالح رہی ہے۔ اور اعزا بھی اس ماحول سے بڑی حد تک مستفید ہوتے رہے ہیں۔ ان سے کبھی نیاز حاصل ہوتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ گویا اپنا کوئی خاص الخاص عزیز مل گیا اور جب ان سے رخصت ہونا پڑتا تھا تو دیر تک ان کی محبت

دل میں چٹکیاں لیتی رہتی تھی۔ پھر ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ایک قریبی عزیز سے جو ڈپٹی کمشنر تھے بعد میں کمشنر بھی ہو گئے تھے صرف اس لیے نہیں ملتے تھے کہ کہیں دنیا درمیان میں نہ آ جائے۔

چوں کہ وہ حافظ تھے اس لئے انہیں ہر روز ایک منزل پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہو جاتی تھی اور قاری ہونے کی وجہ سے وہ با قاعدہ تجوید کے ساتھ حدر میں بھی قرآن پاک پڑھا کرتے تھے۔ یہ سعادت بھی بہت بڑی تھی جو ہر حافظ کو حاصل نہیں۔ راقم الحروف نے کبھی کبھی غریب خانے پر محراب سنانے کے لئے انہیں زحمت دی ہے اور جب وہ تراویح پڑھاتے تھے تو ایک احتیاج یہ ملحوظ رکھتے تھے کہ آیات سجدہ کو پست آواز سے پڑھتے تھے تا کہ غیر نمازیوں پر سجدہ واجب نہ ہو جائے۔

اسی احتیاج کی وجہ سے وہ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو پسند نہیں فرماتے تھے کیونکہ اس طرح اذان اور قرآن کا احترام نہیں رہتا۔ یعنی حکم تو یہ ہے کہ ''جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحمتیں نازل ہوں۔''

چنانچہ لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے جب آواز پھیلے گی اور مختلف مسجدوں سے مختلف اوقات میں آواز آئے گی تو سننے والا کس کس آواز کو سنے گا اور خاموش رہے گا! اس سلسلے میں انہوں نے ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔

ماشاء اللہ مرحوم نے کئی بچوں کو حافظ بنایا اور سب ہی بچوں اور بچیوں کو کتابت سکھائی۔ ان کو اپنی ایک بچی آمنہ جمال سے بڑی محبت تھی۔ وہ بہت اچھی کتابت کرتی تھی۔ راقم الحروف نے اس کی شادی کے موقع پر یہ قطعہ تاریخ لکھا تھا:

بچی عزیزہ، حضرت ذوقی کی نورِ چشم
خوش بخت، خوش مزاج وخوش اخلاق وخوش مقال
ماں باپ سے وہ ہوتی ہیں رخصت بحکم شرع
سب کی دعا ہے وہ رہیں خوش حال و خوش مآل
'بہجت نصیب و عصمت و عفت کی آبرو'
۳ ۶ ۹ ۱ ء

''ہیں آمنہ جمال عروس ملک خصال''

(۳ ۸ ۳ ۱ ھ) ۲ ذی قعدہ

افسوس کہ پھر اس بچی کے انتقال پر بھی مجھے یہ قطعہ تاریخ لکھنا پڑا:

آہ! آں بنت حضرت ذوقی ذی جاہ

رفت چوں دخترش ولادت یافت

خوش رقم، خوش بیان و خوش دل بود

صبر و شکر و رضا بہ عادت یافت

''در بہشت آمنہ جمال شد''

۸۸ ۳ ۱ھ (پنج شنبہ ۷ رمضان المبارک)

''ایں ہمہ رحمت از شہادت یافت''

۸ ۱۹۶ء ۲۸ نومبر ۱۹۶۸ء

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ حضرت ذوقی مرحوم تصوف میں سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں منسلک تھے اور حیدر آباد کے مشہور بزرگ حضرت پیر ایرانی صاحب مدظلہ کے دامن تربیت سے وابستہ تھے۔ حضرت صاحب ہمیشہ ذوقی صاحب پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور مختلف طریقوں سے نوازتے رہتے تھے۔ ایک عرصے تک آپ نے ایک رسالہ بھی ان کو تفویض فرمادیا تھا اور اپنی کتابوں کی کتابت اور طباعت بھی انہی کے ذمے کردی تھی۔

مرحوم سے راقم الحروف نے کئی نادر کتابیں بھی کتابت کرائی تھیں جن کی وجہ سے ان کی روحانی کیفیات میں غیر معمولی اضافہ ہوا تھا اور جیسا کہ مرحوم نے مجھے بتایا تھا، انہی کیفیات کی وجہ سے ان کے پیر صاحب نے انہیں خلافت عالیہ سے بھی سرفراز فرمادیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس منصب کے اہل بھی تھے۔ یہاں بے محل نہ ہوگا اگر ان کتابوں کا، ذکر بھی کردیا جائے جن کی کتابت کے لئے مرحوم کی زحمت دی گئی تھی۔

۱۔ ہدایت الطالبین۔ ۱۹۵۶ء۔ ۲۔ علمی نقوش۔ ۱۹۵۶ء لیکن دوسرے سال شائع ہوئی۔ ۳۔ رسائل مشاہیر نقشبندیہ۔ ۱۹۵۸ء۔ ۴۔ ملفوظات۔ ۱۹۵۹ء۔ ۵۔ ارشاد رحیمیہ۔ ۱۹۵۹ء۔ ۶۔ انتخاب مکتوبات امام ربانی۔ ۱۹۶۱ء دوبارہ ۱۹۶۳ء۔ (۷۔ آگاہی امیر کلال۔

۱۹۶۱ء۔ ۸۔ دیوان روشن۔ ۱۹۶۱ء۔ ۹۔ ترجمہ مخدوم نوح (پہلا پارہ) ۱۹۶۲ء۔ ۱۰۔ تقریر وتقریر۔ ۱۹۶۲ء۔ ۱۱۔ النبوۃ (اردو ترجمہ)۔ ۱۹۶۳ء۔ ۱۲۔ وسیلہ القبول (حصہ اول)۔ ۱۹۶۳ء۔ ۱۳۔ وسیلہ القبول (حصہ دوم)۔ ۱۹۶۳ء۔ ۱۴۔ مکاشفات عینیہ (متن مع ترجمہ)۔ ۱۹۶۳ء۔ ۱۵۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ (ایک تحقیقی جائزہ)۔ ۱۹۶۵ء۔ ۱۶۔ تاریخ اسلاف۔ ۱۹۶۵ء۔ ۱۷۔ سعید البیان۔ ۱۹۶۵ء۔ ۱۸۔ مجمع البحرین۔ ۱۹۶۵ء۔ ۱۹۔ گلشن وحدت۔ ۱۹۶۶ء۔ ۲۰۔ تحقیق الحق المبین۔ ۱۹۶۶ء۔ ۲۱۔ قرآنی عربی۔ ۱۹۶۶ء۔ ۲۲۔ وصال احمدی۔ ۱۹۶۸ء۔ ۲۳۔ مکتوبات سیفیہ۔ ۱۹۶۸ء۔ ۲۴۔ رسالہ سلوک مع سلاسل خواجہ باقی باللہؒ ۱۹۶۹ء۔ ان کے علاوہ مکتوبات امام ربانیؒ (فارسی) کے بعض مقامات کی تصحیح وترقیم بھی مرحوم کے قلم سے ۱۹۷۲ء میں ہوئی تھی۔

راقم الحروف کے بیٹے کے مکان پر ۱۱۔۱۲ فٹ کا طویل ترقیمہ بھی آپ کے قلم سے ہے۔ وائس چانسلر علامہ قاضی اوران کی بیگم کے مزارات کے کتبے بھی آپ ہی نے لکھے تھے۔

مرحوم نے ۱۹۷۳ء میں خزینۃ المعارف کی کتابت کی تھی۔ یہ آخری کتاب تھی اس کے بعد وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ راقم الحروف نے ان کی وفات پر (لوح مزار کے لئے) یہ قطعہ تاریخ لکھا تھا۔

حکیم سامی عبدالغفار صاحب مصطفائی الہ آبادی'

۳	۷		۹	۱ء
مکرم	زمان	حکیم	ذوقی	صاحب
۱		۹	۳	۱ھ

☆☆☆

عالم و عارف شیخ طریقت
حافظ و قاری ذوقی صاحب
تھے وہ حکیم حاذق و کامل
سب کی خیر کے ہر دم طالب

ثلث رقاع کے ماہر تھے وہ
خطاطی میں سب پر غالب
خلق عظیم و قول احسن
تھے وہ اسی دولت کے جالب
بے شک تھے اللہ کے پیارے
ہر دم تھے اللہ سے تائب☆

☆ایک محقق تین ادیب۔حیدر آباد ۱۹۹۲ء۔اوراق گم گشتہ۔ص ۱۷۰

حافظ صابر

عزیز گرامی حافظ صابر بن ذوقی جس گھر کے چشم و چراغ ہیں وہاں شرع و دین، علم وفضل، زہد وتقویٰ ہی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ ان کے والد حضرت ذوقی مرحوم حافظ بھی تھے، قاری بھی تھے، عالم بھی تھے، شاعر، حکیم اور مشہور خطاط وخوش نویس تھے اور اس قدر فنون میں مہارت رکھتے تھے کہ بہت کم لوگ ان جیسے نظر آتے ہیں۔ حافظ صابر نے اپنے والد مرحوم کے بہت سے فضائل ورثے میں پائے ہیں جن کا پرتو ان کی شاعری میں جگہ جگہ موجود ہے۔

ایک اچھا شاعر اپنی اور پرائے کی زندگی کا شعور رکھتا ہے، اسی لئے صابر خود اپنی زندگی ہی کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں:

محروم روزگار ہوں صابر تو کیا ہوا
زندہ بہت سے لوگ ہیں محرومیوں کے ساتھ
جو رنج و غم عطا ہوں دوستوں سے
اگر صابر ہو تم دل سے چھپا لو

تواضع وانکساری بھی صابر کو ورثے میں ملا ہے۔ اسی لئے ایک ایک غزل میں ان کے ایسے تمام شریفانہ خصائل کا ذکر ہے:

تجھ سے بڑے اور بہتر صابر
دوست ہیں تیرے اکثر صابر
جاہل، عاصی، کم تر صابر
کون ہے تیرا ہم سر صابر

جب سچ کی میزان میں تولا
چھوٹا نکلا یکسر صابر
قریہ قریہ میں نے چھانا
کوئی نہ دیکھا کم تر صابر
دنیا میں ارباب وفا کی
روتے گزری اکثر صابر
حسرت ہے گر دید کی اس کی
پہلے دیکھو مر کر صابر
کون ہے اپنا کون پرایا
سب سے رہو مل جل کر صابر
پہلے جو بھی لوگ تھے تجھ سے
سلگے اندر اندر صابر
دل پر شب خوں مار رہے ہیں
اندیشوں کے لشکر صابر

وہ خود کو صابر بن ذوقی لکھتے ہیں لیکن شاید ''بن'' کے لفظ میں رعایت معنوی بھی ہے، کہتے ہیں:

صابر بن ذوقی تو نے
کس کا روپ چرایا تھا
صابر بن ذوقی کو کس نے
دور افق سے چھپتا دیکھا؟

حافظ صابر کو غزل، گیت، نظم، قطعہ اور رباعی سے زیادہ شغف ہے اور ان کی غزل میں گیت کا رنگ غالب ہے۔ غزل کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

پھولوں سے میں پوچھ رہا تھا
پتھر سے ٹکرایا کب تھا

سب کے ساتھ تھا محفل محفل
لیکن خود کو تنہا دیکھا
تیرگی کہہ رہی ہے محفل سے
دل جلاؤ تو روشنی ہوگی
خود سے ملنے کے واسطے اکثر
آنسوؤں کے دیے جلاتا ہوں
میں نے اشکوں میں ڈوب کر دیکھا
دل دھڑکتا ہے آب شاروں کا

صابر کے کلام کی امتیازی شان یہی ہے اور انہوں نے غمِ دل اور غمِ دوراں سے متاثر ہو کر ہی لکھا ہے۔ تاہم انہیں اعتراف ہے کہ

مجھے خبر ہے کہ میں ناتمام لکھتا ہوں

لیکن یہ اعتراف ان کے کلام کے ''تمام و کمال'' کے لئے پیش خیمہ ہے۔ اللہ پاک ان کو سلامت با کرامت رکھے۔ آمین ☆

☆ اوراق گم گشتہ۔ ص ۱۷۵

حافظ غلام محی الدین صابر

حافظ غلام محی الدین صابر کے والد جناب حافظ عبدالغفار ذوقی کا وطن الہ آباد (یوپی) تھا۔وہیں اپنے والد کے زیر تربیت رہے۔عبدالغفار صاحب، حافظ، حکیم، شاعر، صوفی اور کاتب وہیں بنے اور حضرت استاذ الہند قاری ضیاء الدین احمد علیہ الرحمہ (م ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۲ء) کے چھوٹے صاحب زادے قاری محب الدین احمدؒ سے تجوید وقرأت حاصل کی۔الہ آباد میں اکبراور دوسرے شعراء کی وجہ سے شاعری کا بڑا زور تھا۔ذوقی صاحب نے بھی اس فن کا ذائقہ حاصل کیا اور بہت اچھا لکھنے لگے۔کتابت میں ہفت قلم بھی وہیں ہوئے۔

پاکستان بننے پر ذوقی صاحب مع اہل وعیال حیدرآباد میں سکونت پذیر ہوئے اور کتابت کو اپنا اور اپنے صاحب زادوں (چراغ، فرید اور صابر) کا پیشہ بنایا۔ایک صاحب زادی بھی اس فن میں خاصی مہارت رکھتی تھیں۔حیدرآباد آجانے پر یہاں کے مشہور بزرگ حضرت صبغۃ اللہ ایرانی علیہ الرحمہ (م ۱۹۸۶ء) سے بیعت ہوئے اور خلافت بھی حاصل کی۔صورت اور سیرت میں ایک باکمال صوفی ہی نظر آتے تھے۔قرآن پاک کی تلاوت کا دَور، ان کا ہر روز کا معمول تھا۔ایک رمضان المبارک میں انہوں نے غریب خانے میں بھی پورا قرآن سنایا تھا۔

ذوقی صاحب (م ۱۹۷۳ء) اور ان کے فرزندوں نے میری اور میرے بچوں کی کئی کتابوں کی کتابت کی ہے۔وہ پہلے ہسپتال کے عقب میں رہتے تھے، پھر لطیف آباد نمبر ۱۰ میں منتقل ہوگئے۔صابر صاحب آخری ایام تک وہیں رہے۔مشاعروں میں بھی شریک ہوجاتے تھے، لیکن اصل شغل صرف کتابت سے متعلق تھا۔غریب خانے پر ان کے سب عزیزوں نے

مجھے عزت بخشی ہے۔

ان کے انتقال پر راقم الحروف نے یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے۔

وہ حافظ ابن حافظ ابن حافظ
سلف کی پیروی میں وہ تھے کامل
بڑے روشن گہر، والا گہر تھے
شرافت کے جواہر ان کو حاصل
کتابت، شاعری، تاریخ گوئی
بہت سی خوبیوں کے تھے وہ حامل
وہ کنزالعلم صابر ابن ذوقی
۱ ۲ ۲ ۱ ھ
ہوئے روشن گہر، جنت میں داخل
۰ ۰ ۰ ۲ ھ

۱ جون ۲۰۰۰ء جمعرات و جمعہ کی درمیانی شب مطابق ۵، ربیع الاول ۔۱۴۲۱ھ☆

✿

☆ متفرقات ۔ص ۱۰۸

باب ہشتم

احباب

پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین صاحب

آپ حضرت سیدنا محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کے بزرگوں میں سے اورنگ زیب عالم گیرؒ کے زمانے میں سید بہار شاہ علیہ الرحمہ بغداد شریف سے ہندوستان تشریف لائے۔ اور تلے گاؤں دساسر (ضلع امراؤتی، برار) میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ وہاں ایک مسجد اور خانقاہ بنوائی جہاں لوگوں کی اصلاح وتلقین میں مصروف رہے۔ ہر سال محرم میں وہاں ان کا عرس مبارک ہوا کرتا ہے۔

ان کی اولاد میں حضرت سید عنایت محی الدینؒ تھے۔ ان کے تین فرزند ہوئے۔ سب سے بڑے سید منتخب الدین صاحب (عرف افسر میاں)، دوسرے سید فیروز الدین صاحب (عرف شفقت میاں) اور سب سے چھوٹے ہمارے پروفیسر صاحب (عرف اشفاق میاں) ہیں۔ دو بہنیں ہیں اور سب کے سب متقی ہیں۔

بڑے بھائی صاحب (یعنی افسر میاں) اپنے گاؤں میں جائیداد وغیرہ کی نگرانی فرماتے ہیں۔ دوسرے بھائی یعنی شفقت میاں نے علی گڑھ سے ۱۹۳۶ء میں بی اے کیا، پھر ناگپور میں انجمن اسلامیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ بمبئی یونیورسٹی سے ''شاہ ولی اللہؒ اور ان کا فلسفۂ تعلیم'' پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ زہد وتقویٰ میں ایک مثالی حیثیت کے مالک تھے۔ کئی حج بھی ادا کئے۔ افسوس کہ ۵ مئی ۱۹۹۰ء (۴ شوال ۱۴۱۰ھ) کو انہوں نے داغ مفارقت دیا۔ ان کی لوح مزار کے لئے یہ قطعۂ تاریخ عرض کیا تھا۔

آہ دنیا سے ہو گئے رخصت
جن سے ظاہر تھی خوب شرع متیں

سب پہ ان کی ہمیشہ شفقت تھی
کون ہے جس کو اعتراف نہیں
ان سے، بھٹکے ہوؤں نے پائی راہ
کتنے لوگوں نے چھوڑا بغض و کیں
اے خدا لطفِ خاص ان پہ رہے
تیری رحمت پہ ہے ضرور یقیں
راسِ شفقت ہے جنت الفردوس
جمعہ ۵ مئی ۱ ۹ ۹ ۰ ء
کامل ارشاد تھے فیروز الدیں
۴ شوال ۱ ۴ ۱ ۰ ھ

پروفیسر رفیع الدین صاحب ۱۴ جنوری ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ تلے گاؤں میں دوسری جماعت تک تعلیم پائی تھی کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس لئے ننھیال میں رہ کر داروہ (ضلع ایوت محل۔ برار) میں مڈل اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ پھر محمد علی اسکول، جامع مسجد دہلی سے ۱۹۳۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ تشریف لے گئے۔ وہاں انٹرمیڈیٹ ۱۹۳۵ء بی اے (۱۹۳۷ء میں)۔ اور ایم اے (عربی)، نیز بی ٹی ایچ (۱۹۳۹ء میں) پاس کیا۔ وہاں سے فارغ ہوکر آپ حیدرآباد (دکن) کے ورنگل ہائی اسکول میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ پھر انوار العلوم ہائی اسکول میں تقرر ہوا۔ وہاں ایک سال قیام رہا۔ اس کے بعد آلند ہائی اسکول میں (گلبرگہ شریف کے قریب) ڈیڑھ سال تک ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو پبلک سروس کمیشن نے آپ کو Moris College ناگ پور میں لیکچرر مقرر کیا۔ پھر وہیں پروفیسر کی حیثیت سے ۱۹۷۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ ناگ پور یونیورسٹی ہی سے آپ نے ایم اے (اردو) ۱۹۴۴ء میں ایم اے (فارسی) ۱۹۴۶ء میں اعلیٰ درجے میں پاس کرلیا تھا۔ چنانچہ آپ ناگ پور یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی، نیز شعبۂ اردو کے بھی صدر رہ چکے ہیں۔ وہیں سے آپ نے ''اردو میں نعتیہ شاعری'' پر مقالہ لکھ کر ۱۹۵۴ء میں پی

ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اب ۱۹۹۲ء میں پاکستان نعت اکیڈمی نے خصوصی طور پر آپ کو کرایہ دے کر بلوایا اور اعلیٰ انعام (۱۴ نومبر کو) پیش کیا۔ آپ ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کے ممتحن رہے ہیں اور وہاں کی اعلیٰ مشاورتی کمیٹیوں کے رکن بھی ہیں۔

علی گڑھ کے قیام کے زمانے سے آپ کی محبت اور خلوص نے راقم الحروف کو بہت متاثر کیا۔ میں کنگ ایڈورڈ کالج۔ امراؤتی (برار) میں دس سال تک اردو پڑھاتا رہا۔ پھر ۱۹۴۷ء میں میرا تبادلہ مارس کالج ناگ پور کو ہوگیا۔ اس طرح ان کے بزرگوں اور عزیزوں سے بھی نہایت مخلصانہ تعلقات رہے۔ اور ناگ پور میں تو ہمیشہ میرا اور میرے عزیزوں کا قیام انہی کے بنگلے میں ہوا کرتا تھا۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں فسادات کی وجہ سے مجھے کراچی آنا پڑا۔ وہاں آنے کے چند روز بعد میرے شیر خوار بچے اور اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ محترم رفیع الدین صاحب نے مجھے دسمبر میں خط لکھا کہ تین ماہ کے لئے ناگ پور واپس آجائیں۔ اس کے بعد موسم گرما کی تعطیل ۲ ماہ کی ہوگی تو اس تعطیل میں واپس کراچی جاسکتے ہیں۔ ان کے مشورے پر میں نے ناگ پور جانے کی ہمت کی اور حسب معمول آپ ہی کے بنگلے میں قیام کیا لیکن پھر چند روز کے بعد سراج احمد کی بیماری کی اطلاع ملی تو میں نے گیارہ سال کی گزیٹڈ پوسٹ ترک کردی اور پاکستان مستقل طور پر آگیا۔ لیکن آپ کی عنایت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ سراج احمد بارہا یہاں سے اپنے بچوں کے ساتھ ناگ پور گئے اور آپ ہی کے یہاں قیام کیا۔ ان سب پر آپ کی شفقتیں رہیں اور میں بھی جب کبھی ہندوستان گیا تو ہمیشہ آپ سے مستفیض ہوتا رہا۔ میری درخواست پر دسمبر ۱۹۸۵ء میں آپ نے غریب خانے کو عزت بخشی اور ہوائی جہاز کا کرایہ (آنے جانے کا) خود برداشت فرمایا۔ اور دوسری بار نومبر ۱۹۹۲ء میں بھی اسی سعادت سے مجھے نوزا۔ ان کی والدہ ماجدہ مرحومہ بھی مجھ پر بڑی شفقت فرماتی تھیں۔ ان کے انتقال پر میں نے یہ قطعۂ تاریخ عرض کیا تھا۔

گذشت افسوس آں مخدومۂ ما
کہ از فوتش بُود ہر چشم پرنم

سراپا پیکر صدق و صفا بود
ز فیض مصطفیٰ نور مجسم
سراپا رحم و صدق خلق و تقویٰ
۱۲ مئی ۴ ۶ ۹ ۱ء
مقیم خلد شد مقبولہ بیگم
۲۹ ذی الحجہ ۳ ۸ ۳ ۱ھ

پروفیسر ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب (حال صدر شعبۂ اردو۔ سندھ یونیورسٹی) نے رسالہ تحقیق کے خصوصی نمبر ۴ (۱۹۹۰ء) میں مجھ عاجز کے متعلق مختلف حضرات سے مضامین لکھوائے تو پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے بڑی تفصیل سے میرے تعلقات پر فاضلانہ مقالہ لکھا جو وہی لکھ سکتے تھے۔ اس کے حرف حرف سے محبت اور اخلاص کے انوار ظاہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے سب عزیزوں کو دونوں جہانوں کی سرفرازی عطا فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین ☆

☆طوبیٰ لہم۔ ص ۳۷

پروفیسر محمد طاہر فاروقی

پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب مرحوم سے میرے تعلقات ۱۹۳۸ء سے شروع ہوئے تھے جب کہ انہوں نے آگرہ میں جامعہ اردو کی بنیاد ڈالی تھی۔ میں اس زمانے میں کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں اردو پڑھاتا تھا۔ مرحوم "جامعہ اردو" کے رجسٹرار بھی تھے اور آگرہ کالج میں بھی استاد تھے۔ وہ کہنے کو تو اس جامعہ کے رجسٹرار تھے لیکن حقیقت میں وہ اس کے سب کچھ تھے۔ یعنی اس کے سرپرست بھی تھے، اور اس کے امتحانات، قواعد وضوابط، طریق کار، نصابات اور اسناد وغیرہ سے متعلق جملہ امور کے لئے خط وکتابت انہی کے قلم سے ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے جامعہ کے قواعد وضوابط مجھے بھیجے اور میری نگرانی میں امراؤتی میں اس کے امتحانات کا مرکز بنانا چاہا۔ امتحانات تین تھے:

۱۔ ادیب

۲۔ ادیب ماہر اور

۳۔ ادیب کامل

اور ان امتحانات میں ہر شخص اپنے طور پر تیاری کر کے شریک ہو سکتا تھا۔ پرچوں کی تقسیم اور نصابات کی تفصیل بہت "ادب آموز" تھی جو مجھے بہت پسند آئی۔ اس زمانے میں ہمارے کالج کا پرنسپل ایک انگریز تھا جو مسلمانوں کی تہذیب وشرافت کا بہت مداح تھا۔ اور فورٹ ولیم کالج کے نصابات سے بھی کسی قدر واقف تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور اس سے جامعۂ اردو کے امتحانات کا ذکر کیا کہ اگر ہمارے طلبہ ان امتحانات میں شرکت کریں گے، تو انہیں یونیورسٹی کے امتحانات کی تیاری میں بڑی سہولت ہوگی۔ پرنسپل بہت خوش ہوا اور اس نے

ہمارے طلبہ کے لئے خصوصی طور پر رخصت منظور کی۔ پھر مجھے موقع ملا کہ شہر کے لوگوں کو بھی رغبت دلاؤں۔ چنانچہ میں عمائدین شہر سے ملا اور بہ کثرت طلبہ وطالبات کو ان امتحانوں کے لئے آمادہ کیا۔ پھر تو شہر میں ایسا شوق بڑھا کہ کالج اور شہر کے امیدواروں کی تعداد پورے ملک کے مراکز کی تعداد سے زیادہ ہونے لگی۔

پروفیسر صاحب مرحوم اسی وجہ سے مجھ سے بہت خوش تھے اور اسی تعلق کی بنا پر ان سے میری ''نصف ملاقات'' مستقل طور پر قائم رہی۔ پاکستان بننے پر غالباً ۱۹۴۸ء میں وہ کراچی تشریف لائے۔ تو جامعۂ اردو کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر کے آگئے تھے۔ لیکن جو بیج انہوں نے بویا تھا اور جس کی آبیاری کی تھی، وہ پھل پھول کر ایک ایسا تناور درخت بن گیا تھا کہ اب ہندوستان میں ہزار ہا افراد اس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

پروفیسر مرحوم پاکستان تشریف لانے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی میں بھی استاد رہ چکے ہیں۔ لیکن پھر پشاور یونیورسٹی ہی انہیں زیادہ پسند آئی۔ غالباً اس لیے کہ ان کے بچپن کا کچھ عرصہ والد صاحب کی ملازمت کی وجہ سے پشاور ہی میں گزرا تھا۔ اسی لئے ان کی ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی تھی۔ پشاور یونیورسٹی میں وہ صدر شعبۂ اردو ہو گئے تھے۔ اور لطیفہ یہ ہوا کہ جب ان کی ترقی کا مسئلہ درپیش ہوا تو وہاں کے وائس چانسلر محمد علی صاحب نے رائے حاصل کرنے کے لئے محترم ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کو اور راقم الحروف کو پشاور طلب کیا۔ اتفاق سے وہ تاریخ پہلی رمضان المبارک کی تھی، لیکن چونکہ مرحوم کا معاملہ تھا اس لئے ہم لوگوں نے وہاں پہنچنا ضروری سمجھا۔ ہم لوگ وائس چانسلر صاحب کے دفتر میں پہنچے اور ہم دونوں نے ''ہم زبان'' ہو کر ان سے یہی عرض کیا کہ فاروقی صاحب جیسے بزرگ استاد کی ترقی کے لئے ہم لوگوں کی رائے کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ آپ خود ہی کر سکتے تھے۔ بہر حال وائس چانسلر صاحب نے فوراً ان کو عہدے کی ترقی بھی دی اور تنخواہ کے دو تین اضافے بھی منظور کر دیے۔

مرحوم طبعاً باغ و بہار قسم کے آدمی تھے۔ ان کی وجہ سے محفلوں میں زندگی پیدا ہو جاتی تھی اور ان کے قہقہوں سے در و دیوار گونجنے لگتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ ترکی تشریف رکھتے تھے تو حج کے موقع پر وہاں سے مدینہ منورہ پہنچے، میں بھی وہاں پہنچا ہوا تھا اور حضرت

مولانا عبدالغفور صاحب مدظلہ علیہ الرحمہ کے دردولت پر مقیم تھا۔ وہیں قریب ہی رباط تو تک کے ہوٹل سے مرحوم کے قہقہوں کی آواز مجھے سنائی دی۔ میں آواز پہچان گیا اور وہاں بلا تکلف داخل ہوا تو مرحوم کے قہقہوں میں اور بھی جان پڑگئی۔ پھر تو ہم لوگ بارہا حج کے دوران ملتے رہے اور اس مبارک سرزمین میں بہت سی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔

مرحوم کی زندہ دلی کا ایک واقعہ عرض کروں۔ میرے پاس مرزا طپش کی ایک بیاض ہے جس پر ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے ایک مقالہ نقوش میں شائع کیا تھا۔ یہ بیاض مجھے برادرم محترم پروفیسر حمید جالندھری نے عنایت فرمائی تھی۔ طاہر صاحب کے پاس مرزا طپش کا کلیات تھا۔ ان کو اس کی نقل کے لئے لکھا۔ تو جواب دیا کہ مجھے ایک صاحب کے انتقال کا انتظار ہے۔ اس کے بعد دوں گا۔

مرحوم میری درخواست پر بارہا سندھ یونیورسٹی کے ایم۔اے کے ممتحن مقرر ہوئے اور بارہا ڈاکٹریٹ کے زبانی امتحانوں کے لئے تشریف لائے۔ غالباً ۱۹۷۶ء کی بات ہے کہ اپنی کمزوری اعصاب کی وجہ سے فرمانے لگے کہ ''شاید میں اب نہیں آؤں گا'' ان کا یہ جملہ میرے دل میں اتر گیا۔ بڑی تشویش ہوئی میں نے عرض کیا کہ اب تو آپ کو ضرور بلواؤں گا اور شکر ہے کہ وہ ڈی لٹ کے زبانی امتحان کے لئے یہاں تشریف لانے پر مجبور کئے گئے۔ اس کے بعد افسوس ہے کہ ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ لیکن ''نصف ملاقات'' آخر وقت تک جاری رہی۔

طاہر صاحب آگرہ میں فارسی بھی پڑھایا کرتے تھے۔ لیکن پاکستان آکر انہوں نے اردو ہی کو اختیار کیا۔ وہ فارسی نیز اردو میں ایم۔اے تھے اور عربی میں بھی کلی مہارت رکھتے تھے۔ انگریزی برجستہ اور بلاتکلف لکھتے بھی تھے اور بولتے بھی تھے۔ اور ہر زبان میں ان کا خط نہایت پختہ اور پاکیزہ تھا۔ آگرہ کے جامعہ اردو ہی نے ان کو ''دکتور ادب'' کی سند دی تھی اور وہیں انہوں نے ۱۹۳۸ء میں سیرتِ اقبال لکھی تھی جو ادیب کامل کے خصوصی مطالعے والے پرچے کے لئے داخل نصاب تھی۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ ۱۹۷۸ء تک اس کے پانچ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ کتاب میں مرحوم برابر ترمیم واضافہ فرماتے رہے اور زیادہ مفید بنانے کی کوشش میں رہے۔ پروفیسر حمید احمد خان مرحوم نے اس کے متعلق فرمایا تھا:

> پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے اقبال کے کلام کی نبض پہچانی ہے اور ٹھیک اسی جگہ پر ہاتھ رکھا ہے جہاں ایک صاحب ذوق اور سخن فہم شارح کو رکھنا چاہیے تھا۔ یہ کتاب علامہ اقبال کے افکار کی اچھی شرح ہی نہیں بلکہ کلام اقبال کا ایک پاکیزہ انتخاب بھی ہے جس میں اقبال کی زندگی کے کسی حصہ اور ان کی کسی فارسی یا اردو تصنیف کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

بہر حال یہ کتاب کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لئے اقبالیات سے متعلق بہت مفید ہے اور غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اکثر طلبہ کو اقبال سے شغف اسی کتاب سے عموماً پیدا ہوا ہے۔ علامہ اقبال کی وفات ۱۹۳۸ء سے لے کر کتاب کے پانچویں ایڈیشن (۱۹۷۸ء) کے زمانے تک بہ کثرت طلبہ اس سے مستفید ہوئے ہیں۔ اور ان شاء اللہ آئندہ بھی مستفید ہوتے رہیں گے۔

اس کتاب کے علاوہ مرحوم نے حکومت کے ایما پر صد سالہ تقریب ولادت اقبال، کے موقع پر ایک شاندار کتاب "اقبال اور محبت رسول ﷺ" (۲۳۱ صفحات) بھی لکھی ہے۔ جس میں عشق، عشق رسول، اطاعتِ رسول ﷺ، انسان کامل، قرآن حکیم ارمغان عقیدت نغمات شوق وغیرہ ابواب ہیں اور موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل مکمل ہے۔

مرحوم کی چند اور کتابیں بھی ہیں۔ یعنی چمنستانِ ادب، مختصر تاریخ ادب فارسی، سرکار دو عالم ﷺ، انتخاب مراثی انیس و دبیر، فصاحت و بلاغت اور فن نثر نگاری وغیرہ۔ لیکن موخر الذکر کتاب (یعنی فن نثر نگاری) ان کے علمی ادبی تجربات کا نچوڑ ہے۔ اس کا موضوع تو عام ہے۔ لیکن وہ زندہ رہنے والی کتاب ہے اور اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ پھر اس کا انداز بیان بھی نہایت سادہ اور دل کش ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں ہماری یونیورسٹیوں کے طلبہ کو زبان و ادب کے متعلق وہ سب کچھ مل جائے گا، جو بڑی بڑی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد بھی بہ مشکل حاصل ہو سکے گا۔ اس میں ۲۸۱ صفحات ہیں۔ اور اس کے عنوانات یہ ہیں۔

جنس (تذکیر و تانیث)، تعداد (واحد و جمع) مرکب الفاظ، مترادف الفاظ، متضاد الفاظ، متشابہ الصوت الفاظ، خاص مقاصد کے لئے خاص الفاظ، سابقے اور لاحقے، تلفظ،

علامت فاعل (نے) علامتِ مفعول (کو) مطابقت فعل، مطابقت صفت و موصوف، ایک فعل کی بجائے دوسرا فعل، کچھ الفاظ کا صحیح استعمال، جملے، چند بنیادی مشورے، کلام کے نقائص، پیراگراف بنانا، عنوان، آغاز و اطناب، خلاصہ لکھنا، مفہوم نویسی ترجمہ کرنا، شعر کی تشریح، بیان، مکالمہ، روزمرہ اور محاورہ، محاورات، ضرب الامثال، تلمیحات، کہانی، خط و کتابت، مضمون نگاری، رموز و اوقاف، فصاحت و بلاغت، علم بیان، چند اصطلاحات، اقسام نثر و نظم، گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے اور اہل قلم حضرات کے لئے وہ سب کچھ یک جا کر دیا ہے۔ جس کی ضرورت ناگزیر ہے۔ یہ کتاب مرحوم نے ۱۹۷۲ء میں لکھی تھی لیکن وہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہو سکی۔ اس میں فصاحت و بلاغت سے متعلق اس طرح بحث فرمائی ہے۔

> جس کلام میں قواعدِ زبان کی غلطی نہ ہو۔ جو روزمرہ کے مطابق ہو، جس میں غریب و ناموس الفاظ نہ ہوں۔ جس میں تعقید یا اور کوئی عیب نہ پایا جائے۔ فصیح کہلاتا ہے، اور اس کی اس صفت کو فصاحت کہتے ہیں۔ الفاظ کی بے جا تکرار، ثقیل اور نامانوس حروف کی بھرمار جن کا تلفظ، بولنے اور سننے میں بدمزگی پیدا کرے۔ فصاحت میں خلل انداز ہوتے ہیں،۔ ان سے احتراز ضروری ہے، یاد رکھئے کہ فصاحت کا تعلق الفاظ سے زیادہ ہے، اور معنی سے کم۔ ہوسکتا ہے کہ اچھے معانی ہوں۔ مگر بیان میں فصاحت نہ ہو۔ ایسی صورت میں کلام کا اثر کم ہو جاتا ہے، بلکہ بعض اوقات ذوق سلیم اسے قبول نہیں کرتا...... کسی فصیح کلام میں بھی اثر اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک وہ کلام، مقتضائے حال کے مطابق نہ ہو، یعنی اس میں عمر، رتبے، موقع، حالت، کیفیت، منظر، اصلیت وغیرہ کی کامل رعایت نہ کی گئی ہو۔ تو ایسا کلام جو فصیح ہو اور مقتضائے حال کے مطابق ہو بلیغ کہلاتا ہے۔ اور کلام کے اس وصف کو بلاغت کہتے ہیں۔

دراصل مرحوم نے ۱۹۵۹ء میں فصاحت و بلاغت کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اور جس میں فصاحت و بلاغت، بیان و بدیع اور اصناف نثر و نظم سے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی تھیں انہی پر اضافہ اور انہی کا تکملہ اس کتاب (فن نثر نگاری) میں پایا جاتا ہے، جو ایک طالب

علم یا استاد کے لئے بہت ضروری ہے۔ بعض چھوٹی چھوٹی باتیں تو ایسی بھی ہیں جن سے عموماً پڑھے لکھے بھی کم واقف ہیں۔ اور ان میں فرق نہیں کرتے۔ مثلاً ان کے الفاظ کے خصوصی استعمال پر غور فرمائیں۔

سنسناہٹ، گرج، کڑک، گٹ گٹ، قلقل، دنادن، دھائیں۔ کھنک، ٹاپ، گونج، گھمر، چوں، تھاپ، آس، تاناری ری وغیرہ۔

یا یہ الفاظ دیکھئے:

بھیڑ، جماعت، حلقہ، ٹولی، دستہ، پرا، ٹکڑی، گپھا، جھنڈ، ڈار، بیڑا، گچھا، کنج، گہل (گہل)، جتھا، گھٹا، تھئی، گڈی، طومار، ڈھولی، ریوڑ، گلہ، جھرمٹ یا جھومر، دَل، لچھا، کنجی، جھلڑ، بنسواڑا، امریاں، فالیز وغیرہ۔

ان کیفیات کا فرق قائم کیجئے:۔

چمک، ڈلک، آب، دمک، بھبک، مہک، لپٹ، تڑاکا، جُھن جُھن، جَھن جَھن، چرخ چوں، گھوں گھوں وغیرہ۔

مسکنوں کے نام دیکھئے:

محل، حرم، رنواس، حویلی، حجرہ، آشرم، تکیہ، کٹیا، جھونپڑا، بارک، چھاؤنی، کوٹھی، بنگلہ، چھتا، بل، بھٹ، ہانبی، تھان، کھڑک وغیرہ۔

پھر آوازوں کے فرق کا جائزہ لیجئے۔

ممیانا، ہنہنانا، دھاڑنا، چنگھاڑنا، بھونکنا، رینکنا، رانبھنا، ڈکارنا، کوکنا، غٹرغوں کرنا، کُوکڑانا، رٹنا، چنگھاڑنا، ہوکنا، بلبلانا، بغبغانا، چہچہانا، بھنبھنانا، ٹرانا، جھنکارنا، پھنکارنا، چٹ چٹانا، گھگیانا وغیرہ۔

میرا تو خیال ہے کہ مرحوم نے اس سلسلے میں وحید الدین سلیم اور پنڈت کیفی کے کاموں میں خاصا اضافہ کیا ہے۔ اور ان کی یہ کتاب چھوٹے بڑے ہر درجے والوں کیلئے بہت مفید ہے۔

آخر میں ایک بات اور قابل ذکر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مرحوم اپنے چچا زاد بھائی پروفیسر حامد حسن قادری اور پروفیسر زیدی مرحوم کی طرح نقشبندیہ مجددیہ کے سلسلہ تصوف میں داخل تھے اور اسی رشتے کی وجہ سے وہ راقم الحروف کے متعلق بھی نیک گمان رکھتے تھے۔ مرحوم

کے روحانی تواضع اور عظمت کا اندازہ ان کے آخری ایام کے ان مکتوبات سے ہوسکتا ہے جو انہوں نے اس حقیر کو لکھے تھے اور جو تاریخی اعتبار سے بھی کسی کے لئے مفید ہوسکتے ہیں۔ وہ مکتوبات یہ ہیں:

(۱)

محلہ کریم شاہ بخاری۔ پشاور شہر

۲۰ مئی ۱۹۷۸ء

مخدومی ومطاعی، سیدی ومولائی دامت برکاتہم ومدت ظلالکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ وبرکاتہٗ ۔ ۱۶ مئی کا کارڈ پرسوں مل گیا تھا۔ فوری جواب سے تغافل اس لئے برتا کہ کتاب کا عطیہ بھی وصول ہوجائے تو شکریہ وامتنان شامل کرلوں۔ چنانچہ آج ''اقبال اور قرآن'' کا پارسل بھی مل گیا۔ الحمدللہ

صرف چند نسخے انہوں نے بھیجے ہیں۔ اس لئے اس عطیے میں خصوصی کرم زیادہ سے زیادہ ہے۔ شکرئے کے بہت سے الفاظ وعبارات لکھ کر اس نوازش وکرم پر حرف نہیں لانا چاہتا۔ بس اتنا عرض کرتا ہوں کہ یہ گراں قدر عطیہ میری بساط وحیثیت سے بالاتر ہے۔ اپنی خوش بختی پر نازاں ہوں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء

سید نور محمد سرور اکبرآبادی صاحب کا مقالہ ان شاءاللہ اس ہفتے میں پیش ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے تکمیل کے مراحل سے گزارا ہے۔ تو ماقبی امور کی تکمیل وتوثیق فرمائے گا۔ ''وہوالمستعان''

''اقبال اور قرآن'' دو گھنٹے ہوئے نازل ہوئی ہے۔ اب تک اسی کے مطالعے میں مستغرق تھا۔ ابتدائی صفحات اور سیر کا مرحلہ گزار کے عریضہ ارسال خدمت کرنے لگا ہوں۔ کتاب کی تمام نظر غائر سے مطالعے کی متقاضی ہے۔ اوسط علمیت والے اور منتہی سب ہی کے لئے اضافے کی ضامن ہے۔ آپ نے بڑا کام کردیا ہے۔ وہی رب العزت صلہ عطا فرمائے گا۔

میں نے آج ڈاکٹر معزالدین صاحب کو خط لکھا ہے تو پوچھا ہے کہ ''اقبال اور قرآن'' مصنف تک پہنچی یا نہیں؟ یہ بھی لکھا ہے کہ فروری میں آپ نے امید بندھائی تھی۔ اور

سرکاری دفاتر کب کام میں مستعدی دکھاتے ہیں۔ ساتھ ہی آج ایک خط عبدالغفور صاحب کو اسلام آباد لکھا ہے۔ تاکہ وہ معاوضے کی ادائیگی کی تحریک کریں۔ آپ مناسب سمجھیں تو کچھ زور دے کر اسی طرح خط لکھئے گا۔ ان شاء اللہ مفید مطلب ہوگا۔

میری صحت گرتی جارہی ہے۔ دوا احتیاط کرتا رہتا ہوں۔ مگر بات اب دعاؤں پر آ گئی ہے۔ کرم اور توجہ فرمائیے۔ احسان دانش کا ایک شعر ہے۔

محبت میں مکان ولامکاں ہیں دو قدم لیکن
مجھے یہ دو قدم چلنا بھی مشکل ہوتا جاتا ہے

اس شعر میں ذرا سی ترمیم کر لیجئے تو میرے حسب حال ہو جائے گا۔

بصارت گھٹتی جاتی ہے نقاہت بڑھتی جاتی ہے
مجھے اب دو قدم چلنا بھی مشکل ہوتا جاتا ہے

دعائے خیر کا محتاج
کم ترین
محمد طاہر فاروقی

(۲)

پشاور
۲۹ جون ۱۹۷۸ء

مخدوم ومکرم ومحترم مدظلکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ کل کرم نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ

ڈاکٹر معزالدین صاحب کو آپ خط نہیں لکھتے تو اسلام آباد کو لکھئے۔ یوں تحریر فرمائیے کہ کتاب تو آگئی۔ اب شاید ماقبی کی رقم کی ادائیگی آپ کے یہاں سے ہونی ہے تو کرم کیجئے۔ اس طرح شکایت کا پہلو بچ جائے گا۔

اسلام آباد کا پتہ یہ ہوگا" جناب عبدالغفور صاحب سیکشن آفیسر، وفاقی وزارت تعلیم مکان نمبر ۲۹ سیکٹر ۴/۷۔ اسلام آباد" ناسازی مزاج کا حال معلوم کر کے سخت تردد ہوا۔ اس کا

ایک سبب گرمی بھی ہے۔ لیکن اصل باعث وٹامن کی کمی ہے۔ اس عمر میں بی کمپلیکس اور ملٹی وٹامن دواؤں بعد غذا کے استعمال کرنا از بس ضروری ہیں۔ اور ان کو کبھی ترک نہیں کرنا چاہیے۔ میری بھی ایسی ہی تکلیف ہو گئی تھی۔ یا شاید کچھ زیادہ۔ ایک نیک ڈاکٹر دوست کے مشورے سے یہ دوا میں استعمال کیں۔ عرق عنبر سادہ کا عمل بھی یہی ہے۔ اعصابی کمزوری دور ہو جائے گی تو سارا معاملہ بہتر ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ منسلکہ کاغذ پر وٹامن گولیاں / کیپسول کے نام لکھے ہیں۔ ضرور استعمال فرمائیے۔ چند ہفتوں ہی میں فائدہ نظر آئے گا۔ مگر استعمال اب مستقل جاری رکھنا (میری رائے میں) قطعاً لازم ہے۔ اللہ فضل فرمائے گا۔ زیادہ آداب

کمترین

محمد طاہر فاروقی

ھو الشافی

(۱) Trvidox Tableti (Abbott) ایک ایک ٹکیہ صبح شام بعد غذا

(۲) Gptilets (Abbott) صبح ناشتے کے بعد

یا دوپہر کے کھانے کے بعد

ایک ٹکیہ (یا یہی ٹکیہ کہیے) صبح بعد غذا۔

(۳) Viterra (Pfizer) ایک کیپسول بعد غذا۔

(۴) Capsules شام کو نمبر ۱ کے ہمراہ

(ہمدرد یا اجمل خان، طبیہ کالج کا) عرق عنبر سادہ نہار منہ بہتر ہے۔

اس کی خوراک ڈھائی تولہ سے پانچ تولہ ہے۔ آپ ڈھائی تولہ استعمال فرمائیے۔

اوقات: (۱) تہجد یا فجر کے بعد (نہار منہ) عرق عنبر سادہ۔

(۲) صبح ناشتے یا دوپہر کھانے کے بعد Trividox ایک اور Gptilets ایک

(۳) شام / رات کھانے کے بعد Trivivox ایک Veterro ایک۔

(۳)

محلہ کریم شاہ بخاری۔ عقب میٹرو سینما۔ پشاور شہر

۱۲ جولائی ۱۹۷۸ء

مخدومی و معظمی قبلہ و کعبہ مدظلکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ

امید ہے کہ مزاج گرامی قریب اعتدال ہوگا۔ مجی..... کا کرم نامہ آیا۔ وہ شعبے کے معاملات سے بے حد پریشان اور اس ملحد...... بڑے ادب سے التماس ہے کہ توجہ فرمائیے اور اس انتشار اور پریشانی سے نکالئے۔ ..... کی پراگندگی و اضطراب کا مجھے اندازہ کرنا دشوار نہیں۔ ایسے میں زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ آپ کے کرم اور دست گیری کی بجا طور پر احتیاج اور التجا ہے۔ ''بر کریماں کارہا دشوار نیست''..... ضرور توجہ فرمایئے۔ عین نوازش ہوگی۔

سیرت اقبال کا نیا ایڈیشن طبع ہو کر آ گیا۔ انہوں نے جو جلدیں بھیجی ہیں وہ ابھی مجھے نہیں ملیں۔ آج کل میں آ جائیں گی تو حاضرِ خدمت کروں گا۔ یہ طباعت نہایت دیدہ زیب مکمل اور خوش نما ہے۔ آج کل کے لحاظ سے انہوں نے قیمت بھی بہت واجبی رکھی ہے۔ ان شاء اللہ آپ اسے ظاہر و باطن ہر لحاظ سے پسند فرمائیں گے۔

ڈاکٹر معز الدین صاحب کو پرسوں پھر خط لکھا ہے..... اپنے اور آپ کے دونوں کے بقایا کی ادائیگی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ خدا آسان فرمائے۔ زیادہ آداب۔

کم ترین

محمد طاہر فاروقی

(۴)

پشاور ۱۵ جولائی ۱۹۷۸ء

مخدومی و مطاعی مدظلکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ مورخہ ۱۲ جولائی صادر ہوا۔ میں نے بھی دو دن ہوئے عریضہ ارسال خدمت کیا ہے۔ ممکن ہے آج ہی ملا ہو۔ اس میں خاص طور پر...... کی پریشانی اور تشویش کا ذکر کر کے التماس کی ہے ان کی دست گیری اور مشکل کشائی فرمائیے۔ تاکہ یونیورسٹی کا کام آساں

ہو اور وہ ذہنی کوفت سے نجات پائیں۔

دواؤں کی بابت ڈاکٹر صاحب اور حکیم صاحب کے مشورے معلوم ہوئے۔

۱۔عرق عنبر سادہ، ۲۔خمیرہ ابریشم ارشد والا، ۳۔ٹریوڈاکس اور ان کے ساتھ ملائیے

۴۔ملٹی ویٹامن۔ملٹی ویٹامن کی سادہ لمبی ٹکیاں شیشی میں نہیں آتیں۔بڑے بڑے ہوتے ہیں۔سوا پانچ ساڑھے پانچ روپے سیکڑا ملتی ہیں۔وہ ہلکی ہوتی ہیں۔سو منگوا لیجئے۔

عام طور پر تین روزانہ (صبح دوپہر شام) کھائی جاتی ہیں۔آپ کم از کم دو ضرور استعمال میں رکھئے۔یہ سب دوائیں ابھی سے پابندی سے جاری رہیں۔تو ان شاء اللہ نمایاں فائدہ ہوگا۔اور رمضان شریف میں بہت سہولت رہے گی۔رمضان شریف میں بھی افطار کے وقت، تراویح کے بعد اور سحری کے وقت، تین اوقات میں تقسیم کر کے یہ دوائیں جاری رکھئے۔ ان شاء اللہ عام نقاہت اور اعصابی کمزوری سب کا تدارک ہو جائے گا۔وھوالمستعان۔

گھر سے نکلنا مشکل ہوگا۔طبیعت بفضلہٖ ٹھیک ہے۔مگر گھر کی چوکیداری بھی ایک کام ہے۔میں جاؤں تو بیوی پابند ہو جاتی ہیں۔بہر حال بخیری گذرد۔دعاؤں کا محتاج

کم ترین

محمد طاہر فاروقی

(۵)

پشاور۔۱۲ اگست ۱۹۷۸ء

مخدومی و مطاعی مولائی و مرشدی مدظلکم العالی

السلام علیکم، آداب مسترشدانہ

گرامی نامہ مورخہ ۶ اگست کو مل گیا تھا۔آپ کی دعائیں میرے لئے موجب تقویت ہیں۔خدا مجھے آپ کے کلمات خیر کا اہل بنائے! منجھلے صاحب زادے سیدو شریف میں ہیں۔ میں ان کو شہد کے لئے خط لکھ چکا ہوں۔اب آپ کے لفافے سے اور تقویت ہوئی۔آتا ہوگا۔ ضرور استعمال کروں گا۔شہد کے استعمال سے شکر کی تکلیف بڑھ جاتی ہے۔اس لئے اس سے گریز کیا تھا۔اب استعمال کی پکی نیت ہے۔اللہ راس لائے گا۔

بھی ڈاکٹر شمس الدین صدیقی صاحب اپنے کام سے لاہور گئے تھے۔ ڈاکٹر معز الدین صاحب سے اپنے پیسے وصول کرلائے۔ ڈاکٹر معز الدین صاحب نے (ان کے بیان کے مطابق) سب پیسے خرچ کرکے برابر کیے۔ اب کتابوں کی فروخت سے جو آتے جاتے ہیں۔ وہ مصنفین کو بھیجتے ہیں۔

شمس الدین صاحب کے تو تھوڑے ہی تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر عشرت حسین کے انگریزی مقالے کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ ''اقبال کی مابعد الطبیعات'' ترجمہ نہایت عمدہ اور قابل فہم ہے۔ انگریزی سے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس سے سب سمجھ میں آگیا۔ جزاء اللہ خیر الجزاء

پاکستان میں جھوٹ بولنا کارِ ثواب سمجھا جاتا ہے۔ کم سے کم ۹۵ فی صد آدمی جھوٹ بولتا ہے۔ ...... کے اقوال زریں ہی اسی ذیل میں سمجھتا ہوں۔

دوا کی بابت میں نے اپنے دوست اور معالج ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا تھا۔ چھوٹتے ہی بولے کہ ''یہ دوا تو پیٹ کے السر کے لئے ہے۔ اب نئی دوا آئی ہے۔ اور السر میں بہت استعمال کی جاتی ہے''۔ کیا آپ کو پیٹ میں زخم تجویز ہوا ہے؟ بری چیز ہے۔ مگر اس کا ہومیو پیتھک علاج بہت آسان اور اچھا ہے۔ میں خود باوجود اناڑی پن کے کئی مریضوں پر کامیاب علاج کر چکا ہوں۔ اگر اس دوا نے فائدہ نہ کیا ہو تو وہ نسخہ عرض کروں۔ یہ جملہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ بہرحال اس وقت کے لئے تیار ہوں جبکہ صرف ان کا ہی کرم کام دے سکے گا''۔ یہ مقام بہت بلند ہے شکر ہے کہ خدا نے جناب کو نفس مطمئنہ کے اس انعام سے مالا مال کیا ہے۔ الحمد لله. رب زد فزد وهو المستعان

دعاؤں کی درخواست اور احتیاج کے ساتھ، ویسے بحمد للہ رو بہ اصلاح ہوں۔

زیادہ ادب کم ترین

محمد طاہر فاروقی

(۶)

پشاور۔ ۲۷ اگست ۱۹۷۸ء

مخدومی و مطاعی، مولائی و مقتدائی۔ مدظلکم العالی

السلام علیکم ۔ گرامی نامہ صادر ہوئے کئی دن ہو گئے ۔ جواب جلد پیش خدمت نہ کر سکا۔ افسوس ہے۔ شہد منگوالیا ہے۔ اور باالتزام کھا رہا ہوں۔ خدا کے فضل سے اب نمایاں افاقہ ہے۔ دعاؤں کی بہرحال ضرورت ہے۔ علاج میں توجہ کر رہا ہوں۔ دعائیں آپ خصوصیت سے فرمائیں۔

آپ نے یہ نہ لکھا کہ کیا واقعی آپ کو Abdominal ulcer کی شکایت ہے۔ یا ایسی تکالیف ہیں جن سے پیٹ میں زخم کا احتمال ہو سکتا تھا؟ یا ڈاکٹر صاحب نے محض تیر تکا فرمایا تھا۔

بہرحال احتیاطاً اس تکلیف کی ہومیو پیتھک کی دوائیں لکھے دیتا ہوں۔ میں خود کئی مریضوں کا کامیاب علاج کر چکا ہوں۔ اگر پیٹ میں زخم کا اندیشہ ہو تو یہ دوائیں استعمال فرمائیے۔

۱۔Uraniumnit 200 ہفتہ میں دوبار یعنی ایک خوراک کے بعد تین دن کا ناغہ۔ پھر ایک خوراک پھر تین دن کا ناغہ اس طرح کچھ دن جاری رکھئے۔

۲۔Nux Vamica 30 رات کو سوتے وقت روزانہ صرف ایک خوراک، فی الحال دونوں دوائیں گولیوں میں ایک ایک ڈرام بنوالیجئے۔ پہلی تو مدتوں چلے گی۔ دوسری ختم ہو جائے تو اور منگوا لیجئے سات سے دس گولیوں تک کی خوراک، زبان پر ڈال کر چوس لیجئے اور بس۔

عبدالغفور صاحب کو مزید خط لکھنے کے ارادے میں ہوں۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ فوراً ڈاکٹر معزالدین صاحب کو لکھ دیں گے۔ اللہ مدد کرے۔ زیادہ آداب

کمترین

محمد طاہر فارقی

پشاور میں پنج شنبہ ۱۷ شوال ۱۳۹۸ھ۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۷۸ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ انا اللہ وان الیہ الراجعون ☆

☆ سراج البیان۔ ص ۳۳۱

قاضی احمد میاں اختر مرحوم

بہت لوگوں کی طرح راقم الحروف نے بھی بہت کچھ کھو کر پاکستان کا رخ کیا۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں کراچی کے محلے چاکی واڑے میں ایک چھوٹے سے مکان میں قیام کیا۔ چند ماہ بعد اسلامیہ کالج قائم ہوا تو مجھے وہاں لے لیا گیا۔ قاضی احمد میاں اختر مرحوم ۱۹۴۹ء میں کراچی تشریف لائے اور وہاں کھارادر کے ایک اچھے مکان میں قیام پذیر ہوئے۔ مشہور مزاحیہ شاعر مجید لاہوری بھی وہیں تھوڑے فاصلے پر رہتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ ان دونوں حضرات سے میری ملاقات کب اور کس طرح ہوئی لیکن میں اکثر قاضی صاحب سے ملاقات کے لئے جانے لگا۔ اس وقت بھی ان کے پاس مختلف علوم وفنون سے متعلق سیکڑوں کتابیں تھیں۔ حتی کہ مغربی موسیقی پر بھی کتابیں تھیں۔ قاضی صاحب سے کبھی کبھی علمی مشورے بھی لیتے رہتے اور ان کی بعض کتابوں سے بھی مستفیض ہوتا۔ میں پھر پیر الٰہی بخش کالونی کے ایک کوارٹر میں منتقل ہو گیا اور قاضی صاحب انجمن ترقی، اردو کے دفتر میں آ گئے۔ اس وقت ان کو صرف پانچ سو روپے ملتے تھے مجھ سے فرماتے تھے کہ ''گھر میں پانچ افراد ہیں۔ ہر فرد کا ایک ایک سو حصہ بن جاتا ہے۔'' ۱۹۵۰ء میں بابائے اردو نے اردو کالج قائم کیا تو راقم الحروف کو وہاں بلوالیا۔ قاضی صاحب پھر بندر روڈ پر ڈاؤ میڈیکل کالج کے قریب ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ میں وہاں بھی حاضر ہوتا تھا۔ معلوم نہیں، قاضی صاحب کو مجھ حقیر کے متعلق کیا مغالطہ یا مبالغہ تھا کہ بعض علمی باتوں میں مجھ سے مشورہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی رباعی کے اوزان پر بھی گفتگو کرتے تھے۔

قاضی صاحب سے مجھے غائبانہ تعارف اس وقت حاصل ہوا تھا جب کہ رسالہ مصنف (علی گڑھ) میں ان کا عالمانہ مضمون ولی سے متعلق شائع ہوا تھا۔

۱۹۵۳ء میں غالباً محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی کوشش سے سندھ یونیورسٹی کے دین دار اور علم دوست وائس چانسلر علامہ آئی آئی قاضی مرحوم نے قاضی صاحب کو اپنی یونیورسٹی میں لے لیا اور مکان نمبر ۹ ان کو الاٹ کر دیا۔ پاکستان میں غالباً حافظ محمود شیرانی مرحوم کے بعد یہ دوسری مثال ہے کہ ظاہری ڈگریوں کے بغیر محض علم وفضل کی بناء پر کسی کو یونیورسٹی میں استاد مقرر کیا ہو۔ قاضی صاحب یونیورسٹی میں آئے تو ان کی قابلیت کی دھوم مچ گئی۔ بعض اساتذہ مستقل طور پر ان سے فیض یاب ہونے لگے اور وہ خوورات کو بڑی دیر تک مصروف مطالعہ رہتے تھے اور سخت محنت کے ساتھ اپنا لیکچر تیار کرتے تھے۔ افسوس کہ وہ زیادہ عرصے تک کام نہ کر سکے اور ۱۹۵۵ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

میں نے ایک صاحب کے پاس مرحوم کی ایک بیاض دیکھی ہے جس میں بہ کثرت موضوعات اور ان کے منابع درج تھے۔ خدا جانے وہ بیاض کیا ہوئی اور کہاں گئی۔

قاضی صاحب کے عالمانہ مضامین انجمن ترقی، اردو نے شائع کر دیئے ہیں۔ راقم الحروف نے فی الحال ولی سے متعلق ان کے مضامین دیکھے ہیں۔ بہت تلاش اور کاوش سے لکھے گئے ہیں۔ بعض صفحات میری دلچسپی کے ہیں۔ مثلاً:

ولی پر قاضی صاحب کے کئی مضامین ہیں۔ انہیں گجراتی کہیے یا دکنی کہیے۔ ایک ہی بات ہے کیونکہ دکن کا اطلاق جنوبی ہند کے علاقے پر ہوتا تھا جو دریائے نربدا سے لے کر گجرات تک اور جنوب میں مدراس اور راس کماری تک تھا۔

صفحہ ۲۷۔ علی رضا، ولی کے پیر تھے اور وہ علامہ فرخ شاہ (ابن حضرت خواجہ محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ ابن حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ) کے صاحبزادے تھے۔ لیکن علوم سیمیا، کیمیا، ریمیا اور نغمہ وسماع سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ پھر توبہ کر کے اپنے والد صاحب سے رجوع ہو گئے تھے۔ گجرات چلے گئے تھے۔ وہیں ان کے پانچ صاحب زادے تھے۔ (۱)

قاضی صاحب نے ولی پر بہت عمدہ تحقیق کی ہے۔ لیکن اس زمانے میں کئی ولی تھے۔ ایک ولی ویلوری تھے جنہوں نے روضۃ الشہداء، روضۃ العقبیٰ، روضۃ الانوار لکھی تھیں (۲)۔ ایک اور ولی اسی عصر کے تھے اور انہوں نے بھی روضۃ الشہداء لکھی تھی۔ اس کا نسخہ میرے ایک

۱۔ گلشن وحدت، کراچی ۱۹۶۶ء ص ۱۷۲-۱۷۶

۲۔ معارف، جنوری ۱۹۴۰ء

کرم فرما لطیف الرحمن صاحب نے مجھے عنایت کیا تھا اور وہ قاضی صاحب کے یہاں ان کی وفات کی وجہ سے رہ گیا۔

صفحہ ۷۸، جھرنا (رسنا) کو گجراتی میں کہا ہے۔ لیکن وہ اور بعض دوسرے الفاظ جو گجرات سے مخصوص کیئے گئے ہیں وہ جبل پور (سی۔ پی) تک میں بولے جاتے ہیں۔

صفحہ ۷۸۔ گجرات میں بنیوں کو بقال کہتے ہیں۔ لیکن یہ گجرات تک مخصوص نہیں۔

صفحہ ۷۹۔ مناہی ممانعت کے معنی میں گجرات میں بولا جاتا ہے۔ بے شک لیکن وہیں کے لئے نہیں ہے۔ انیس کا مصرع ہے۔

گھر میں سادات کے، پانی کی مناہی ہے آج

صفحہ ۹۵۔ ۹۷ میں دکنی کی بات ہے۔ ولی ویلوری کے سلسلے میں عرض کیا گیا تھا کہ اشتیاقی نے ۱۰۰۴ھ میں مثنوی اساس المصلی کو دکنی کہا ہے۔ (۳)

صفحہ ۱۵۱۔ پور سیلاب کے معنی ہیں جبل پور میں بھی بولا جاتا ہے۔ جھانجھ پھٹکار بھی وہاں بولا جاتا ہے۔

صفحہ ۱۵۲۔ سال دینا بھی وہاں بولتے ہیں۔

صفحہ ۱۵۵۔ ادھر (مُعلّق) اُڑ (ضد) بھی وہاں مستعمل ہیں۔ حال سے بے حال ہونا بھی وہاں بولتے ہیں۔

صفحہ ۱۵۶۔ پنگا۔ تان لینا (تاننا۔ کھینچنا) چونا (ٹپکنا)۔ دھاوا (حملہ)۔ گھانا۔ گھانی۔ لٹ (بالوں کی) بھی وہاں بولتے ہیں۔ اور دوسرے مقامات میں بھی ان کا استعمال سنا ہے۔

صفحہ ۱۵۷۔ ہنسلی بھی وہاں بولتے ہیں۔ لڑکیوں اور عورتوں میں اس کا بہت رواج ہے۔

صفحہ ۱۵۸۔ زردرو گجرات ہی میں نہیں۔ وہ تو فارسی میں بھی ہے۔

راقم الحروف نے قاضی صاحب کے ولی سے متعلق مضامین دیکھے۔ مجموعے میں چند مضامین اور ہیں لیکن افسوس کہ کمزوری کی وجہ سے فی الحال ان کو دیکھنے کی طاقت نہیں۔

وما توفیقی الا باللہ☆

۳۔ معارف جنوری ۱۹۴۰ء

☆اوراق گم گشتہ۔ ص ۱۶۶

مولانا اعجاز الحق قدوسی

مولانا اعجاز الحق قدوسی صاحب مرحوم میرے دیرینہ کرم فرما تھے۔ قریب پچاس سال پہلے جب میں کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں معلم تھا تو آپ کی ایک کتاب سیرت طیبہ حاصل کرنے کے لیے اپنی عقیدت کے جذبے سے متاثر ہو کر حیدرآباد دکن حاضر ہوا تھا، کیوں کہ اس زمانے میں آپ وہیں پر قیام پذیر تھے۔ میری نوجوانی تھی اور آپ کی ادھیڑ عمر تھی، بڑی شفقت سے پیش آئے صرف اس خیال سے کہ میں نے ان کی دینی خدمات کی اس قدر قدر کی تھی۔ میں نے آپ سے وہیں کئی نسخے اپنے طلبہ کو انعام میں دینے کے لئے حاصل کئے، پھر برابر میری عقیدت مندی قائم رہی۔ پاکستان بن گیا تو آپ کو ایک علمی ادارے میں کراچی میں دیکھا اور بے حد خوشی ہوئی کہ آپ برابر دینی کام میں مشغول تھے۔ کیوں کہ آپ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ کی اولاد میں سے تھے، اس لئے بزرگان دین سے بہت وابستگی تھی۔ اسی جذبے کے تحت آپ نے پاکستان کے مختلف علاقوں کے اولیائے کرام کے حالات سے متعلق کئی کتابیں لکھیں۔ ان شاء اللہ یہی کتابیں ان کے درجات کی بلندی کے لئے گراں مایہ سرمایہ بنیں گی۔ دلی دعا ہے کہ اللہ پاک ان کے درجات عالیہ خوب خوب بلند فرمائے اور ان کی سخت کوشی اور اپنی محبت کی پیروی ہمارے نوجوانوں کو نصیب فرمائے۔ آمین بجاہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم۔ ☆

☆ اوراق گم گشتہ۔ ص ۱۶۵

ڈاکٹر ابواللیث صاحب

محب مکرم ابواللیث صدیقی (اللہ تعالیٰ ان پر لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے) میرے دیرینہ مخلصین میں تھے۔ وہ بدایوں سے انٹر پاس کر کے ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ آئے اور بی اے آنرز (اردو) میں داخلہ لیا۔ چند روز حضرت قاری ضیاء الدین احمد (۱۳۷۱ھ۔۱۹۵۲ء) کی کلاس (تجوید وقرأت) میں شرکت کی، اس لیے مجھے ان سے ملاقات کا موقع ملا۔ میں نے ۱۹۳۵ء میں فارسی میں ایم اے کیا، پھر بعض احباب کے مشورے سے ایم اے (اردو) پاس کرنے کا خیال ہوا تو مولانا احسن مارہرویؒ (م ۱۹۴۰ء) کی کلاس میں ان کی اجازت سے بیٹھنے لگا۔ کبھی کبھی پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب (م ۱۹۷۷ء) کی کلاس میں بھی چلا جاتا۔ ابواللیث صاحب سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ انہوں نے اسی وقت سے تحقیقی کاموں میں دل چسپی لینی شروع کر دی تھی۔

میں نے ۱۹۳۶ء میں ایم اے (اردو) پاس کرنے کے بعد وطن کی طرف رخ کیا۔ وہ علی گڑھ ہی میں رہے اور ۱۹۳۷ء میں آنرز پاس کر کے ۱۹۳۸ء میں انہوں نے ایم اے پاس کیا اور وہیں کچھ عرصے کے بعد لیکچرر ہو گئے۔ پھر انہوں نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں اپنا مقالہ ''لکھنو کا دبستان شاعری'' پی ایچ ڈی کے لئے تیار کیا۔ علی گڑھ میں اردو کے سب سے پہلے پی ایچ ڈی وہی تھے۔ اور یونیورسٹی میگزین کے ایڈیٹر بھی تھے۔

میں علی گڑھ سے آنے کے بعد وطن میں چند ماہ تک بے کار رہا پھر پبلک سروس کمیشن نے مجھے کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں اردو کا استاد مقرر کیا۔ وہاں دس سال رہنے کے بعد مجھے مارس کالج ناگ پور بھیج دیا گیا۔ اس عرصے میں کبھی کبھی ابواللیث صاحب سے خط

وابستگی ہوتی رہی۔ ۱۹۲۸ء کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گئے لیکن وہاں زیادہ قیام نہیں رہا۔ پھر وہ وہاں سے آکر اورینٹل کالج لاہور میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں مجھے کراچی آنا پڑا۔ اسلامیہ کالج میں دو سال اور اردو کالج میں چھ سال رہا۔ ۱۹۵۵ء میں کراچی یونیورسٹی نے ایم اے کی کلاسیں شروع کیں تو بعض حضرات کے ساتھ اردو کالج کی جماعتوں کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے ایم اے (اردو) کی جماعتیں بھی پڑھانے لگا۔

۱۹۵۶ء میں کراچی یونیورسٹی نے ابواللیث صاحب کو صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے بلوالیا۔(۱) اور مجھے سندھ یونیورسٹی نے پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر کیا۔ اس کے بعد ایم اے (اردو) فائنل کے زبانی امتحان کے لئے ہر سال (اور پی ایچ ڈی کے لئے اکثر) ان کو زحمت دیا کرتا تھا۔ فارسی کے لیے ڈاکٹر غلام سرور صاحب بھی کرم فرمایا کرتے تھے اور یہ دونوں حضرات اس عاجز کو کراچی یونیورسٹی میں طلب فرماتے تھے۔

ڈاکٹر ابواللیث صاحب جب یونیورسٹی تشریف لاتے تھے تو ان کی بیگم صاحبہ مرحومہ بھی اکثر ساتھ ہی تشریف لاتی تھیں اور میری اہلیہ مرحومہ پر کرم فرماتی تھیں۔ ان کا مختصر قیام غریب خانے ہی میں ہوا کرتا تھا۔ بیگم صاحبہ مرحومہ سے ہم لوگوں کے بہت ہی مخلصانہ تعلقات تھے۔ میں جب کراچی جاتا تو ان سے ضرور ملاقات ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے بڑے لڑکے کا نکاح پڑھانے کی بھی دعوت دی تھی اور ہمیشہ اپنے ذاتی معاملات پر بھی گفتگو فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی امتحان کے سلسلے میں کراچی حاضر ہوا تو ان کی بیگم صاحبہ نے بہت دیر تک اپنے معاملات اور معمولات بیان کئے اور پھر فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص سورۃ اذا جاء نصر اللہ..... پڑھ رہا ہے۔ میں چونکا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ پھر ہوا وہی جو خواب میں اشارہ تھا۔ یعنی صرف چار دن کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر صاحب کو سخت قلق ہوا جیسا کہ ہر بوڑھے آدمی کو اس کے ساتھی کے چھوٹ جانے کا قلق ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمت دی اور وہ ہر روز بلا ناغہ اپنی بیگم صاحبہ کی قبر

۱۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کراچی یونیورسٹی میں ۱۹۵۶ء تک ریڈر رہے۔ دوسرے سال سے پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں کولمبیا یونیورسٹی میں پوسٹ ڈاکٹرل پروگرام کئے تھے۔

پر قرآن خوانی کے لیے جانے لگے۔(۲) ان کا یہ معمول آخری دنوں تک قائم رہا لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ بھی یکایک ہم سے جدا ہونے والے ہیں۔

سنگ آمد و سخت آمد
آج وہ کل ہماری باری ہے

چہار شنبہ ۷ ستمبر ۱۹۹۴ء (۲۹، ربیع الاول ۱۴۱۵ھ) کا دن شاید مشکل سے فراموش ہو سکے گا۔

ڈاکٹر صاحب سچے اور پکے مسلمان تھے۔ نماز، روزہ (حج اور عمرہ بھی) انہیں مرغوب و محبوب تھا۔ بارہا انہوں نے فرمایا کہ میں ان شعائر کا اس لیے بھی پابند ہوں کہ طلبہ بھی دین کی طرف رجوع ہوں اور فیشن کے طور پر دین سے بے تعلقی ظاہر نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ ان پر لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین ثم آمین ☆

۲۔ محترم ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے ہماری زبان (دہلی ۸ دسمبر ۱۹۹۴ء) میں ڈاکٹر ابواللیث صاحب سے متعلق تحقیقی اور تفصیلی مضمون شائع فرمایا۔

تلاوتِ قرآن کی برکت سے ڈاکٹر ابواللیث صاحب کی آنکھوں میں ایسی روشنی آ گئی تھی کہ عینک جو شروع سے لگاتے تھے وہ یک لخت چھوٹ گئی تھی

☆ بھولی ہوئی کہانیاں۔ ص ۸۵

شور صاحب

شور صاحب (اللہ بخشے) میرے دیرینہ کرم فرما تھے۔ ان کا بچپن کا نام منظور علی تھا۔ جیسا کہ میں نے ان کے مکان پر ایک کتاب میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔ بعد میں ان کا نام منظور حسین ہوا۔ ددھیال ایلچپور کی تھی اور ننھیال آکولہ کی تھی۔ یہ دونوں شہر برار میں ہیں وہ امراؤتی (برار) کی شہر پناہ کے ناگ پوری دروازے کے قریب ایک آبادی میں جو سادات کی تھی دسمبر ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ والد ضامن علی صاحب جو بعد میں کراچی آکر (۱۹۶۸ء) میں فوت ہوئے۔ تھانیدار تھے، بہت سیدھے سادے تھے، امراؤتی میں بارہا ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا۔ شور صاحب کی ابتدائی تعلیم امراؤتی ہی کے محمڈن ہائی اسکول میں ہوئی۔ اس زمانے میں میٹرک کی گیارہویں جماعت ہوا کرتی تھی۔ یہ اسکول جس کا نام اب تبدیل کر دیا گیا ہے، مال ٹیکری کے قریب ہے اور اب اس ٹیکری پر شیواجی کا مجسمہ نصب کر دیا گیا ہے۔

شور صاحب نے ۱۹۲۸ء میں وہاں سے میٹرک پاس کیا۔ پھر علی گڑھ تشریف لے گئے۔ وہاں میرس ہوسٹل میں ان کا قیام تھا۔ ناگ پور کے مونس حسین ان کے خاص دوست تھے، علی گڑھ کے انٹرمیڈیٹ کالج میں اس وقت نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں چار جماعتیں تھیں۔ میرس ہوسٹل، اردن سرکل (یا نیو سرکل) کے چار ہوسٹلوں میں سے ایک تھا۔ اس کے علاوہ منٹو سرکل میں ان طلبہ کے لیے چار ہوسٹل تھے اور وہاں دو ہوسٹلوں (اے۔ بی) میں تعلیم بھی ہوا کرتی تھی۔ ڈے اسکالر اور سیمی بورڈ ان کے علاوہ تھے۔ مولانا احسن مارہروی مرحوم کی وجہ سے طلبہ میں شعروشاعری کا ذوق زیادہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ طرحی مشاعرے بھی منعقد کراتے تھے اور کل ہند مشاعرے بھی ان ہی کے دم سے قائم ہوئے تھے۔ شور صاحب کی

شاعری کا شور اسی زمانے میں ہوا۔ اور مولانا مرحوم ان کی شاعری سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اس زمانے میں شور صاحب کی یہ غزل بہت مشہور ہوئی۔

دیدہ و دانستہ دھوکا کھا گئے
ہم فریبِ زندگی میں آ گئے

نظم بھی اسی زمانے میں انہوں نے شروع کی تھی اور اکثر شعر گوئی میں مصروف رہتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے انٹر پاس کیا۔ پھر بی اے اور ایم اے (فارسی) نیز ایل ایل بی کے زمانے میں وہ کچی بارک میں رہنے لگے تھے۔ اسی کو پختہ ہونے کے بعد SM. East ہوسٹل کہا جاتا تھا۔ اسی ہوسٹل میں ریاست ریواں کے اختر حسین نظامی (جو بعد میں تاریخ کے پروفیسر ہوئے) اور سہورا (ضلع جبل پور) کے غلام احمد انصاری بھی شور صاحب کے احباب میں سے تھے۔ ۱۹۳۵ء کے اواخر میں سی پی گورنمنٹ کے ہوم منسٹر رگھوونددر راؤ کے ساتھ ناگ پور کے نواب صدیق علی خاں مرحوم علی گڑھ تشریف لائے۔ وائس چانسلر صاحب نے اس موقع پر ان کی دعوت کی اور سی پی و برار کے طلبہ کو بھی مدعو کیا۔ شور صاحب اور نامدار خاں صاحب ان طلبہ میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

۱۹۳۴ء میں شور صاحب نے ایم اے فائنل (فارسی) کا امتحان دیا۔ اسٹریچی ہال میں امتحان تھا اور ساتھ ہی بی اے فارسی کا امتحان بھی وہیں تھا۔ ایم اے کے پرچے کا رنگ نیلا ہوتا تھا اور بی اے کے پرچے کا رنگ سبز ہوتا تھا۔ ایم اے کے پرچے میں اخلاق جلالی اور چہار مقالہ کے اقتباسات ترجمہ و تشریح کے لئے تھے اور انہی دونوں کتابوں کے کچھ اقتباسات بی اے کے پرچے میں بھی تھے۔ شور صاحب نے بی اے کا پرچہ لے لیا اور تین گھنٹے تک اسی کو حل کرتے رہے، وقت ختم ہونے پر غلام احمد مدنی صاحب کے ساتھ راقم الحروف بھی شور صاحب کے پرچے کے متعلق پوچھنے گیا، ان کے ہاتھ میں بی اے کا پرچہ تھا، ہم سب گھبرا گئے کہ اب کیا ہوگا۔ غلام احمد مدنی صاحب فوراً اپنے والد نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب کے پاس دوڑتے ہوئے گئے۔ نواب صاحب اس زمانے میں وہاں ٹریزرر (خازن) تھے وہ بہ نفسِ نفیس تشریف لائے اور شور صاحب کو ہال کے اندر لے جا کر ایم اے کا پرچہ دیا۔ کھانا کھلایا، تسلی دی۔ اس طرح انہوں نے ایم اے کا پہلا پرچہ حل کیا۔

۱۹۳۴ء میں شور صاحب ایم اے (فارسی) پاس کر کے وطن پہنچے۔ اس وقت کسی کالج میں جگہ خالی نہیں تھی۔ اس لیے ناگ پور کے انجمن اسلامیہ اسکول میں مدرس ہو گئے اور قریب تین سال تک وہیں رہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے ناگ پور یونیورسٹی سے ایک ایم اے اور پاس کیا۔ راقم الحروف ان سے ایک سال پیچھے تھا۔ ۱۹۳۵ء میں فارسی میں اور ۱۹۳۶ء میں اردو میں (ایل ایل بی بھی) علی گڑھ سے ایم اے پاس کر کے اپنے وطن جبل پور واپس ہوا۔ چند ماہ بعد پبلک سروس کمیشن نے کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں اردو کے استاد کے لیے اشتہار دیا۔ اس زمانے میں ۲۵ سال عمر کی سخت قید تھی۔ کمیشن نے انٹرویو کے لیے مجھے طلب کیا لیکن شور صاحب کی عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کو طلب نہیں کیا۔ (۱)

جولائی ۱۹۳۷ء میں میرا تقرر ہو گیا۔ پھر جب کانگریس کی ڈھائی سالہ حکومت قائم ہوئی تو شور صاحب کے والد صاحب کے ایک دوست ڈاکٹر پٹ وردھن (۲) کی کوشش سے ۱۹۳۸ء میں ان کو Morris College میں فارسی کا لیکچرار بنا دیا گیا۔

راقم الحروف کنگ ایڈورڈ کالج میں تھا۔ قریب ڈھائی سال کے بعد ناگ پور یونیورسٹی نے مجھے صدر شعبہ اردو بنا دیا۔ پھر جب ۱۹۴۳ء میں سید رفیع الدین صاحب مارس کالج میں عربی کے لیکچرر ہوئے تو شور صاحب کے ساتھ ہم لوگ ''اتحادِ ثلاثہ'' کی حیثیت سے یونیورسٹی کے مرہٹہ اور ہندی کے دو گروپ کے لیے Balancing power بن گئے اور اللہ کی شان کہ دونوں گروپ ہم لوگوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں شور صاحب کا تبادلہ مارس کالج ناگ پور سے کنگ ایڈورڈ کالج ہو گیا۔ وہاں کالج کے ایک بنگلے میں

۱۔ گورنمنٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) میں شور صاحب ۱۹۶۹ء میں (یعنی ۶۰ سال کی عمر میں) ریٹائر ہوئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سرٹیفکیٹ میں ان کی عمر کیا رہی ہوگی۔

۲۔ شور صاحب نے کسی موقع پر اشتارے وکیل کو اپنا ہمدرد کہا ہے۔ طلوعِ افکار کے مخاطبے میں نسیان کی وجہ سے کئی باتیں انہوں نے صحیح نہیں کہیں۔ اس وکیل نے ۱۹۳۹ء میں مسلمانوں کے خلاف مرہٹوں کی فوج تیار کی۔ اس کا سردار خود بنا گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کی بیوی نے اس کی پوجا کی اور اسے رخصت کیا۔ دور سے ایک مسلمان بڑے میاں نے رسی کی منجنیق سے ایک پتھر اس کی ناک پر رسید کیا تو وہ گھوڑے سے گر پڑا اور اس کی فوج بھاگ گئی۔

ان کا قیام تھا۔ اپنے والد صاحب سے ملنے کے لیے وہ شہر گئے ہوئے تھے۔ بچے بھی ساتھ تھے۔ چوروں نے موقع پا کر تمام قیمتی سامان غائب کر دیا اور بڑے اطمینان کے ساتھ کھانا پکایا اور چائے بنا کر پیتے رہے۔ بڑا افسوس ہوا۔

کالج میں ہر سال بڑے پیمانے پر ادبی موضوع پر مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ کالج کے اساتذہ اور شہر کے وکلا بھی حصہ لیتے تھے۔ سالانہ مشاعرہ بھی ہوا کرتا تھا۔ باہر سے کسی بڑے شاعر کو دعوت دی جاتی تھی۔ کالج کے طلبہ بھی معمول کے مطابق کچھ اپنی غزلیں کچھ غیر معروف شعرا کی غزلوں میں اپنا تخلص ڈال کر سنایا کرتے تے۔ لوگ حسب معمول بغیر سمجھے ہوئے واہ واہ کہا کرتے تھے۔ لیکن اچھا خاصا اجتماع ہو جاتا تھا۔ پھر شور صاحب کے آجانے سے اس اجتماع میں اضافہ ہونے لگا۔ وہاں دسمبر کے آخری ہفتے میں قدیم اور موجودہ طلبہ بھی جمع ہوتے تھے وہ Reunion Days کہلاتے تھے۔

مختلف کھیلوں اور تقریبوں میں وہ سب شرکت کرتے تھے اور مختلف زبانوں میں تقریریں بھی ہوا کرتی تھیں۔ یعنی ہندی، اردو، مرہٹی اور سنسکرت میں طلبہ تقریر کرتے تھے۔ شور صاحب سے کہا گیا کہ فارسی میں طلبہ سے تقریر کرائیں۔ وہ فکر مند ہوئے۔ میں نے کہا کہ آپ کچھ فکر نہ کریں میں انتظام کیے دیتا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ تقریروں کے لیے جج صاحبان ایسے ہوں گے جو عربی اور فارسی سے بالکل نابلد ہوں گے۔ میں نے طلبہ کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ تم کو قرآن پاک کی کتنی کتنی سورتیں یاد ہیں؟ چار پانچ طلبہ ایسے تھے جن کو دس دس بارہ سورتیں یاد تھیں، میں نے کہا کہ ہال میں کھڑے ہو کر ہاتھ ہلا ہلا کر سورتیں پڑھ دینا۔ جج صاحبان آئے۔ طلبہ نے اسی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر سب کو خطاب کرتے ہوئے سورتیں پڑھنی شروع کیں۔ تمام سامعین ہنستے رہے اور قہقہوں سے ہال گونج اٹھا۔ جج صاحبان مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے میں نے کہا بعد میں بتاؤں گا۔ بہر حال ان طلبہ کو انعامات ملے اور جج صاحبان نے ان کی فاضلانہ تقریروں پر داد بھی دی۔

۱۹۴۷ء میں مجھے کنگ ایڈورڈ کالج سے مارس کالج ناگ پور بھیج دیا گیا۔ تقسیم ہند سے جو قیامت برپا ہوئی وہ چنگیز اور ہلاکو کی سفاکی سے بھی زیادہ ہوگی۔ بے شمار جانیں بھینٹ چڑھ گئیں۔ پشتہا پشت کی میراث یک لخت چھوڑنی پڑی۔ سی پی اور برار میں تباہی کم ہوئی تھی۔

لیکن دوسری جگہوں کے خوں چکاں واقعات سن کر وہاں کے مسلمان بھی خائف ہوئے اور لاکھوں کی تعداد میں اس صوبے کو چھوڑنے پر آمادہ ہوئے۔ (۳) بہت سے لوگ حیدر آباد (دکن) چلے گئے۔ وہاں ان کو معاش کے ذرائع بہم پہنچائے گئے اور وہاں کے امرا نے مہاجروں کے قیام وطعام کا بہت معقول انتظام کیا۔ جو لوگ پاکستان آنا چاہتے تھے وہ بمبئی پہنچنے لگے۔ وہاں کے مسلمانوں نے بھی دل کھول کر مہمان نوازی کی اور ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ راقم الحروف کے دو بچے بڑے بھائی کے ساتھ کراچی آچکے تھے۔ اس لیے مجھے بھی کالج سے رخصت لے کر (اہلیہ اور شیر خوار بچے کے ساتھ) کراچی کا رخ کرنا پڑا۔ ۷ نومبر کو وہاں پہنچا، ۲۴ نومبر کو بچہ فوت ہو گیا اور ۲۸ نومبر کو اس کی والدہ بھی چل بسیں۔ ناگ پور سے پروفیسر رفیع الدین صاحب نے مجھے لکھا کہ واپس ناگ پور آجاؤ اور مارچ تک کام کر کے اپریل سے تین ماہ کی تعطیل میں کراچی چلے جانا۔ ان کے اصرار پر دسمبر میں ہوائی جہاز سے بمبئی پہنچا اور وہاں سے ریل میں ناگ پور پہنچ گیا۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں جو چھٹیاں ہوئیں تو میں حیدر آباد (دکن) چلا گیا۔ وہاں میرے بہت سے اعزا تھے۔ ایک دن بازار سے گزرا تو وہاں شور صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کو جگہ مل گئی تھی۔ لیکن بقول ان کے "وہاں میں نے ابھی پڑھایا بھی نہیں تھا، ایک سیشن پورا کہ Fall ہو گیا" (۴) یہ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے۔

سقوطِ حیدر آباد کے بعد وہ امراؤتی واپس آئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد کراچی پہنچ گئے۔ وہاں کوئی مناسب جگہ نہیں تھی تو پرنسپل تاج محمد خیال نے زمیندار کالج گجرات میں ان کو فارسی کا سینئر لیکچرر مقرر کرا دیا۔ قریب ڈیڑھ سال کے بعد اسلامیہ کالج لائل پور (فیصل آباد) میں اسسٹنٹ پروفیسر (فارسی) مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم

۳۔ ہر روز گرانڈ ٹرنک ایکسپریس جو دہلی، آگرہ، گوالیار، بھوپال اور راتارسی ہوتی ہوئی سہ پہر کو ناگ پور پہنچتی تھی اس میں بہ کثرت لاشیں ہوتی تھیں اور ڈبے خون کے فواروں سے رنگے ہوئے ہوتے تھے۔ ناگ پور اسٹیشن پر یہ ڈبے دھوئے جاتے تھے اور لاشیں نکالی جاتی تھیں۔ اس منظر سے خوف طاری ہو گیا تھا۔

۴۔ طلوعِ افکار، کراچی، جولائی ۱۹۹۴ء/ص/۱۷

اے پاس کیا اور فیصل آباد کے کالج میں انگریزی بھی پڑھائی۔ ایک سال کے بعد ۱۹۵۲ء میں گورنمنٹ کالج لائل پور میں فارسی کے پروفیسر بنا دیئے گئے لیکن ۱۹۶۱ء میں جب اس کالج میں ایم اے (اردو) کا شعبہ قائم ہوا تو اردو اور فارسی کے شعبے کے صدر بنا دیئے گئے اور ۱۹۶۹ء میں ریٹائر ہو کر کراچی واپس آ گئے۔ ۲ جولائی ۱۹۹۴ء کو ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا اور ۵ دن کے بعد ۷ جولائی کو ان کی وفات ہوئی۔ شور صاحب جب گجرات اور فیصل آباد میں تھے تو حیدر آباد کے مشاعروں میں شرکت کے لیے تشریف لاتے۔ یہاں حافظ مبارک علی مرحوم کے مکان میں ان کا قیام رہتا تھا لیکن مجھ سے ملنے کے لیے یونیورسٹی میں ضرور قدم رنجہ فرماتے تھے۔ (۵)

یہاں تک تو ان کے عام حالات درج کیے گئے۔ ان کے بچپن اور نوعمری کی چند باتیں بھی عرض کرنا بے محل نہ ہوگا۔ وہ بہت نازک مزاج اور نازک اندام تھے۔ ذرا میں خوش اور ذرا میں ناراض ہو جاتے تھے! اپنے بچپن کے دوست عبدالرحمٰن خالدی (جو بعد میں علی گڑھ میں کیمسٹری میں پی ایچ ڈی ہوئے) اور علاؤالدین قاضی (جو بعد میں امراؤتی کے مشہور وکیل ہوئے) ان سے دور ہو گئے تھے۔ کالج میں بھی پروفیسر سہنا (جونیئر) ان سے گھبراتا تھا۔ وہ نہایت خلوص اور محبت سے باتیں کرتے کرتے (شعر گوئی میں) استغراق کی وجہ سے ایک دم خاموش ہو جاتے تھے۔ عزیزی ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ۱۹۸۴ء میں ان کے متعلق لکھا تھا:

> پروفیسر منظور حسین شور اپنی شخصیت اور زندگی کی ظاہری صورتوں میں نہ صرف اپنے گرد و پیش سے بلکہ کبھی کبھی اپنی ذات وصفات سے بھی لاتعلق سے معلوم ہوتے ہیں، وہ کسی عالم میں بھی ہوں عموماً اپنے ہی عالم میں رہتے ہیں۔ چنانچہ بھری محفل میں اکثر تنہا نظر آتے ہیں۔

شور صاحب نے بچپن ہی میں شاعری (بلکہ عاشقی) شروع کی تھی۔ موسیقی بھی سیکھی تھی۔ خوب لکھتے تھے اور خوب پڑھتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض مشاعروں میں وہ کئی کئی گھنٹے اپنا کلام زبانی سناتے تھے۔ ملک کے مختلف شہروں کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے

۵۔ راقم الحروف کراچی آ کر ۱۹۴۸ء میں اسلامیہ کالج میں اور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک اردو کالج میں (اور یونیورسٹی کی بھی ایم۔ اے کلاس) پڑھاتا رہا۔ پھر ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۲ء تک سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبہ رہا۔ ریٹائر ہونے کے بعد چار سال کی توسیع ملازمت بھی ہوئی۔

اور نیاز فتح پوری کے رسالہ نگار کے لئے اپنی غزلیں اور نظمیں برابر بھیجا کرتے تھے۔ ان کے کلام کے مجموعے یہ ہیں۔

نبضِ دوراں ۱۹۵۹ء دیوار ابد (۱۹۶۹ء) یہ مجموعہ انہوں نے راقم الحروف کے نام (اقبال کے ایک شعر کے ساتھ) معنون کیا تھا۔ سوادیم تناں (۱۹۸۳ء) صلیب انقلاب (۱۹۸۵ء) میرے معبود (طویل نظم ۱۹۸۴ء) زیر طبع مجموعے: حشر مرتب۔ (غزلیات) ذہن وضمیر (۶) (رباعیات) انگشتِ نیل (تنقید) افکار واعصار (نثری ادب)۔ اندر کا آدمی (نفسیاتی مضامین)

اللہ بخشے عجیب خوبیاں تھیں۔

ان کا ایک ہی خط محفوظ رہ گیا ہے۔ وہ درج ذیل ہے۔

۲۴/۹۱۷ فیڈرل بی ایریا، کراچی

۳۰ دسمبر ۱۹۸۴ء

برادر محترم ڈاکٹر صاحب زادالطافکم

سلام علیکم! ماسٹر عثمان صاحب کی وساطت سے نگارش عالیہ ''ہمارا علم وادب'' کی ایک جلد موصول ہوئی، ایک شخص نے میرے مطبوعہ تین شعری مجموعات سے جمالیاتی مزاج کی منظومات کو ایک جگہ جمع کر کے کتاب کی شکل دے دی۔ اس کتاب میں آتش کی جوانی سے لے کر کل تک جمالیاتی مزاج کی نظمیں بڑی تعداد میں ایک جگہ جمع ہوگئی ہیں، ہر چند یہ نگارش اس قابل نہیں کہ آپ کو پیش کی جائے، تاہم

ہر کہ خواند دعا طمع دارم کہتے ہوئے

''سوادیم تناں'' کی ایک جلد ارسالِ خدمت کر رہا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کو صحت اور درازیٔ عمر عطا فرمائے۔ آمین، آپ کا بھائی منظور حسین شور☆

۶۔ محترم ڈاکٹر مختار الدین صاحب نے ہماری زبان (دہلی ۱۵ نومبر ۱۹۹۴ء) میں ''کچھ چراغ اور بجھے'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا ہے، جس میں شور مرحوم کی تصانیف کا ذکر بھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ذہن وضمیر'' ان کی آخری کتاب ہے جو ۱۹۹۱ء میں شائع ہوگئی ہے۔

☆ بھولی ہوئی کہانیاں۔ ص ۸۸

بھائی احسان اللہ عباسی مرحوم

بھائی احسان اللہ کے خاندان سے میرے تعلقات ۷۰،۷۲ سال سے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق جونپور (یوپی) سے زیادہ رہا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب سی پی کے صوبے کی تشکیل ہوئی تو اس خاندان کے بزرگ جناب قادر بخش کو منصف مقرر کیا گیا۔ ان کے صاحبزادے محمد حسین تحصیل دار ہوئے۔ وہ جبل پور کی انجمن اسلامیہ اور اس کے اسکول کے بانیوں میں سے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں وہ اسکول قائم ہوا۔ ان کے انتقال (۱۹۱۵ء) کے بعد ان کے داماد محمد کاظم صاحب (م ۱۹۳۴ء) بہ عہدۂ ناظر تھے اور وہ بھی قومی خدمت میں پیش پیش رہتے تھے۔ محمد کاظم صاحب جناب امداد حسین بن امیر علی کے صاحبزادے تھے۔ امداد حسین کے دوسرے صاحبزادے حافظ محمد رضا تھے جن کے صاحبزادے مولانا محمد شبلی (م ۱۹۶۷ء) جبل پور مسلم لیگ کے مشہور کارکن تھے۔ حافظ محمد رضا کے ایک بھائی حافظ محمد جعفر تھے جن کے صاحبزادے حاجی حافظ معین الدین بڑے عابد و زاہد تھے۔ کراچی میں ۱۹۷۱ء میں انتقال کیا۔ (۱)

محمد کاظم صاحب کے پوتے محبوب عالم (ولد محمد ہاشم) جبل پور کے انجمن اسکول کی مڈل کلاسوں میں میرے ہم جماعت تھے۔ ان کے سب اعزا محلہ اومتی میں رہتے تھے لیکن ان کا مکان مقدم گنج کے شمالی حصے میں تھا۔ میں اکثر ان کے یہاں جاتا رہتا تھا۔ میرے ایک ہم

۱۔ مولانا محمد شبلی کے صاحبزادے محمد مدنی عباسی نے ''تذکرہ عباسیان جونپور'' (کراچی ۱۹۷۴ء) بڑی محنت سے شائع کیا تھا۔ اسی میں سے یہ حالات عرض کیے گئے ہیں۔

جماعت سید محمد سعید اور دوسرے نعیم اللہ خان بھی ساتھ ہوتے تھے۔ (۲)

ان کے مکان کے صحن کی ایک چنان اب تک یاد ہے کہ وہ ۲۰، ۲۵ سال میں خاصی بڑی ہوگئی تھی۔ محبوب عالم اپنے خاندان والوں کی طرح غیر معمولی ذہین تھے۔ کلاس میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے لیکن بیماریوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ تاہم وہ سی پی کے پہلے مسلمان تھے جنہوں نے بی اے کے امتحان میں انگریزی میں اول آنے پر طلائی تمغہ حاصل کیا تھا۔

حضرت حاجی حافظ معین الدین (م ۱۹۷۱ء) جن کا ذکر اوپر آیا ہے بڑے کنبہ پرور تھے۔ سب کا خیال رکھتے تھے۔ انہی کے صاحبزادے احسان اللہ عباسی تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۱ء میں درجہ اول میں میٹرک پاس کیا اور حساب میں خان بہادر ایچ ایم ملک گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۳۳ء میں انہوں نے سائنس میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ پھر علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ اس سلسلہ میں ان کے والد صاحب کو حضرت مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب ناظم دینیات، مسلم یونیورسٹی (م ۱۹۴۰ء) نے تین مکتوبات بھیجے تھے۔ ان مکتوبات سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلے مکتوب (۱۹۳۲ء) میں مولانا نے احسان اللہ صاحب کے والد صاحب کو ''عزیز من سلمہ اللہ تعالیٰ'' کہہ کر خطاب کیا ہے۔ یعنی وہ مولانا سے بہت چھوٹے تھے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ علی گڑھ کا انٹر کالج توڑ دیا گیا اور اس کے دو درجے (نویں اور دسویں جماعتیں) اسکول میں شامل ہوگئے ہیں۔ یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ احسان اللہ کو انٹر پاس کرانے کے بعد علی گڑھ بھیجا جائے۔ اسی مکتوب کے آخر میں ہے کہ ''اپنے والد اور تمام اعزہ کو میرا سلام کہئے۔'' یعنی احسان اللہ صاحب کے دادا (حافظ محمد جعفر) ۱۹۳۲ء تک ضرور زندہ تھے۔ دوسرے مکتوب (۱۹۳۳ء) میں احسان اللہ صاحب کے والد صاحب کو ''برادرم'' کہا ہے۔ تیسرے مکتوب میں بھی (جو اسی سال کا ہے) ان کو

۲۔ نعیم اللہ خان کے والد رحیم اللہ خان صاحب ساتویں جماعت میں جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ اپنے خرچ سے اس کے لیے Notes لکھوا کر طلبہ میں تقسیم کرتے تھے اور اس قدر محنت سے یاد کراتے تھے کہ تمام دنیا کے ملکوں کے بڑے بڑے شہروں کے نام اور وہاں کی آب وہوا وغیرہ کا حال مجھے تو اب تک ان کی وجہ سے یاد ہے۔

"برادر عزیز" (۳) کہا ہے اور لکھا ہے:

آپ کی ایک درخواست علی گڑھ کے پروفیسر حبیب صاحب نے (جو آفتاب ہال کے پرووسٹ Provost بھی تھے) میرے پاس (یعنی جونپور) بھیجی ہے تاکہ اسے میں آپ کے پاس پہنچا دوں۔ اس لیے اس کو بھیجتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کو ۱۵ دسمبر تک پہنچ جانا چاہیے۔ اس وقت تک تو میں علی گڑھ نہ جاسکوں گا اور جونپور ہی میں رہوں گا۔ لیکن عزیزم حافظ محمد ایوب سلمہ وہاں ہوں گے۔ میں ان سے سب باتیں کہہ چکا ہوں۔ گو آپ نے بہت دنوں سے ایوب کو نہیں دیکھا ہے۔ مگر یاد تو ہوں گے۔ آج کل وہ بھی آئے ہوئے ہیں۔ پھر ۱۵ دن تک میں پہنچ جاؤں گا۔

اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد ایوب صاحب حافظ تھے (یہ بات راقم الحروف کو اس مکتوب سے معلوم ہوئی) اور مولوی فاروق کا ذکر ہے جو مولانا ابوبکر کے صاحبزادے تھے اور علی گڑھ میں دینیات کے استاد تھے اور والدہ صاحبہ کا ذکر بھی ہے یعنی خود مولانا کی والدہ صاحبہ بھی اس وقت تک (یعنی ۳۔ اگست ۱۹۳۳ء تک) زندہ تھیں۔

علی گڑھ کا انٹرمیڈیٹ کالج (مولانا کے پہلے مکتوب کے مطابق) ۱۹۳۱ء میں قانوناً توڑ دیا گیا تھا لیکن عملاً اس وقت تک توڑا نہیں گیا تھا۔ کیوں کہ دسویں کے ایک طالب علم ممتاز علی (جو میرے ہم وطن اور مخلص دوست تھے) ۱۹۳۳ء میں میرے قریب ہی کے کمرے میں (ماریسن کورٹ میں) رہتے تھے۔

ہوا یہ تھا کہ ۱۹۳۳ء کے اوائل میں آفتاب ہال قائم ہوا۔ اس میں آفتاب ہوسٹل اور ماریسن کورٹ صرف دو ہوسٹل شامل تھے۔ اس کے پرووسٹ پروفیسر محمد حبیب صاحب (پروفیسر تاریخ) تھے۔ انہوں نے ذہین طلبہ کو ان دونوں ہوسٹلوں میں (دوسرے ہوسٹلوں کے

۳۔ احسان اللہ صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ میں بہت چھوٹا تھا تو والد صاحب کے ساتھ جونپور گیا تھا۔ وہاں مولانا ابوبکر، حضرت مولانا سخاوت علی عمری (یعنی فاروقی م ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) کے پوتے اور مولوی حافظ ابوالخیر مکی کے بیٹے تھے۔ دیکھیں تذکرہ علمائے ہند از مولانا رحمن علی۔ ص ۲۰۷_۲۰۸_۴۲۷)

مقابلے میں کچھ کم اخراجات پر) داخلہ دیا۔

احسان اللہ عباسی صاحب نے جبل پور میں مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے کہا کہ آپ ضرور درخواست دیدیں۔ پھر میں نے بھی درخواست دے دی۔ ممتاز علی جن کا ذکر ابھی اوپر آیا ہے وہ بھی ساتھ ہو گئے اور قریب کے کمروں میں (مارلیس کورٹ میں) رہنے لگے۔ غالباً اکتوبر ۱۹۳۳ء میں ممتاز علی کے والد جناب تحصیل دار ماجد علی صاحب کا جبل پور میں انتقال ہو گیا تو وہ کچھ دنوں کے لئے جبل پور چلے گئے۔ اسی زمانے میں بھائی احسان اللہ کو سخت خارش ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ کھانا بھی اپنے ہاتھوں سے نہیں کھا سکتے تھے اور اپنے کپڑے بھی بدل نہیں سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی اور میں نے ان کی خدمت کرتا رہا۔ بحمد اللہ ۱۵۔۲۰ دن بعد وہ صحت یاب ہو گئے لیکن پھر کچھ عرصے کے بعد انہوں نے بتایا کہ مجھے ملازمت مل گئی ہے اس لیے میں اب علی گڑھ چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن انہیں علی گڑھ چھوڑنے کا ہمیشہ ملال رہا۔ چنانچہ وہ جبل پور چلے گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی انعام اللہ عباسی صاحب نے مرحوم کی ملازمت کی تفصیل ۸ مئی ۱۹۹۵ء کے خط میں مجھے اس طرح لکھی ہے۔

ان کی سروس بک نہیں مل سکی۔ مگر فائل سے کچھ ایسے کاغذات ملے جن سے تاریخ ریٹائرمنٹ ۱۷ جولائی ۱۹۷۲ء اور عہدہ A.A.O ثابت ہوا یہ عہدہ مخفف ہے برائے Assistant Account Officer یا Assistant Audit and Accounts officer چونکہ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۱ء تک واپڈا میں ڈیپوٹیشن پر رہے مگر اسی دوران Directorate General Post and Telegraph ان کا Parent Officer رہا اور اس سے پہلے ان کی کمرشیل آڈٹ میں بھی ڈیپوٹیشن پوسٹنگ ہوتی تھی چنانچہ آڈٹ کے لئے مختلف مقامات (پشاور وغیرہ) جاتے رہتے تھے۔ کچھ کاغذات سے معلوم ہوا کہ Pension papers orders وغیرہ D.G. P &T کے دفتر سے بھی جاری ہوتے تھے۔

مرحوم اپنی ملازمت کے سلسلے میں (ہندوستان میں) زیادہ تر ناگپور اور سیونی میں رہے۔ پھر لاہور، حیدر آباد وغیرہ میں عرصے تک رہے۔ اور اکثر و بیشتر وہ تشریف لاتے تھے۔ میں بھی بارہا ناگ پور میں ان کے یہاں ٹھہرا ہوں۔ خوش کلام خوش پوش اور نہایت مخلص تھے۔ کراچی سے بھی ابھی ۵، ۶ ماہ قبل بھی وہ میرے پاس تشریف لائے تھے۔ میلوں تک ٹہلنے کا

شوق تھا۔ آخر وقت تک وہ بحمد للہ صحت مند تھے لیکن ایک رکشے کی ٹکر سے ان کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ہسپتال سے بھی انہوں نے مجھے اپنے زخموں کا حال لکھوا دیا تھا۔ کچھ طبیعت سنبھلنے لگی تھی تو گھر آ گئے تھے۔ لیکن اللہ کی مرضی کہ وہ جاں بر نہ ہو سکے اور یک شنبہ ۳۰ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ ۳۰ اپریل ۱۹۹۵ء کو ہم سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

☆ بھولی ہوئی کہانیاں۔ ص ۱۰۲

بھائی ابراہیم علی خان مرحوم

آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق رام پور سے تھا۔ نانا محمد خان صاحب وہاں سے آکر صوبہ سی پی میں اسسٹنٹ کمشنر ہوئے۔ آخری عمر میں ہوشنگ آباد (سی۔ پی) میں قیام رہا اور وہیں انتقال فرمایا۔

والد نواب غلام محی الدین علی خان کی بڑی جائیداد بھنڈارا میں تھی۔ وہاں جائیداد کی نگہداشت کے لیے گئے ہوئے تھے تو چند ہندوؤں نے قصبہ لاکھنی میں ۱۹۲۰ء میں ان کو شہید کر دیا۔ ان کی اولاد میں پانچ صاحب زادیاں اور چار صاحب زادے تھے۔ نواب صدیق علی خان (۱۹۰۲ء تا ۱۹۷۴ء) گو کہ تین بہنوں سے چھوٹے تھے لیکن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اس لیے گھر کی ہر طرح کی ذمے داری ان پر عائد ہوئی۔ ان سے چھوٹے نواب تقی علی خان (م ۱۹۶۰ء) تھے۔ ان سے چھوٹے نواب ابراہیم علی خان (میرے خاص کرم فرما) تھے۔ اور ان سے چھوٹے نواب ہدایت علی خان صاحب حیدر آباد (سندھ) میں تھے۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۹۵ء (جمعہ ۲۵، ربیع الآخر ۱۴۱۶ھ کو انتقال ہوا۔

نواب صدیق علی خان کی ذات گرامی ہندوستان اور پاکستان میں محتاج تعارف نہیں۔ شہید ملت نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم (م ۱۹۵۱ء) کے آخری دم تک دستِ راست رہے۔ اس سے پہلے وہ مسلم نیشنل گارڈ کے صدر تھے۔ صوبہ سی پی کے کرکٹ ایسوی ایشن کے مدتوں سیکریٹری رہے۔ انجمن اسلامیہ ہائی اسکول ناگ پور کی سلور جوبلی کا آپ ہی کی وجہ سے گورنر سر ہائیڈ گون نے افتتاح کیا۔ ۱۹۳۴ء میں پورے صوبے سے ایک واحد نمائندے کے لئے انتخاب میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں مسلم کرکٹ ٹیم کی قیادت کی۔ ۱۵

سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے۔ پھر افریقہ کی سفارتی ذمے داری سپرد ہوئی تو جولائی ۱۹۶۱ء میں فراغت پائی۔ اسی زمانے میں حج بھی ادا کیا۔ اوعا آخری وقت کراچی میں گزارا۔ ایسے خوش شکل، خوش پوش، صحت مند اور سراپا اخلاص حضرات بہت کم ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے خاندان میں سب سے زیادہ ممتاز تھے بلکہ قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کے ممتاز مخلصین میں سے بھی تھے۔

نواب ابراہیم علی خان دوشنبہ ۴ جولائی ۱۹۱۰ء (۲۵ جمادی الآخر ۱۳۲۸ھ) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ناگپور میں ہوئی۔ پھر اپنے خالہ زاد بھائی مونس حسین کے ساتھ علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں ۱۹۲۷ء میں میٹرک اور ۱۹۲۹ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ اس کے بعد کچھ مجبوریوں کی وجہ سے وقفے وقفے سے تعلیم ہوئی۔ یعنی ۱۹۳۳ء میں وہیں سے بی اے اور ۱۹۳۶ء میں بی ٹی پاس کیا۔ تعلیم کا شوق بہت تھا۔ اس لیے ۲۵ سال کی عمر میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (جنرل ہسٹری) بھی پاس کیا۔

آپ کی شادی جاورہ کے نواب نیاز احمد خان کی صاحبزادی سعیدہ بیگم سے ۲۶ جون ۱۹۳۸ء کو ہوئی۔ وہ نواب صدیق علی خان کی پہلی بیگم کے خالہ زاد بھائی تھے۔

نواب ابراہیم علی خان مرحوم کی دو صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادے ہیں۔ بڑی صاحبزادی رفعت جہاں ہیں۔ ان کی شادی سید عبداللطیف شاہد سے ہوئی جو نواب غلام محی الدین علی خان (یعنی ابراہیم علی خان کے والد صاحب) کے نواسے ہیں۔ رفعت جہاں کے صاحبزادے سید عدنان احمد اور صاحبزادی ناعمہ بلقیس ہیں۔

دوسری صاحبزادی عفت بانو ہیں۔ ان کی شادی حضرت امیر مینائیؒ کی پوتی کے بیٹے مظفر احسن عثمانی سے ہوئی۔ وہ لاہور میں ہیں۔ ان کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہیں۔

بھائی ابراہیم علی خان کے ایک ہی صاحبزادے شعیب علی خان ہیں جو انجینئر ہیں اور PARCO میں کام کرتے ہیں۔ ان کی شادی ان کے چھوٹے چچا ہدایت علی خان صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔

رفعت بانو صاحبہ کی صاحبزادی ناعمہ بلقیس نے بھائی ابراہیم علی خان کے انتقال سے قریب ڈھائی ہفتے پہلے اپنے خواب میں اس راقم الحروف کو دیکھا تھا کہ ان کے متعلق کہہ رہا

تھا کہ ''اب ان کا وقت آ گیا ہے۔''

عفت بانو صاحبہ نے ۱۲ جون ۱۹۹۵ء کو مجھے تحریر فرمایا ہے کہ ''میں لاہور میں رہتی ہوں۔ عید کے موقع پر ابو سے ملنے آتی تھی۔ ابو کمزور تو بہت تھے اور اس زمانے میں فلو بھی ہو گیا تھا۔ جمعہ ۱۲ مئی کو ان کی طبیعت زیادہ خراب رہی لیکن تھوڑی دیر تک اسی حالت میں انہوں نے اپنے بچوں سے صلۂ رحمی، نماز، صدقہ و خیرات کے لیے نصیحت فرمائی۔ ان کی کیفیت دیکھ کر میں رونے لگی تو انہوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر کا واقعہ سنایا اور صبر کی تلقین کی۔ دوسرے دن صبح کے وقت میں اپنے بھائی شعیب کے ساتھ ابو کو عباسی شہید ہسپتال لے گئی۔ تاکہ ایکسرے اور دوسرے Tests ہو جائیں۔ وہاں ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ داخل کر دیا جائے۔ پھر آکسیجن لگا دی گئی اور کافی بہتر لگنے لگے۔ لیکن شام کو ۸ بجے سے بڑی بے چینی ظاہر ہونے لگی اور غالباً ان کو اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وقت آ گیا ہے۔ وہ اپنی ذاتی طہارت اور نماز کا خاص خیال رکھتے تھے اس لیے صاحبزادے سے اصرار کیا کہ ان کو ہسپتال سے گھر منتقل کر دیا جائے۔ لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا اور وہ آسانی کے ساتھ ہم سب سے جدا ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ۱۴ مئی کو صبح ۱۱ بجے سخی حسن قبرستان میں تدفین ہوئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم نے یکم جنوری ۱۹۸۸ء کو ایک وصیت نامہ اپنے عزیزوں کے لیے لکھا تھا۔ اس کا ایک حصہ یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔ اس سے ان کی خدا ترسی اور حقوق شناسی کا اندازہ ہوگا۔

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم تمام تعریف اس خالق حقیقی کے لیے ہے جس نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کو عزت دینے کے لیے فرشتوں سے سجدہ کرایا اور تمام مخلوقات پر فضیلت دی۔ اس کی ہدایت کے لیے ایک عظیم اور مقدس صحیفۂ قرآن کریم اپنے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے بھیجا تاکہ انسان دنیا میں اپنی زندگی اس کی ہدایت کے مطابق گزارے۔ اس کے احسانات اور کرم کا تقاضا ہے کہ ہم ہمہ وقت اس کا شکر ادا کریں۔ اور اس کے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے احکامات کے مطابق اپنی زندگی گزاریں تاکہ رضائے الٰہی کے مستحق ہوں۔

ہزاروں درود وسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جنھوں نے دنیا میں ہر قسم کی

مصیبت برداشت کر کے احکام الٰہی ہم تک پہنچائے۔

میں مسمی ابراہیم علی خان ولد غلام محی الدین علی خان مرحوم اپنے مکمل ہوش وحواس میں یہ وصیت نامہ مورخہ یکم جنوری ۱۹۸۸ء تحریر کر رہا ہوں تا کہ میرے وارثین اس پر عمل کریں اور حق داروں کو ان کا حق پہنچادیں۔

میں اس وصیت نامے میں اپنے جن عزیزوں سے مخاطب ہوں ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

زوجہ سعیدہ بیگم، بڑی بیٹی رفعت جہاں، چھوٹی بیٹی عفت بانو، بیٹا شعیب خان، بھانجے اور داماد، سید عبداللطیف شاہد (شوہر رفعت جہاں) داماد مظفر احسن عثمانی (شوہر عفت بانو)۔ آپ سب ہمہ وقت خداوند کریم کا شکرادا کریں کہ اس نے آپ سب پر فضل کیا اور اپنی نعمتوں سے نوازا۔ اس کے تمام احکامات کی پابندی کرتے رہیں اور اس کے برگزیدہ رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرتے رہیں۔ آپس میں اتحاد واتفاق سے زندگی گزاریں تا کہ دین ودنیا کی فلاح کے مستحق ہوں۔

بھائی ابراہیم علی خان پر اللہ تعالیٰ کی لاکھوں رحمتیں نازل ہوتی رہیں۔ اس عاجز پر علی گڑھ میں بھی بڑی شفقت فرماتے تھے۔ پھر کراچی اور حیدرآباد میں بھی غریب خانے کو عزت بخشتے رہتے تھے۔ نہایت سنجیدہ اور خوش اخلاق تھے۔ کم سخن تھے لیکن بات کرتے تو گویا منہ سے پھول برساتے تھے۔ مرنجاں مرنج تھے اور کسی کا دکھ درد دیکھتے تو ضرور اس کی امداد فرماتے تھے۔

نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات☆

☆ بھولی ہوئی کہانیاں۔ ص ۱۱۲

باب نہم

تلامذہ

ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم

فاضل گرامی ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم میرے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ نہایت حلیم الطبع، اعتدال پسند، نیک اطوار، پاکیزہ مزاج، خدا ترس اور حقیقت شناس تھے۔ غیبت، حسد، بغض وغیرہ رذائل سے بہت دور اور حقوق العباد کے لیے بہت قریب تھے۔ جب میں اردو کالج کراچی میں تھا تو وہ بی اے کے طالب علم تھے۔ وہاں کے میگزین ''برگِ گل'' کے لئے وہ ایک مضمون لکھ کر لائے تو پہلی نظر میں میرے دل میں کچھ بدگمانی پیدا ہوئی کہ بی اے کا طالب علم ایسا فاضلانہ مضمون کس طرح لکھ سکتا ہے۔ لیکن جب ان کو قریب سے دیکھا تو اسی زمانے سے ان کی قابلیت اور صلاحیت کا معترف ہونا پڑا۔ بی اے کے بعد انھوں نے بعض مجبوریوں کی وجہ سے ایم اے کچھ دیر میں کیا لیکن میرے اصرار پر انھوں نے امتحان میں شرکت کی اور بہت اعلیٰ نمبروں کے ساتھ ایم اے پاس کیا۔ پھر وہ کالج میں استاد مقرر ہوئے اور اپنے علمی مشاغل میں مصروف ہوئے۔

کئی بڑی بڑی کتابوں کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا اور ان پر حواشی وتعلیقات اس قدر محققانہ لکھے کہ وہ مدت تک فراموش نہیں کئے جاسکتے۔ کئی کتابیں صحیح متون کے ساتھ مرتب کیں اور دو کتابیں اس عاجز کے نام بھی معنون کیں جو محض ان کی محبت اور خلوص کی شاہد ہیں۔ ان مصروفیات کی وجہ سے پی ایچ ڈی کرنے میں ان سے تاخیر ہوتی گئی۔ میں بار بار ان کو لکھتا رہا کہ یہ نمائشی ڈگری بھی لے لینا چاہیئے۔ ایک مرتبہ ان پر ناراض بھی ہوا۔ آخر وہ اس کے لئے آمادہ ہوئے اور ایسا مقالہ لکھا کہ جس پر یونیورسٹی بھی فخر کرسکتی ہے۔ اتفاق یہ ہوا کہ ان کے ایم اے اور پی ایچ ڈی دونوں کے امتحانوں میں ایک ممتحن میں بھی تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ پہلے

ی کئی کتابیں پی ایچ ڈی کے معیار کی شائع کر چکے تھے۔ اس کے بعد میں نے ان کو ڈی لٹ کرنے کے لئے بھی کہا تھا لیکن افسوس کہ اس کے لیے موقع نہ مل سکا۔

ان کی آخری کتاب ''کاروانِ رفتہ'' ہے جس میں انھوں نے چھبیس ایسے حضرات کے حالات لکھے ہیں جن کو دیکھا ہے یا جن کے متعلق سنا ہے۔ لیکن ان دیکھے لوگوں کے حالات بھی ایسے سلیقے سے مرتب کئے ہیں کہ وہ دیکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مرحوم اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی شائع کرنا چاہتے تھے لیکن اب وہ خود اس کتاب کا ایک عنوان بنیں گے۔

افسانہ کہتے کہتے افسانہ بن گئے ہیں☆

آہ! میرے نجم الاسلام

وہ مجھ سے بہت قریب تھے لیکن افسوس کہ میری عمر اب ایسی نہیں رہی کہ میں ان کے متعلق کچھ زیادہ لکھ سکوں۔ دماغ بھی صحیح نہیں رہا اور آنکھیں بھی بہت کم زور ہیں۔ تاہم میں کوشش کرتا ہوں کہ چند باتیں ہی عرض کر دوں۔

نجم الاسلام صاحب میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ جہاں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پڑپوتے غلام احمد مدنی (کمشنر) میرے خاص دوست کا مسکن تھا۔

مجھے بالکل یاد نہیں کہ نجم الاسلام صاحب کب سکھر آئے اور ان سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی۔ اسلامیہ کالج سکھر میں بھی ایم اے (اردو) کا زبانی امتحان ہوا کرتا تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرحوم کے ساتھ میں بھی وہاں جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہاں کے ایک اسکول کے قریب سے میرا گزر ہوا۔ دیکھا کہ وہ وہاں پڑھا رہے تھے۔ وہ جب کلاس سے فارغ ہوئے تو مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ چائے سے میری تواضع کی۔ ان کی گفتگو سے میں بہت متاثر ہوا۔ وہیں سردار احمد صاحب سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ میں نے ان دونوں کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ان دونوں کو مشورہ دیا کہ وہ پی ایچ ڈی کر لیں۔ ماشاءاللہ ان دونوں نے بڑی محنت کی اور اپنا کام بھی کچھ عرصے کے بعد مجھے دکھلایا۔ نجم الاسلام صاحب نے ''دبستانِ دہلی کی اردو نثر'' پر مقالہ لکھا۔ اور بڑی محنت سے لکھا میں نے بھی اپنی ناقص معلومات کی بنا پر کچھ باتیں عرض کیں۔ غالباً ۱۹۶۹ء میں انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر وہ شعبہ اردو میں بھی کبھی کبھی تشریف لانے لگے۔ ڈاکٹر سید نعیم ندوی مرحوم نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ آپ نجم الاسلام صاحب کے لیے وائس چانسلر صاحب سے عرض کریں۔ اس زمانے

میں غلام مصطفی شاہ مرحوم وائس چانسلر تھے۔ بہت مخلص اور بہت دلیر تھے۔ یونیورسٹی کے قانون ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے تھے۔ میرے عرض کرنے سے فوراً انہوں نے نجم الاسلام صاحب کا تقرر کردیا۔ اس وقت رجسٹرار پناہ علی شاہ تھے۔ وہ قانون قاعدوں کے بہت پابند تھے۔ انہوں نے مجھے فون کیا کہ آپ نے نجم الاسلام کا تقرر کرایا ہے لیکن ان کی ڈگریوں میں نجم الدین لکھا ہوا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ان کا Pen-name نجم الاسلام ہے۔ اسی نام سے آرڈر نکلوا دیجیے۔ بہرحال سب کام خیر و خوبی سے ہوگئے۔ پھر میں نے رابعہ اقبال کے لئے بھی وائس چانسلر صاحب سے کہا وہ اسکول میں ٹیچر ہیں اور میری عزیز شاگرد ہیں۔ وائس چانسلر صاحب نے بلا تکلف ان کا تقرر بھی کردیا۔

نجم الاسلام صاحب نے بہت محنت اور جاں فشانی سے کام کیا۔ کئی اچھے طلبہ تیار کئے اور ریٹائر ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی عزت دی Visiting Professor بھی ہوئے اور رسالہ تحقیق کے نام ور مدیر ہوئے۔ اس رسالے میں ان کے جتنے مضامین ہیں وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور برصغیر پاک و ہند میں ان کی بڑی مقبولیت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر لاکھوں اور کروڑوں رحمتیں برساتا رہے۔ آمین

ان کے مزاج کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دین و دنیا کے تمام فرائض کو پوری طرح ادا کرنے کے عادی تھے۔ اس عاجز نے ان کے انتقال پر یہ قطعۂ تاریخ لکھا تھا۔

آہ دنیا سے اٹھ گئے وہ عزیز
سب کے مونس تھے ان کے سب مونس
ان کا بے مثل رسالہ تحقیق
رطب ہی رطب، کچھ نہیں یابس
نجم الاسلام فاضل الاکبر
۱ ۲ ۴ ۱ ۵
ہیں مقیم بہشت خوش مجلس
۱ ۰ ۰ ۲ ء

یہاں بے محل نہ ہوگا اگر ایک علمی مسئلے کا ذکر کر دیا جائے۔ ہوا یہ کہ ہندوستان سے

ایک مقالہ یقین سے متعلق آیا۔ میں نے شوق سے پڑھا لیکن بعض مقامات پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی ہے میں نے نجم الاسلام صاحب کو اس سلسلے میں جو کچھ لکھا تھا اس کی نقل یہ ہے:

محمد حسین کلیم کا شعر ہے:

یقین کے شعر پر ہیں بدگماں بعضے کہ اس کے نہیں؟
غلط ہے، ہم نے پوچھا ہے گا مرزا جانِ جاناں کو

میر حسن کے تذکرہ گلشن ہند میں ہے:

میرزا رفیع سودا و میر سوز سلمہما گواہی دارند کہ روزے مایاں در خانہ انعام اللہ رفتہ برائے امتحان غزلے طرح نمودیم۔ ہر چند مبالغہ کردیم، مصرع موزوں نہ کرد۔

''سلمہما'' سے ظاہر ہے کہ میر حسن نے یہ تذکرہ سودا اور سوز کی زندگی میں لکھا تھا۔ یقین کے خاموش ہو جانے کا کوئی اور سبب بھی ہو سکتا ہے۔

سودا غالباً ۱۱۷۵ھ تک دہلی میں رہے۔ سوز دہلی ۱۱۶۸ھ تک رہے گویا ۱۱۶۸ھ سے پہلے وہ دونوں یقین کے یہاں گئے ہوں گے۔ یقین کا انتقال ۱۱۶۹ھ میں ہوا۔ یقین نے کئی اشعار میں خود کو معمر کہا ہے۔ اس کا حل نہیں کیا گیا۔ وہ یقین جو حضرت مظہر کے شاگرد تھے وہ معمر تھے اور ان کے کئی شاگرد تھے جن کا ذکر تذکروں میں ہے اور وہ یقین جو خواجہ درد کے خاندان کے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ: (خاندانِ مجددؒ سے نہیں تھے)۔

خاندانِ درد مجھ سے کیوں نہ روشن ہو یقیں

حاتم نے ۱۱۵۲ھ میں یقین کی غزل پر غزل لکھی تھی۔ کیا اس وقت یقین آٹھ سال کے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ دوسرے یقین تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے خاندان کے یقین کے والد اظہر کا سال وفات کیا ہے؟ اس سے بھی کوئی بات بن سکتی ہے۔

حضرت مجدد کے خاندان والے یقین کا انتقال ۱۱۶۹ھ میں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس وقت ۲۵ سال کے تھے۔ حضرت مظہر کی شہادت ۱۱۹۵ھ میں ہوئی اور وہ اس وقت ۸۰ برس کے تھے۔ افسوس کہ نجم الاسلام صاحب کو وقت نہ مل سکا کہ وہ کچھ فرماتے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ☆

☆ باقیات۔ ص ۱۷۲

آہ میرے ہاشمی

سید تقی احمد ہاشمی میرے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن مکہ معظمہ کی جنت المعلیٰ میں بے شمار رحمتوں اور نعمتوں کی آغوش میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس لیے کیوں نہ کہوں کہ ان کی زندگی اور موت دونوں میرے لیے قابل رشک ہیں۔ کاش آخرت میں مجھے ان کی معیت حاصل ہو۔

ربنا فاغفرلنا ذنوبنا وکفر عنا سیاٰتنا وتوفنا مع الابرار

(آمین)

وہ کئی سال سے حیدر آباد چھوڑ کر اسٹیل مل کراچی کی کالونی میں اپنے بڑے بیٹے زبیر میاں کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ یہاں آتے رہتے تھے۔ ابھی وہ اپنی بڑی بیٹی کے یہاں آئے ہوئے تھے کہ ۲۱ جنوری اور ۲۲ جنوری کو دیر تک میرے ساتھ خوش کلامی کرتے رہے۔ ۲۳ جنوری کو عصر کے وقت مراقبے میں بھی شریک رہے اور مجھ سے خوش خوش رخصت ہو کر گئے۔ ۲۷ جنوری کی صبح کو ہوائی جہاز سے جدہ روانہ ہوئے۔ وہاں ایک دن عبدالغفار صاحب لکھنوی کے یہاں جو (A.G Khan کے نام سے زیادہ مشہور ہیں) قیام پذیر ہوئے۔ دوسرے دن مکہ معظمہ گئے۔ وہاں پہلے کی طرح اب بھی مدرسہ صولتیہ میں ٹھہرے۔ پھر عمرہ کیا۔ دو دن کے بعد یعنی سہ شنبہ (۳۱ جنوری) کو پہلا روزہ رکھا۔ رات کو حرم شریف میں تراویح پڑھی۔ وہاں سے واپس مدرسہ صولتیہ آئے۔ احباب سے قریب ایک بجے رات تک (یعنی ہمارے یہاں کے تین بجے رات تک) باتیں کرتے رہے۔ پھر آرام کے لیے لیٹے تو انجانا Angina کا درد اٹھا۔ سینہ ملتے رہے۔ لیکن قریب ایک گھنٹہ کے بعد اللہ اللہ کرتے کرتے اللہ کو پیارے

ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہاشمی صاحب سندیلہ کے رہنے والے تھے(۱) خاتون منزل لکھنؤ میں رہ کر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہیں سے میٹرک وغیرہ پاس کیا۔ اور کچھ دن کے بعد Accounts Department میں ملازم ہوگئے۔ پاکستان بننے کے بعد محکمے کی منتقلی سے کراچی آگئے تھے۔ ان سے میری ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی جب کہ انہوں نے اردو کالج میں بی اے میں داخلہ لیا۔ ادب واحترام، شائستگی اور انکساری ان کی امتیازی شان تھی جو ظاہر کرتی تھی کہ کسی اعلیٰ خاندان سے وابستہ ہیں۔ طلبہ میں بھی وہ اپنے اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے معزز ومکرم تھے۔ ۱۹۵۲ء میں بی اے اور ۱۹۵۴ء میں اردو میں ایم اے کیا۔ دوسرے سال تاریخ اسلام میں بھی ایم اے کیا۔ پہلے وہ محلہ رنچھوڑ لائن میں رہتے تھے، پھر لالوکھیت میں مکان لے لیا۔

اس زمانے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میں نے لالوکھیت سے کچھ سامان خریدا اور اپنے مکان (۳۲۸، پیر الٰہی بخش کالونی) آنے والا تھا کہ ہاشمی صاحب مل گئے۔ فرمانے لگے کہ میں بھی ایک ضروری کام سے آپ کے مکان کے قریب جانا چاہتا ہوں ایسا کہہ کر انہوں نے اصرار کے ساتھ میرا سامان لے لیا اور میرے مکان تک پہنچا دیا۔ بس یہی ضروری کام تھا۔

میں ۱۹۵۶ء تک اردو کالج میں رہا۔ وہاں اور اس سے پہلے اسلامیہ کالج میں بھی ایم اے کی کلاسیں ہوتی تھیں۔ ۱۹۵۴ء کے بعد یونیورسٹی نے ایم کلاسوں کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اردو کالج کے اساتذہ کے تعاون سے پڑھائی شروع کرادی۔

۱۹۵۶ء میں مجھے سندھ یونیورسٹی والوں نے بلا لیا اور علامہ آئی آئی قاضی مرحوم نے اپنی خاص شفقت کی بناء پر میرے لیے مکان بھی تعمیر کرا دیا۔ جولائی میں مجھے حیدرآباد منتقل ہونا پڑا اور اسی زمانے میں ہاشمی صاحب کو ان کے محکمے نے لاہور بھیج دیا۔ وہاں وہ چند روز ہی رہے تھے کہ وہاں سے انہوں نے مجھے لکھا کہ آپ کے بغیر میرا دل یہاں نہیں لگتا۔ میں نے جواب میں لکھ دیا کہ آپ یہاں آجائیں۔ وہ فوراً وہاں سے آگئے۔ اب میں فکر مند ہوا کہ میں نے بغیر

۱۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب نے ''تذکرۂ مشاہیرِ سندیلہ'' (مولفہ چودھری نبی احمد) ۱۹۷۶ء میں مرتب کر کے لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ اس میں ہمارے ہاشمی صاحب کے حالات (ص ۲۹۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۷ وغیرہ) میں ہیں۔

سوچے سمجھے انہیں بلالیا ہے تو ان کے لیے کوئی انتظام تو ہونا چاہیے۔ اللہ کی شان کہ یہی زمانے میں حیدر آباد میں سردار بہادر کالج قائم ہوا۔ میں نے ان کے پرنسپل صاحب کو خط لکھا کہ ازراہِ کرم آپ ہاشمی صاحب کو لیکچرر کی جگہ عنایت فرمادیں۔ وہ اس قدر شریف النفس انسان تھے کہ میرے خط پر ہاشمی صاحب کا تقرر کردیا۔ وہ کچھ عرصے تک وہاں کام کرتے رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک بہتر صورت پیدا فرمادی۔ وہ یہ کہ خود سندھ یونیورسٹی میں لیکچرر کی جگہ کا اعلان ہوا۔ میں علامہ قاضی صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہوں نے خوشی کے ساتھ ہاشمی صاحب کو لے لیا۔ پھر ان کے قیام کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اسباب پیدا فرمادیے۔ ہوا یہ کہ اسی زمانے میں حکومت نے لطیف آباد میں مکانات تعمیر کرائے۔ وہاں لطیف آباد نمبر دس میں (گو کہ دور ہے) مکان ملنے کا امکان تھا۔ میں نے ہاشمی صاحب سے کہا کہ آپ فوراً وہاں منتقل ہوجائیں۔ وہ کہنے لگے کہ وہ جگہ بہت دور ہے اور غیر آباد بھی ہے۔ میں نے کہا کہ ایسا نہ سوچیں، وہ جلد آباد ہوجائے گی۔ چنانچہ بادل نخواستہ وہ وہاں چلے گئے۔ پھر ان کے گھر والے بھی وہاں آگئے۔ سندھ یونیورسٹی اس زمانے میں حیدر آباد ہی میں تھی، (گو کہ اس کے چند شعبے اب بھی حیدر آباد میں ہیں) ہاشمی صاحب لطیف آباد سے سائیکل پر، پھر اسکوٹر پر آنے لگے، اور بہت محنت سے کام کرنے لگے۔

علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ (م ۱۹۵۲ء) نے اپنی وفات کے بعد خواب میں مجھ سے فرمایا تھا کہ حیاتِ شبلی کا دوسرا حصہ تم لکھ دو۔ میں نے یہ موقع غنیمت جان کر ہاشمی صاحب کو پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے پر آمادہ کیا اور "شبلی کا ذہنی ارتقا" موضوع تجویز کیا۔ انہوں نے اس موضوع پر بڑی محنت کی۔ لکھنؤ تو وہ جاتے ہی رہتے تھے۔ وہاں ندوہ کی لائبریری کھنگال ڈالی اور اعظم گڑھ میں جس قدر معلومات حاصل ہوسکتی تھیں بڑے سلیقے سے جمع کیں اور ایک ضخیم مقالہ تیار کیا۔ اس زمانے میں یہاں یونیورسٹی میں ایک ایسے صاحب آگئے تھے جو کئی لحاظ سے "کان کے کچے" تھے۔ اس لیے وہ مقالہ قریب ڈیڑھ سال تک یونیورسٹی کے دفتر میں پڑا رہا۔ پھر بڑی مشکل سے وہ ممتحن حضرات کے پاس بھیجا گیا۔ بہرحال ہاشمی صاحب کو ڈگری مل گئی۔ لیکن افسوس کہ اس مقالے کی طباعت کا ابھی تک کوئی انتظام نہ ہوسکا (۲)۔

۲۔ یہ مقالہ بعد میں کراچی سے شائع ہوگیا۔ (مرتب)

ہاشمی صاحب علمی کاموں میں برابر حصہ لیتے رہتے تھے۔ خود بھی لکھتے رہتے تھے اور طلبہ کو بھی آمادہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ متعدد طلبہ نے ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ چوہدری وزیر حسن نشتر سندیلوی (١٨٩٧ء۔١٩٦٨ء) کا دیوان لمعاتِ نشتر انہوں نے مرتب کرکے (مع مقدمہ) ١٩٦٨ء میں شائع کیا تھا۔ ہاشمی صاحب کے بہنوئی شاہ راشد علی نے روح العبادات ١٩٥٢ء میں لکھی تھی، ہاشمی صاحب نے ١٩٦٩ء میں اسے شائع کیا۔ رتن ناتھ سرشاد کے فسانۂ آزاد کا ایک انتخاب (حصہ اول صفحات ٣٤٤) بھی مع مقدمہ۔ صفحات ٦٤)۔ طلبہ کے لئے ١٩٧٠ء میں شائع کیا تھا۔ ایک مجموعۂ مضامین ''ادبی آئینے'' بھی جون ١٩٧٤ء میں شایع کیا۔ اردو لغت بورڈ کے لغات پر نظر ثانی کا کام آخر وقت تک کرتے رہے۔

دو طویل مضمون 'مولانا شبلی کے خطوط مولانا سلیمان ندوی کے نام'' اور ''اقبال کا مردِ مومن'' زیرِ طبع ہیں۔ (٣)

انہیں ذاتی طور پر فرنگی محل، دریاباد، کاکوری، بجنور، اعظم گڑھ، الہٰ آباد وغیرہ کے علماء اور صلحا سے وابستگی رہی تھی اور خود ان کے آباؤ اجداد سے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل تھیں، اس لیے میں بار بار ان سب کو جمع کرنے کے لیے کہتا رہتا تھا۔ لیکن افسوس کہ وہ اپنی ذاتی مصروفیات اور بیماری Angina کی وجہ سے نہیں لکھ سکے۔

عام مشاعروں کی غیر سنجیدگی کی وجہ سے شعبۂ اردو نے ''نعتیہ مشاعرہ'' کی ابتدا کی تھی۔ عموماً رمضان المبارک کے کسی دن ظہر سے مغرب تک یہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ پھر طلبہ میں علمی تحقیق کا ذوق پیدا کرنے کے لیے اور لکھنے کی عادت بنانے کے لئے شعبۂ اردو نے ایم اے (فائنل) کا ایک پرچہ ''اصولِ تحقیق اور اصلاحِ املا'' کے لئے مختص کیا تھا۔ دوسرے مقامات پر یہ دونوں چیزیں بعد میں اختیار کی گئی ہیں۔ ہاشمی صاحب کو ان دونوں کاموں سے بڑی دل چسپی تھی۔

دہلی کا سلیقہ اور لکھنؤ کی نفاست وہاں کے ادب اور معاشرے میں نمایاں ہے۔ ہاشمی صاحب اس نفاست کا پیکر تھے۔ ان کی ہر بات اور ہر گفتگو اسی لطافت اور نفاست کی آئینہ دار

٣۔ پہلا مضمون بھی کراچی سے خود ڈاکٹر غنی احمد ہاشمی کے اہتمام میں شائع ہو گیا۔ (مرتب)

تھی۔ علمی مذاق اور خوش کلامی ایسی تھی کہ محفل میں انہی کی شمع روشن رہتی تھی۔ پھر ہمارے محترم مولانا ڈاکٹر ابوالفتح صغیر الدین صاحب (سابق صدر شعبۂ اسلامیات، سندھ یونیورسٹی) کی وجہ سے اس شمع کی روشنی اور بڑھ جاتی تھی۔ اللہ اللہ، کیا دن تھے اور کیسی باتیں تھیں! اب کیوں کران کا اعادہ ہوسکتا ہے۔

ہاشمی صاحب کو غیبت سے سخت نفرت تھی، بلکہ اگر انہیں کسی شخص سے تکلیف پہنچتی تھی تو اس کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ہمیشہ ''برغیر بد بیں مباش'' ان کا شیوہ تھا۔ خاندان میں ہاشمی صاحب کا نام صابر تھا اور وہ واقعی صابر تھے۔ ان کے دو بیٹے فوت ہوئے لیکن میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ کا انتقال ہوا تو اس وقت بھی انہوں نے اظہار غم نہیں ہونے دیا۔ مظہر محمود شیرانی کے مقالے کے ممتحن تھے اور زبانی امتحان کے لیے انہیں لاہور جانا تھا۔ لیکن حیدر آباد سے وہاں کے لیے ہوائی جہاز نہ ہونے کی وجہ سے وہ بس سے کراچی جانے والے تھے۔ ٹھیک اسی وقت لکھنو سے میرے پاس اطلاع آئی کہ ہاشمی صاحب کے چھوٹے بھائی مطیع احمد کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں دوڑتا ہوا ان کو اطلاع پہنچانے کے لیے پہنچا تو اس وقت بھی انہوں نے غم کا اظہار نہیں کیا۔

ہاشمی صاحب پرانی تہذیب کے دل دادہ تھے۔ کبھی اپنے بڑوں کے سامنے اپنی اولاد کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی سید علی احمد صاحب مرحوم کو کبھی اپنی اولاد کے متعلق کچھ کہنا مقصود ہوتا تھا، تو اپنی بھاوج صاحبہ کو لکھ دیتے تھے۔ خود میرے سامنے اپنی اولاد کے متعلق شاذ و نادر ہی کچھ کہتے تھے۔ انہیں مجھ حقیر سے بہت محبت تھی۔ ان کے سب بچے مجھے ''ڈاکٹر دادا'' کہتے ہیں۔ (۴) ایک مرتبہ محض عقیدت کی بنا پر ہاشمی صاحب نے میری پرانی شیروانی مجھ سے لی اور درزی کو دو سو روپے دے کر اسے اپنے لئے صحیح کرائی۔ پار سال اسی عقیدت کی وجہ سے مجھ سے میری گرم صدری لے لی۔ وہ پار سال کی سردی میں اور ابھی اس سال کی سردی میں بھی بہت خوش ہو کر اسے پہنے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اور ان کے بیٹے میرے پاؤں دابنے لگتے تھے۔ میں منع کرتا لیکن وہ نہیں مانتے۔ پھر میں کہتا کہ ''کمزور کو سب دباتے ہیں''۔ اس جملے سے وہ لطف اندوز ہوتے تھے۔

۴۔ ان کے نو بچے ہیں۔ زبیر احمد، عمیر احمد، سہیل احمد، جنید احمد، صہیب احمد اور چار بیٹیاں۔

ہاشمی صاحب نقشبندی سلسلے سے وابستہ تھے۔اور اس لحاظ سے وہ میرے پیر بھائی تھے۔خاموشی سے ریاضت کرنے کے عادی تھے۔تلاوت اور وظائف بھی تنہائی کے معمولات تھے۔ابھی جب کہ وہ اپنے بڑے صاحبزادے زبیر میاں کی وجہ سے اسٹیل مل کالونی (کراچی) میں رہنے لگے تھے تو میرے بار بار کہنے پر چند حضرات کے ساتھ مراقبہ کرنے لگے تھے ورنہ اس معاملے میں وہ تنہائی پسند تھے۔کئی بار سرہند شریف حاضر ہوئے ہیں۔

میرا اندازہ ہے کہ ہاشمی صاحب نے کم از کم ۴۲ سال تک رمضان المبارک کے اعتکاف میں ناغہ نہیں کیا۔ پارسال وہ رمضان المبارک سے حج تک حرمین شریفین ہی میں رہے۔اس سال بھی اسی مقصد کے لیے مکہ معظمہ گئے تھے۔انہوں نے تین حج کیے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں، پھر ۱۹۸۶ء میں (اپنی اہلیہ کے ساتھ) اور پارسال ۱۹۹۴ء میں مشرف ہوئے تھے۔یہ تینوں حج بحری سفر سے کیے کہ بحری سفر کو وہ ترجیح دیتے تھے۔اس سال ہوائی جہاز سے گئے تھے۔

میں نے ہاشمی صاحب کے والد صاحب (حاجی حسین احمد عرف حاجی میاں) کے انتقال پر (۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء) اور والدہ صاحبہ کی وفات پر (۱۳۸۹ھ/۱۹۷۰ء) تاریخی قطعے لکھے تھے۔آج ہاشمی صاحب کی یاد کو اس طرح تازہ کرتا ہوں۔

سخی احمد اعلیٰ گہر ہاشمی

۵ ۱ ۴ ۱ھ

بہشت آشیاں، جنتی جنتی

۵ ۹ ۹ ۱ء

شب چہارشنبہ، ۲ رمضان المبارک۔یکم فروری

کسی کا شعر ہے:

رات دن زیرِ زمیں لوگ چلے جاتے ہیں
نہیں معلوم تہِ خاک تماشا کیا ہے!

مرحوم کا آخری خط میرے نام یہ تھا:

باسمہٖ حامداً و مصلیاً

۱۴ شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ

۱۶ جنوری ۱۹۹۵ء

یوم دوشنبہ۔ وقت ساڑھے گیارہ بجے دن

محترمی و معظمی ڈاکٹر صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بہت دنوں سے خط نہیں لکھا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ میں نے ٹکٹ لے لیا ہے آج ویزا آ گیا ہوگا۔ کل ان شاء اللہ لے آؤں گا۔ اب کی بھی عمرے اور حج وزیارت کا ارادہ ہے اللہ تعالیٰ پورا فرمائے۔ لڑکے حیدرآباد جاتے ہیں۔ آپ کے یہاں نہیں جاتے جو خیریت معلوم ہو۔ رومی کے تو حیدرآباد کے کئی چکر لگتے ہیں۔ کل گیا ہے اور وہیں ہے۔ میں ان شاء اللہ تعالیٰ جانے سے قبل ملنے حاضر ہوں گا۔ محفوظ صاحب وغیرہ کا بھی کچھ پروگرام بن رہا ہے۔ شاید اسی طرح آنا ہو میں ایک دو روز ٹھہر جاؤں گا۔ انشاء اللہ، شاید اب کی سنیچر کو آنا ہو۔ پروگرام بننے پر ہے۔ عزیزی حافظ منیر سلمہ کو سلام و دعا۔ پیر بھائیوں کو سلام۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ یہاں سب سلام کہتے ہیں۔

فقط والسلام۔ محتاجِ دعا۔ ہاشمی ☆

☆ بھولی ہوئی کہانیاں۔ ص ۹۶

محمد متین صدیقی

محمد متین صدیقی میرے قدیم ترین شاگردوں میں سے ہیں۔ ان کے اخلاق واخلاص اور بے لوث محبت پر فخر ہے۔ انہوں نے طالب علمی ہی کے زمانے سے اپنا ایسا مثالی کردار پیش کیا ہے جو بہ شکل کہیں نظر آتا ہے۔ لاکھوں کروڑوں رحمتیں نازل ہوں ان کے والدین پر جنہوں نے ان کی تربیت کی ہے۔

ان کے آباؤ اجداد قاضیان سیوہارہ (ضلع بجنور، یوپی) میں سے تھے۔ دادا محمد یاسین المتخلص غریق محکمہ انہار کے ڈپٹی کلکٹر ہوکر ترن تارن (ضلع امرت سر) میں قیام پذیر رہے اور وہیں (۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) میں فوت ہوئے۔ دادی صاحبہ (م ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء) اپنے صاحبزادے محمد تحسین صاحب (محمد متین کے والد صاحب) کو وہاں سے لے کر اپنے وطن بجنور واپس آگئیں۔ وہاں محمد تحسین صاحب اپنے بڑے بھائی الحاج عبدالسلام صاحب کے زیر تربیت رہے۔ پھر دوسرے بھائی الحاج محمد نسیم صاحب کے پاس آگئے جو سی پی میں محکمۂ تعمیرات PWD کے SDO تھے۔ ان کے پاس رہ کر انہوں نے میٹرک پاس کیا۔ پھر سول انجینئرنگ کا ابتدائی کورس مکمل کر کے محکمۂ تعمیرات میں ۱۸۹۰ء میں Sub-Overseer ہوگئے۔ پھر ترقی کرتے کرتے Executive-Engineer ہوکر ۱۹۳۷ء میں ریٹائر ہوئے اور بیتول (سی پی) میں رہنے لگے۔ پھر تھوڑے عرصے کے لئے بھوپال میں Superintendent کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لیکن پھر مستقل طور پر بیتول آگئے۔ وہاں کئی سال تک آنریری مجسٹریٹ اور ضلعی میونسپل کمیٹی کے Administrator بھی رہے۔

متین صاحب ڈرگ (سی پی) میں یکم دسمبر ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے بڑے

بھائی محمد امین (م ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) اور منجھلے بھائی محمد معین (م ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء) کو تعلیم کے لئے اٹاوا بھیجا گیا تھا۔ وہاں کا ہائی اسکول جناب سید الطاف حسین ہیڈ ماسٹر کی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے ''دوسرا علی گڑھ'' کہلاتا تھا۔ اکبرالہٰ آبادنے کہا ہے۔

یہ کیا تم نے کہا، کوئی نہ ملجا ہے، نہ ماوا ہے
خدا کے فضل سے بھائی علی گڑھ ہے اٹاوا ہے

متین صاحب کو بھی ۱۹۲۸ء میں اٹاوہ اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ وہ اس وقت پانچویں جماعت میں تھے اور ان کے چھوٹے بھائی محمد مبین (جو ابھی ۲۹ اپریل ۱۹۹۵ء کو فوت ہوئے) تیسری یا چوتھی جماعت میں تھے۔ وہیں منجھلے بھائی محمد معین نے ۱۹۳۱ء میں نویں جماعت پاس کی اور اسی زمانے میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب اٹاوہ میں ایک بڑی کوٹھی میں جو ''افیون کی کوٹھی'' کہلاتی تھی قیام پذیر تھے۔ ان کے نواسے متین صاحب کے ہم عمر تھے۔ ان کی وجہ سے متین صاحب کے عزیزوں سے بھی روابط رہے اور خط وکتابت بھی ہوتی رہی۔ لیکن محمد معین کچھ عرصے تک بیمار رہ کر فوت ہوگئے۔ تو والد صاحب نے سب صاحب زادوں کو بیتول واپس بلالیا۔ متین صاحب اور مبین صاحب وہاں کے اسکول میں داخل کردیئے گئے۔ لیکن بڑے بھائی محمد امین صاحب نے دہلی بورڈ سے ۱۹۳۵ء میں میٹرک پاس کیا اور حیدرآباد دکن میں ملازمت کی اور وہیں ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء میں وہیں فوت ہوگئے۔ والد صاحب نے پاکستان آکر لاہور میں ۲۹ اپریل ۱۹۵۴ء کو انتقال کیا۔(۱)

محمد متین اٹاوہ میں تھے تو بچپن ہی میں اپنی سچائی اور خدمت خلق کی وجہ سے بہت ممتاز تھے۔ اسی زمانے میں جبل پور (سی پی) انجمن اسلامیہ ہائی اسکول کے مشہور کھلاڑی عبدالحی، سلیمان اور مول چند وہاں پہنچ گئے تھے جن کی وجہ سے اٹاوہ اسکول کو کھیل میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ وہیں جبل پور کے نظام الدین بھی پہنچ گئے جنہوں نے پیٹو ہونے میں

۱۔ محمد متین کے والد قاضی محمد تحسین المتخلص بیدل بجنوری، حضرت داغ کے باکمال شاگرد تھے۔ تاریخ گوئی میں اس قدر مہارت تھی کہ تھوڑی دیر میں قطعہ تاریخ تیار کرلیتے تھے۔ ایسے قطعاتِ تاریخ کا ایک مجموعہ جمیع التواریخ لاہور سے شائع ہوا تھا۔ غزلیات اور نظمیں بھی لکھی تھیں ان کے نام کا ایک خط ''انشائے داغ'' میں میری کوشش سے شامل ہوا تھا۔

شہرت حاصل کی۔ پڑھنے لکھنے سے انہیں کوئی واسطہ نہیں تھا۔ بہت موٹے اور بھدے تھے۔ بھائی عبدالسلام خان، ان کے بھائی عبدالستار خاں اور بشیر اللہ صاحب بھی وہیں پڑھتے تھے۔ ایک سال کے بعد عبدالحی اور ان کے چھوٹے ماموں سراج الحق وہاں سے علی گڑھ چلے گئے۔ ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں ان دونوں کے ساتھ علی گڑھ کے مزمل ہوسٹل (کمرہ نمبر ۳۵) میں رہنے لگا۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کی چھٹی میں ہم لوگ جبل پور کے لئے روانہ ہوئے تو اٹاوہ اسکول کے ڈرائنگ ماسٹر ولایت حسین صاحب اور محمد متین کے بڑے بھائی محمد امین صاحب نے زبردستی ہم لوگوں کو اٹاوہ اسٹیشن پر اتارلیا۔ رات کو محمد امین صاحب نے اپنے مکان کے قریب ایک جگہ ٹھہرایا۔ صبح کو ان کی والدہ صاحبہ نے (اللہ تعالیٰ ان پر لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے) بڑی شفقت اور محبت سے ہم لوگوں کو ناشتہ کرایا۔ دوپہر کو ڈرائنگ ماسٹر ولایت حسین بھوپالی صاحب نے (جو خود کرکٹ اور ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے) ہم لوگوں کی پرتکلف دعوت کی۔ اسکول اور شہر کی سیر کر کے رات کو ہم لوگ جبل پور کے لئے روانہ ہوئے۔ (اسی رات بھائی عبدالسلام خان کے عزیز جناب محمد احمد خان صاحب بھی علی گڑھ سے وہاں آئے تھے)۔ گویا محمد متین کے خاندان سے راقم الحروف کا تعلق ۱۹۲۹ء سے قائم ہوا تھا۔

محمد متین اور ان کے بھائی محمد مبین (۲) نے ناگ پور یونیورسٹی سے ۱۹۳۷ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ اسی سال مجھے کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں اردو کا استاد مقرر کیا گیا تو وہاں ان دونوں بھائیوں سے مزید تعلقات قائم ہوئے کیوں کہ انہوں نے اسی کالج میں بی اے کلاس میں داخلہ لے لیا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں انہوں نے بی اے پاس کیا۔ پھر میرے مشورے سے دونوں نے ۱۹۴۵ء میں ایم اے (اردو) پاس کیا۔ اس سے پہلے یہ دونوں بھائی سینٹرل ایکسائز کے اچھے عہدے پر فائز رہ چکے تھے بلکہ ۱۹۴۴ء میں ان کی ترقی بھی ہو چکی تھی۔ پھر پاکستان بننے پر یہ دونوں بھائی مزید ترقی کے ساتھ لاہور میں متعین ہوئے۔

محمد متین بالکل دبلے پتلے ہیں۔ لیکن شیر دل ہیں اور کئی شیروں کا شکار کر چکے ہیں۔ سی پی میں شیر بہت ہیں اور یہ کام ہر شخص کے بس کا نہیں ہے۔ پھر "آدم خور" شیر کا شکار بڑے دل گردے والوں کا کام ہے۔ محمد متین نے ایسے شیر مار کر لوگوں کی بہت دعائیں لی ہیں۔ ان

۲۔ افسوس کہ محمد مبین صاحب کا انتقال کراچی میں ۲۹ اپریل ۱۹۹۵ء کو ہو گیا۔

کا محبوب شغل کرکٹ بھی ہے۔ وہ کرکٹ کے بہت اچھے کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ لیکن ان کا سب سے محبوب مشغلہ خدمت خلق ہے کہ وہ کسی ضرورت مند کو بغیر مدد کیے جانے نہیں دیتے۔ خلوص ومحبت کا یہ جذبہ غالباً والدہ صاحبہ سے ورثے میں ملا ہے۔ پھر انگریزی ادب کا بچپن سے شوق ہے اور اس میں ایسا وسیع مطالعہ رہا ہے کہ انگریزی کے موجودہ استادوں میں بھی نہیں پایا جاتا۔ ان کے گھر میں انگریزی ادب کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ اور وہ اچھائی کی تلاش ان میں سے بھی کر لیتے ہیں۔

ان کے بعض اعزا ایلچ پور (برار) میں تھے۔ میں نے ان کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے یہ جواب ۱۶ فروری ۱۹۹۵ء کو بھیجا تھا۔

> آپ کا ۷ ر رمضان المبارک کا خط ملا۔ اب ایلچ پور (برار) وغیرہ میں میرا کوئی بھانجا یا اور کوئی عزیز نہیں ہے۔ وہاں بڑی بہن تھیں۔ ان کے ۵ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بہنوئی میرے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ مڈل اسکول میں ٹیچر تھے۔ بی اے کا امتحان پاس نہ کر سکے۔ اس لیے آخر وقت تک ترقی نہ کر سکے اور مڈل اسکول ہی کے ٹیچر رہے۔ زیور، امپریل بینک آف انڈیا میں رہن رکھ کر چھوٹا سا مکان ایلچ پور میں بنوالیا تھا، اس لیے وہیں رہنا ضروری ہو گیا تھا۔ جب بھی آکولہ، آکوٹ یا ملکہ پور وغیرہ تبادلہ ہوتا تو میرے دوست ایس پی ورما صاحب منسوخ کرادیتے تھے۔ (۳) تقسیم ہند کے بعد بھی تبادلہ رکواتے رہے۔ وہیں سے ریٹائر ہوئے اور وہیں ۱۹۵۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔
>
> بھائی امین صاحب کے حیدرآباد (دکن) میں انتقال کے بعد والد

۳۔ ایس پی ورما متین صاحب کے خاص دوست تھے۔ وہ پہلے انگریزی کے لیکچرر تھے۔ پھر DPI ہوئے۔ پھر ترقی کر کے سکریٹری تعلیمات، مدھیا پردیش ہوئے۔ اور بھوپال میں ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں جب متین صاحب ایلچ پور جا رہے تھے تو بھوپال اسٹیشن پر ان کو ورما صاحب نے زبردستی ٹرین سے اتار لیا اور ایک رات اور دو دن اپنے پاس رکھا۔ وہ اپنے مسلمان ماتحتوں سے بہت اچھا سلوک کرتے تھے۔ افسوس کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن ان کے اعزا اب تک متین صاحب کو یاد کرتے ہیں۔

سے ریٹائر ہوئے اور وہیں ۱۹۵۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔
بھائی امین صاحب کے حیدرآباد (دکن) میں انتقال کے بعد والد صاحب، بھاوج اور رشید اور ان کی دو بہنوں کے ساتھ ہی ۱۹۴۹ء میں بہن کے بڑے بیٹے شرافت کو بھی میں مستقل طور سے پاکستان لے آیا تھا۔ لاہور میں اس نے بی ایس سی کیا اور آرڈیننس فیکٹری واہ میں ملازمت کر لی۔ ایک ایک کر کے اس کے دو بھائیوں کو بھی بلوا کر اس کے سپرد کر دیا تھا۔ آخر میں بہن کے ساتھ ان کے باقی دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کو ۱۹۶۲ء میں لے آیا تھا۔ بینک سے زیور چھڑانے اور مکان کو فروخت کرانے کے سلسلے میں مجھے تین ماہ ایلچ پور رہنا پڑا تھا۔ بہنوئی صاحب کے انتقال کی وجہ سے وراثت کا سرٹیفکیٹ، عدالت سے حاصل کرنا مصیبت بن گیا تھا۔ میرے ہندو احباب نے بہت مدد کی۔ تین مہینے رخصت پر رہنا پڑا۔ مگر بہن وغیرہ کو زندہ سلامت لے آیا۔ سی پی اور برار میں اب میرا کوئی عزیز نہیں رہا۔ خدا کے فضل سے سب بھانجے بھانجیاں اپنے اپنے ذاتی گھروں کے مالک ہیں اور برسرروزگار بھی ہیں۔ جس بھانجے کا پچھلے دنوں پنڈی میں انتقال ہوا وہ سب انجینئر تھا۔
بریلی والی منجھلی بہن کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ ان کی دوسری بیٹی نے فرسٹ ڈویژن میں بی ایس سی کیا تو اسے میں نے بلوا لیا اور لاہور میں فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں داخلہ کرا کے ایم بی بی ایس کرایا۔ اس کی شادی اپنی اہلیہ کے بھائی پروفیسر مسعود صدیقی سے کر دی۔ مسعود میاں کو میں نے ۱۹۴۷ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ ہی پاکستان بلوا لیا تھا۔ یہیں اس نے بی اے اور ایم اے کیا اور اکنامکس کا لیکچرر ہو گیا تھا۔ پھر ایڈیشنل ڈی پی آئی ہو کر لاہور سے ریٹائر ہوا اور اب ایک پرائیویٹ کالج میں پرنسپل ہے۔ منجھلی بہن کی باقی بیٹیوں کو بھی ایک ایک کر کے

۴۔ ایلچ پور والی بہن کا بیٹا نصرت بھی جنوری ۱۹۹۵ء میں فوت ہو گیا۔

صدیقی ریٹائر ہوئے تو ان کو بھی بلوالیا تھا۔ رام پور میں چھوٹی بہن حبیبہ رہ گئی تھی، اس کے شوہر رام پور میں ٹیچر تھے۔ ۱۹۹۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا تو حبیبہ کو بھی پاکستان لے آیا تھا۔ مختلف مزاجوں اور مختلف عمروں کے افراد جن میں والد صاحب مرحوم (م ۱۹۵۴ء) بڑی چھوٹی بہنیں، بھاوج (رشیدہ کی والدہ) بھانجے، بھتیجے، بھانجیاں کو مختلف اوقات اور حالات میں اپنے پاس رکھ کر سب سے نبھانا میری اہلیہ کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ میرا ہاتھ بٹانے میں اس نیک بخت خاتون نے اپنا زیور تک بے چون وچرا فروخت کرادیا اور وہ کام جو واجب بھی نہ تھے اس نے پورے کردیے اور کئی گھرانوں کے افراد کی زندگیاں بدل دیں۔
افسوس کہ میں اس نیک اہلیہ کا حق ادا نہ کر سکا۔ اس کا بہت قلق ہے۔

متین صاحب ۱۹۷۵ء میں اسسٹنٹ کلکٹر، سینٹرل ایکسائز و لینڈ کسٹمز، لاہور ڈویژن کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ پھر وزارتِ خزانہ حکومت پاکستان نے دو سال کے لئے طلب کر لیا اور ایک نیا قائم کردہ شعبۂ نگرانی Vig I llance Wing میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کراچی میں تعینات کر دیا۔ تاکہ وفاقی ٹیکسوں کی چوری اور چوروں کی پکڑ دھکڑ ہو سکے۔ ماشاء اللہ اب وہ بی ۹۔ بلاک اے شمالی ناظم آباد، کراچی میں قیام پذیر ہیں۔☆

☆ طوبیٰ کیمپ۔ ص ۷۷

باب دهم

متفرق

ذکر چند بزرگوں کا

میرے بچپن میں بڑے ہنگامے تھے۔ دیوبندی اور بریلوی، تحریک خلافت، تحریک آریا سماج اور شدھی سنگھٹن تحریک، عیسائی تحریک۔ قادیانی تحریک وغیرہ پھر ان تحریکوں کے علماء اور زعماء کی زوردار تقریریں۔ رات گئے تک جلسے اور شور غل۔ بابا خلیل داس، محمود دھرم پال۔ مولانا ثناء اللہ امرت سری۔ مولانا عبدالمجید قریشی (مدیر ایمان) مولانا عنایت اللہ مشرقی۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری۔ مولانا ظفر علی خان وغیرہ بہ کثرت مقررین کی تقریروں سے شہر گونجتا رہتا تھا۔ ان کی کتابیں اور پمفلٹ بھی مفت تقسیم ہوا کرتے تھے۔

غالباً علامہ اقبال ہی کی ایک کتاب His Holiness by Phoenix ایک فرضی نام سے شائع ہوئی تھی جس پر مولانا ظفر علی خان کا پیش لفظ تھا۔

بعد میں یہ تمام تحریکیں سمٹ کر صرف دو رہ گئیں۔ یعنی کانگریس اور مسلم لیگ۔ پھر ان کے معرکے شروع ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے صدر تھے۔ انتہا پسندوں نے ان کے نام کا ترجمہ اس طرح کر دیا تھا: ''پنڈت مہا بکو چھیڑا''۔

لیکن لوگوں کو شاید معلوم نہیں کہ وہ در پردہ کس قدر مسلمانوں کے خیر خواہ تھے۔ وردھا (سی پی) کانگریس کے زعما کا مرکز تھا۔ وہ لوگ جو کچھ مسلمانوں اور مسلم لیگ کے مفاد کے خلاف سوچتے تھے، مولانا آزاد بہت خاموشی کے ساتھ میرے ایک شاگرد (مرحوم) کے ذریعے سی پی و برار کے مسلم لیگی صدر عبدالروف شاہ کو اس کی اطلاع کر دیتے تھے۔ مولانا کی وہ کتاب جو ان کی وصیت کے مطابق ان کی وفات کے بہت سال بعد کھولی گئی ہوگی ضرور مولانا کے ایسے کام کی شہادت دیتی ہوگی۔ جبل پور کے پرائمری اسکول کا میرا ایک ہم سبق کیدار ناتھ

تھا۔ وہ بھی مولانا کے ان کاموں سے واقف تھا۔ لیکن اب یہ باتیں سب ملاقاتیں بیان ہوئی ہیں۔

اس کمی تھیوری کے بعد عرض ہے کہ مولانا عبدالحق اور دوسرے علماء اور ادبا جو بظاہر سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے، زمانے کے حالات اور سیاسی معاملات سے بے تعلق تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ کس لیڈر سے کس طرح معاملہ کرنا چاہئے۔

ہاپڑ (ہاپوڑ) مولانا عبدالحق کا وطن تھا۔ وہاں کی دو چیزیں شروع سے مشہور تھیں۔ یعنی ۱۔ پاپڑ اور ۲۔ مولانا عبدالحق۔ وہاں کے دسترخوان یا وہاں کے اسٹیشن پر پاپڑ سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ مولانا نے علی گڑھ سے تعلیم پائی۔ مولانا حسرت موہانی بھی اسی زمانے میں وہاں تھے۔ آپس میں بہت دوستی تھی۔ ایک دوست کھل کر سیاست میں آ گئے، دوسرے دوست نے علم و ادب کی آڑ لے کر مسلمانوں کی خدمت کی اور ہر قوم سے واسطہ رکھا۔

مولانا عبدالحق کا احسان ہے کہ انہوں نے مجھ حقیر کو ہمیشہ نوازا اور وہ معاملات جو ادب اور سیاست کے باہمی تعلق کے تھے۔ ان کے متعلق کبھی کبھی مشورہ بھی کیا۔

میں اب اپنی داستان شروع کرتا ہوں۔

میں علی گڑھ سے ۱۹۳۶ء میں فارغ ہوا۔ چند ماہ بے کار رہا۔ پھر پبلک سروس نے مجھے کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں اردو کا استاد مقرر کیا۔ اسی زمانے سے لکھنے پڑھنے کا زیادہ شوق پیدا ہوا اور ملک کے بڑے بڑے فضلا سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اور پورے ملک کی مشہور لائبریاں بھی دیکھ ڈالیں۔ ناگ پور یونیورسٹی نے ڈھائی سال بعد مجھے صدر شعبہ اردو بنا دیا۔ ۱۹۴۶ء میں ناگ پور کے Morris College میں بھیجا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کا اعلان ہوا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ناگ پور میں جشن منایا گیا۔ بڑا ہجوم تھا۔ کانگریس کا جھنڈا لہرایا گیا لیکن اتفاق ہے کہ جھنڈا الٹا لہرا دیا۔ مسلمانوں نے جوش میں کہا کہ یہ جھنڈا الٹا ہی ہو کر رہے گا۔ پھر مسلمانوں پر ہندوؤں اور سکھوں کے حملے شروع ہوئے۔ حکومت نے حکم دیا کہ جس مسلمان کے گھر میں چھری یا چاقو ملے گا وہ گرفتار کیا جائے گا۔ (کون سا مسلمان ہے جو گوشت کے لئے چھری یا چاقو نہیں رکھتا؟) بہر حال مسلمانوں نے مکان چھوڑ چھوڑ کر حیدرآباد (دکن) یا بمبئی کے راستے سے کراچی آنا شروع کیا۔ پھر دہلی اور آگرہ سے جو Grand Trunk Express ناگ پور پہنچتی تھی اس میں مسلمانوں کی بہ کثرت لاشیں ہوتی

تھیں۔کئی گھنٹے تک ناگ پور میں گاڑی کے ڈبے دھوئے جاتے تھے اور مسلمانوں کی لاشوں کا ڈھیر لگایا جاتا تھا۔اس منظر سے مسلمانوں کو ڈرایا گیا انہوں نے سمجھ لیا کہ اب وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔پورے صوبے میں دہشت پھیل گئی اور لوگوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔

حیدر آباد (دکن) کے مسلمانوں نے اور بمبئی کے علاقے کے سوداگروں نے مسلمانوں کی بہت خدمت کی۔وہ اسٹیشن سے گاڑیوں میں بٹھا کر مہمان خانوں تک پہنچاتے تھے اور بمبئی سے ٹکٹ وغیرہ کا انتظام بھی کرتے تھے۔نومبر ۱۹۴۷ء میں مجھے بھی ناگ پور سے روانہ ہونا پڑا۔کیوں کہ میرے دونوں بڑے بھائی صاحبان کراچی کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ میں اپنے بچوں اور اہلیہ کے ساتھ بمبئی سے بحری جہاز میں کراچی پہنچا۔چند روز کے بعد شیر خوار بچے نے اور پھر اس کی والدہ نے داغ مفارقت دیا۔چند ماہ کے بعد میرے نہایت مہربان کرم فرما جناب پروفیسر سید رفیع الدین صاحب نے ناگ پور سے خط لکھا کہ واپس آکر مارچ تک کام کریں پھر تین ماہ کی تعطیل میں واپس چلے جائیں۔ان کے برادرانہ اصرار سے میں ناگ پور گیا۔کچھ دن پھر ان کا مہمان رہا۔لیکن کراچی سے بڑے بھائی صاحب کا تار پہنچا کہ سراج احمد سلمہ (میرا بچہ) موتی جھرے میں بیمار ہے، پہلے کے صدمے دل میں تھے، مزید قلبی تکلیف برداشت کرنے کی ہمت نہیں تھی، اس لیے گیارہ سال کی Gazetted post چھوڑ کر کراچی آ گیا۔اسی زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب کو نہ معلوم کس طرح میرا حال معلوم ہو گیا۔انہوں نے مجھے خط لکھا کہ سنگاپور میں پندرہ سو روپے کی تنخواہ پر آپ چلے جائیں۔ بڑے بھائی صاحب نے فرمایا کہ اب تو مدینے کی طرف کوئی جگہ ملے وہاں چلے جاؤ۔چنانچہ میں خاموش ہو گیا اور وائس چانسلر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

اسی زمانے میں الہٰ آباد سے مخدومی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کا گرامی نامہ آیا۔فرمایا کہ ''واپس ناگ پور چلے جاؤ اور کام کرو، ملازمت ترک نہ کرو۔ڈاکٹر عبدالحق یہاں آئے ہوئے ہیں۔ان کی بھی یہی رائے ہے۔دعا کہتے ہیں۔''

کراچی میں ۱۹۴۸ء میں اسلامیہ کالج قائم ہوا۔ڈاکٹر امیر حسین صدیقی پرنسپل تھے۔اساتذہ کی ضرورت تھی۔علامہ شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمہ انٹرویو بورڈ میں تھے۔کبھی میرے بزرگ استاد قاری ضیاء الدین احمد الٰہ آبادی علیہ الرحمہ نے علامہ صاحب کی دستار بندی فرمائی

تھی۔ علامہ صاحب نے فوراً مجھے منتخب کرلیا۔ کام شروع ہوا تھا کہ حبیب گنج سے نواب حبیب الرحمن شروانی علیہ الرحمہ کا گرامی نامہ آیا کہ مجھے ایک مخطوطہ شاہ جہاں کے انزوا سے متعلق ملا ہے۔ تم آجاؤ اور ہم تم مل کر اس پر کام کریں گے۔ نواب صاحب کا حکم سر آنکھوں پر تھا لیکن ایسے حالات میں ان کی خدمت میں میرا جانا مشکل تھا، اس لیے معذرت کرلی۔

تھوڑے عرصے کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کراچی آگئے۔ خبر ملی تو میں خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے بڑی شفقت کے ساتھ فرمایا کہ ''آپ نے میری اجازت کے بغیر ہندوستان کیوں چھوڑا؟''۔ میں شرمندہ ہوکر رہ گیا۔ انہوں نے کتنی شفقت سے ایسا سوال کیا تھا۔ اللہ اللہ! انہوں نے بعد میں میرے متعلق حکومت کو بھی لکھا تھا۔

اسلامیہ کالج میں قریب دو سال کام کیا۔ مولانا عبدالحق صاحب پاکستان آچکے تھے، انہوں نے اور سید تقی الدین صاحب نے اردو کالج قائم کیا۔ اساتذہ کی جگہوں کے لیے درخواستیں طلب کی گئیں۔ انٹرویو کے لیے حاضر ہوا تو پرنسپل سید محی الدین صاحب نے فرمایا کہ شعبہ فارسی کے صدر اور شعبہ اردو کے صدر کی جگہیں خالی ہیں۔ آپ کس شعبے کے صدر کی جگہ پسند کریں گے۔؟ مولانا عبدالحق نے فرمایا کہ ان کو شعبۂ اردو کا صدر بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کس زبان سے ادا کروں؟ نہ زبان میں طاقت، نہ بدن میں سکت ہے۔

اردو کالج میں قریب ٦ سال کام کیا۔ ساتھ ساتھ کراچی یونیورسٹی میں بھی کلاسیں لینے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد یونیورسٹی نے اساتذہ کی تقرری کے لیے درخواستیں طلب کیں۔ علی گڑھ کے پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب وائس چانسلر تھے۔ انٹرویو کے لئے تاریخ مقرر ہوئی۔ لاہور سے ڈاکٹر محمد شفیع صاحب کا گرامی نامہ آیا۔ میری خیریت پوچھی میں نے جواب میں عرض کیا کہ یہاں انٹرویو ہونے والا ہے اور فلاں صاحب Expert مقرر ہوئے ہیں۔ انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ ''وہ تمہارا انٹرویو کیا کرے گا''۔ ڈاکٹر محمد شفیع صاحب اور ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب چاہتے تھے کہ میں لاہور چلا جاؤں۔ لیکن والدہ مرحومہ بہت کمزور تھیں۔ ان کی وجہ سے میں وہاں نہیں جاسکا۔ کراچی یونیورسٹی میں میرا تقرر نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی۔ وہ جگہ ریڈر کے گریڈ کی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد سندھ یونیورسٹی کے رجسٹرار صاحب کا خط آیا۔ یہاں کے وائس چانسلر علامہ آئی آئی قاضی صاحب آپ سے بات کرنا

چاہتے ہیں۔ مقررہ تاریخ پر میں حاضر ہوا تو سلام کے بعد علامہ صاحب نے صرف ایک جملہ فرمایا کہ ''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی جو آپ یہاں آجائیں گے۔'' بڑی شفقت فرمائی اور مجھے پروفیسر کے گریڈ میں (ایک اضافے کے ساتھ) مقرر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا بے حد احسان ہے۔

میں حیدرآباد پہنچا تو والدہ صاحبہ نے داغ مفارقت دیا۔ پھر کچھ ماہ کے بعد بڑے بھائی صاحب نے بھی رحلت فرمائی۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہوا۔ لیکن میں بے حد شکر گزار ہوں کہ ان تمام بزرگوں کا کہ انہوں نے مجھ حقیر پر کرم فرمایا اور بے حد نوازا۔ اللہ تعالیٰ ان سب بزرگوں کو جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ ☆

☆ متفرقات۔ ص ۹۳

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو

۱۔ میرے بچپن کے زمانے میں یہ بات مشہور تھی کہ جو شخص انگریزی پڑھتا ہے، وہ عیسائی ہو جاتا ہے۔ میں نے علی گڑھ میں میٹرک کا امتحان ۱۹۲۹ء میں دیا۔ امتحان کے بعد وطن آیا تو ایک بڑے میاں ملے۔ انہیں علم ہو چکا تھا کہ میں نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ بڑے خلوص سے فرمانے لگے کہ ''دیکھو میاں، اپنے بزرگوں نے جو کچھ قرآن پاک میں لکھ دیا ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا''۔ انہوں نے اس جملے کی کوئی تشریح نہیں فرمائی لیکن جس شخص سے بھی اس جملے کا ذکر کیا وہ بڑے میاں کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا۔

۲۔ میرے ایک کرم فرما یہاں حیدرآباد میں بڑے آفیسر تھے۔ اب ریٹائر ہو کر دوسری جگہ چلے گئے ہیں۔ انہیں مرید بننے کا بہت شوق ہے۔ غالباً ۵، بزرگوں سے بیعت ہو چکے ہیں، لیکن اب بھی ان کا پیٹ نہیں بھرا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ مجھے بیعت فرما لیں۔ لیکن بار بار عرض کرنے پر بھی بخل کرتے ہیں۔ وہ مرید بن کر کھلانے پلانے کے بہت مشتاق ہیں لیکن پیر بن کر کھانے کے لئے تیار نہیں۔ کیسا ظلم ہے، ہم غریبوں پر!

۳۔ ایک مرتبہ بارش کے زمانے میں ایک بڑے میاں کے ساتھ ریل کا سفر کرنا پڑا۔ بڑے خوش اخلاق تھے کہ ایک خدمت گار ساتھ ہو گیا۔ لیکن اب ان کو ایسی سوجھی کہ ان کی ہر بات پر لبیک کہنے کی توقع فرمانے لگے۔ بارش زوردار ہو رہی تھی۔ بڑے میاں فرمانے لگے کہ دیکھیے، اس علاقے میں کہیں بارش نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں، لیکن اتفاق یہ ہے کہ ہر جگہ بارش کا پانی بھرا ہوا ہے۔ یا پھر کسی نے ہر جگہ پانی بھر دینے کا اہتمام کیا ہوگا۔ بڑے میاں، میری دوسری بات سے بہت خوش ہوئے کہ بے شک کسی نے پانی

کی گاڑیاں بہادیں ہوں گی۔

۴۔ایک مرتبہ ایک بڑے میاں ساتھ ہو گئے۔ میرے ساتھ، میرا ایک شریر دوست بھی ساتھ ہو گیا۔ بڑے میاں ہر قدم پر بسم اللہ، بسم اللہ کہتے جاتے تھے۔ میرا دوست ہر قدم پر ۷۸۶ کہتا تھا۔ بڑے میاں نے دریافت کیا کہ یہ لڑکا کیا کہتا ہے؟ میرے دوست نے کہا کہ حضرت، میرا وضو نہیں ہے اس لئے میں بسم اللہ نہیں کہتا، ۷۸۶ کہہ لیتا ہوں۔ بڑے میاں کچھ غور کرنے لگے اور فرمانے لگے کہ یہ لڑکا صحیح بات کہتا ہے اب میں بھی ۷۸۶ کہا کروں گا۔ لیکن جب وضو ہوگا تو بسم اللہ بھی کہوں گا۔

۵۔ایک مولوی صاحب بہت جوش کے ساتھ تقریر فرمارہے تھے۔ موضوع یہ تھا کہ آج کل مولویوں نے بڑے جھگڑے پیدا کر رکھے ہیں۔ ہر مولوی دوسرے مولوی کو کافر کہتا ہے اور اس سے لین دین کرنا بھی کفر میں تقویت پہنچانے کے مترادف جانتا ہے۔ جلسے میں انہوں نے بالخصوص لڑکوں کو مخاطب فرماتے ہوئے، ارشاد فرمایا کہ تم ایسے مولویوں سے ہرگز تعلق مت رکھنا اور ان کی بات ہرگز نہ ماننا۔ (ایک لڑکے نے خاموشی سے عرض کیا کہ دوسرے مولویوں کی بات نہیں مانیں گے، اور آپ کی بھی ......)

(۶) ایک سید تھے۔ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ انگریز کمشنر تھا۔ اس کی خوب خوش آمد کرتے رہے، آخر وہ ''خان صاحب'' بنادیے گئے۔ لوگوں نے ان کی تعریف میں قصیدے لکھے:

سید سے ''خان صاحب'' کیا خوب ترقی ہے

۷۔ جبل پور سے ناگ پور جانے کے لئے گوندیا تک چھوٹی لائن تھی۔ وہاں سے بڑی لائن ملتی تھی۔ گوندیا میں میرے عزیز دوست نام دار خاں وکالت کرتے تھے۔ مجھے گاڑی بدلنے کے لئے وہاں ٹھہرنا پڑتا تھا تو ان کے پاس چلا جاتا تھا۔ ایک بڑے میاں وہاں ان کے پاس بیٹھے ہوئے ملے۔ وہ مختلف لوگوں کا ذکر کرنے لگے کہ وہ میرے سامنے ننگے پھرتے تھے۔ میں نے کہا کہ وہ بڑے بدتمیز تھے کہ آپ کے سامنے ننگے پھرتے تھے۔ کہنے لگے، نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ مجھ سے بہت چھوٹے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور صاحب کا ذکر آیا۔ فرمانے لگے، ہاں وہ مجھ سے بڑے تھے۔ میں نے کہا کہ پھر تو آپ ان کے سامنے ننگے پھرتے ہوں گے۔ بڑے میاں خاموش ہو گئے۔ ہم لوگ دیر تک ہنستے رہے۔

۸۔ ماہ فروری میں علی گڑھ کی نمائش کا انعقاد ایک مدت سے مشہور ہے۔ بابائے اردو عبدالحق اور مولانا حسرت موہانی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس نمائش کی بعض دکانیں بھی اب تک اسی مقام پر قائم ہوا کرتی ہیں جو اگلے وقتوں میں قائم ہوا کرتی تھیں۔ ایک دکان Hat کی تھی۔ بہت بڑا اور بہت چھوٹا Hat لٹکا رہتا تھا اور وہاں لکھا رہتا تھا:

Free to whom it fits

خاص طور پر پشاوری کباب پراٹھے کی دکان اور اسی کے ساتھ "خواجہ" کے اچار چٹنی کی دکان۔ میرا پوتا حافظ منیر احمد خاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ فروری ۲۰۰۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کانفرنس میں شرکت کے لیے پہنچا تو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی دعوت یونیورسٹی نے اسی پشاوری کباب پراٹھے کی دکان میں مقرر کی تھی۔

میرے زمانے میں ایک بڑے میاں (معلوم نہیں کہاں سے) ضرور اس نمائش کے دیکھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ بڑی لمبی شیروانی پہنتے تھے۔ لڑکوں نے ان کا نام "دُم دراز خاں" رکھ لیا تھا۔ وہ جہاں جاتے تھے اسی نام سے یاد کر لئے جاتے تھے۔ وہ اگلے وقتوں کے ہوں یا پچھلے وقتوں کے، اس نام سے یاد کئے جانے پر صبر کا گھونٹ پینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

۹۔ میرے ایک عزیز جے پور میں تھے۔ وہاں ایک اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ٹھیا گئے تھے اور پنڈت بھی تھے۔ ماہ صفر کا آخری چہار شنبہ قریب آ گیا تو ہندو مسلمان تمام طلبہ نے خواہش ظاہر کی کہ اس دن چھٹی ہونا چاہئے۔ سب لڑکے ہیڈ ماسٹر کے پاس گئے اور چھٹی کے لیے درخواست کی۔ انہوں نے کہا کہ پار سال اس دن چھٹی نہیں ہوئی۔ ایک طالب علم نے کہا کہ پار سال تو اس دن اتوار تھا (جب کہ معمول کے مطابق چھٹی ہوا کرتی ہے)۔ ہیڈ ماسٹر صاحب خاموش ہو گئے اور چھٹی کا اعلان کر دیا۔ طلبہ نے اس کامیابی پر ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ ہنسی کے مارے سب کا برا حال تھا۔

۱۰۔ میرے ایک کرم فرما تھے ان کی عادت شریفہ تھی کہ اگر کوئی شخص ان کو قرآن خوانی کے لیے عرض کرتا تھا تو وہ (از راہِ دور اندیشی) بہت دیر لگا کر پہنچتے تھے۔ دیر لگانے میں دو فائدے پیش نظر تھے۔ ایک یہ کہ بہت کم پڑھنا پڑے گا اور پھر مٹھائی یا کھانا جو کچھ بھی تقسیم ہوگا، وہ جلد مل سکے گا۔

ایک اور کرم فرما ہیں۔ وہ جب کبھی سفر میں ساتھ ہو جاتے تھے تو ٹکٹ وغیرہ خریدتے وقت پیچھے ہو جاتے تھے اور مجھے موقع دیتے تھے کہ میں ان کا ٹکٹ بھی خریدلوں اور ثواب حاصل کروں۔

۱۱۔ایک صاحب نے اپنی اہلیہ مرحومہ کے نام سے جو مکان تھا، وہ فروخت کیا۔ رقم میں بیٹی کا حق بھی نکلتا تھا۔ انہوں نے بیٹی کو ثواب حاصل کرانے کے لیے یہ ترکیب سوچی کہ بیٹی سے کہا کہ میں، تمہارے حصے کی رقم میں حج کر آتا ہوں (بیٹی کب اپنی ماں کے لئے ثواب نہ پہنچانا چاہے گی)۔ بیٹی نے اجازت دے دی۔ اس طرح رقم بھی نہ دینا پڑی اور اہلیہ مرحومہ کے لیے حج بھی ہو گیا۔ کتنی دانائی کا کام کیا۔ ماشاءاللہ ☆

☆ متفرقات۔ ص ۸۸

ذکر کچھ پہلوانوں کا

میرے بچپن میں مسلمانوں کو کشتی لڑنے کا بہت شوق تھا۔ خود میرے وطن میں اور میرے محلے میں بھی کئی اکھاڑے تھے۔ غالباً ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے جب گاما پہلوان نے امرت سر میں زبیسکو پہلوان کو پچھاڑا تھا۔ وہاں کے راجا نے دہلی کے وائسرائے کو کشتی دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ کشتی دیکھنے کے لئے لوگ جمع ہوئے راجا نے وائسرائے کے لئے سگریٹ جلائی کہ کشتی ہوگئی۔ یعنی بہ مشکل ایک منٹ ہوا ہوگا کہ گاما پہلوان نے زبیسکو کو پچھاڑ دیا۔ لوگ حیرت میں رہ گئے۔ اس موقع پر گاما پہلوان کو رستمِ زماں کا خطاب دیا گیا اور ان کے بھائی امام بخش کو کسی بڑی کشتی جیتنے پر رستمِ ہند کا خطاب ملا۔

مجھے یاد ہے کہ میں اس وقت غالباً دوسری یا تیسری کلاس (مڈل اسکول) میں تھا۔ میرے ایک ذہین ساتھی ریاض الدین تھے، وہ کہنے لگے کہ جب گاما، ہندوستان میں موجود ہیں تو ان کی موجودگی میں امام بخش کیوں کر رستمِ ہند (یعنی ہندوستان کی سب سے بڑے پہلوان) کہلائے جا سکتے ہیں۔ گاما پہلوان نے اس وقت تک پیٹرسن وغیرہ کئی مشہور پہلوانوں کو زیر کر لیا تھا۔ ان کو انعام میں ایک گُرز بھی ملا تھا۔ ان کی وجہ سے مسلمانوں کا حوصلہ بلند ہو گیا تھا اور وہ کسی قوم کو اپنے مقابلے میں کچھ بھی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

جبل پور میں پورے سال دنگل ہوتے تھے اور بہ کثرت لوگ کشتی لڑنے کے عادی تھے۔ میرے محلے کے قریب ہفتہ وار دنگل ہوتا تھا اور کان پور کے ادھا پہلوان کی عموماً کشتی ہوا کرتی تھی۔ وہ حافظ بھی تھے اور ہندو لوگ ان کو رمضان المبارک میں (عمداً) چیلنج دیتے تھے اور ان سے کشتی عصر کے وقت ہوا کرتی تھی۔ وہ اللہ کے شیر تھے، روزے کی حالت میں (اور عصر

کے وقت) وہ اپنے حریف کو پچھاڑ دیتے تھے اور تمام مسلمانوں کا حوصلہ بلند ہو جاتا تھا۔

جبل پور کے محلہ ملونی گنج میں امرت سر کے تین پہلوانوں کا قیام تھا۔ وہ بھائی بھائی تھے، غلام قادر، غلام حیدر اور غلام غوث ان کے نام تھے اور ان کی وجہ سے پورے شہر میں مسلمانوں کا غلبہ تھا۔ ان کی اور سب مسلمانوں کی عادت تھی کہ جب وہ اکھاڑے میں اترتے تو ''بسم اللہ'' پڑھ کر اور کعبے کی طرف رخ کر کے اپنے حریف سے ہاتھ ملاتے اور پھر وہ ۲۔۳ منٹ کے اندر پچھاڑ دیتے تھے۔ نماز کا وقت ہوتا تھا تو کہیں بھی پاک جگہ پر نماز پڑھنے لگتے تھے۔

گاما پہلوان اور امام بخش پہلوان ۱۹۳۳ء میں بھی جبل پور آئے تھے۔ وہاں انجمن اسلامیہ ہائی اسکول سے کچھ فاصلے پر اکھاڑا بنایا گیا۔ امام بخش کی کشتی ''دیوبند'' پہلوان سے ہوئی، بہ مشکل دو منٹ ہوئے ہوں گے کہ امام بخش نے اپنے حریف کو پچھاڑ دیا۔ پھر ان کے عزیز جیجا پہلوان کی بھی کسی سے کشتی تھی۔ جیجا بالکل نوعمر لیکن بہت خوب صورت تھے۔ انہوں نے اپنے حریف کو دو مرتبہ اپنے سر کے اوپر سے پھینکا، لیکن وہ چت نہیں ہوا، پھر جیجا نے تیسری بار اپنے حریف کو اپنے سر کے اوپر سے بڑے اطمینان کے ساتھ پھینکا اور وہ چت ہو گیا۔ بڑے جوش کے نعرے لگائے گئے۔

پھر گاما پہلوان سے عرض کیا گیا کہ وہ بھی کچھ اپنے داؤ پیچ دکھائیں۔ چنانچہ امام بخش اور ان کے کئی عزیز اکھاڑے میں اتر گئے۔ ان سب نے مل کر گاما پہلوان پر حملہ کیا۔ گاما پہلوان نے ان سب کو اٹھا اٹھا کر پھینک دیا۔ حتیٰ کہ امام بخش کو بھی اٹھا کر پھینک دیا۔ یہ منظر دیکھ کر ایک بہت تگڑا ہندو پہلوان اکھاڑے میں آ گیا، اس کا خیال تھا کہ گاما پہلوان اپنے عزیزوں کو اٹھا کر پھینک رہے ہیں تو اس عمل میں کچھ برادری کی مروت کام کر رہی ہے۔ وہ بے چارا اپنی بہادری دکھانے کے لئے اکھاڑے میں اترا تھا۔ گاما پہلوان نے اس قدر زور سے اسے اکھاڑے میں دے مارا کہ وہ دیر تک بے ہوش پڑا رہا۔ بہت دیر کے بعد ڈاکٹروں نے اسے ہوش کے لئے دوائیں دیں پھر اسے ہوش آیا۔

غالباً ۱۹۴۰ء میں بھی گاما پہلوان امراؤتی (برار) تشریف لائے تھے۔ ان کے بھائی وغیرہ بھی ساتھ تھے۔ چند عزیزوں کی کشتی ہوئی۔ گاما پہلوان نے تمام لوگوں کو سلام عرض کیا اور شکریہ ادا کیا۔

پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو گاما پہلوان کراچی آ گئے تھے۔ پھر لاہور تشریف لے گئے اور وہیں وفات پائی۔ افسوس کہ ان کے جانے کے بعد پہلوانی ملک سے ختم ہو گئی اور ایک بہت اچھے فن سے لوگ محروم ہو گئے۔ ☆

☆ متفرقات۔ ص ۱۰۳

کہوں یا نہ کہوں؟

ان اوراق میں کچھ واقعات اور لطیفے درج ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض قارئین کو پسند نہ آئیں لیکن بعض کو پسند آسکتے ہیں کہ ان سے بعض نفسیاتی الجھنیں دور ہوسکتی ہیں۔ بہر حال میں نہ کہوں گا کہ یہ سب باتیں سودمند ہیں۔

من نہ گویم کہ ایں ہمہ شہد است

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی زندگی، زندہ دلی سے عبارت تھی۔ راقم الحروف کئی ہوسٹلوں میں رہا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں بعض احباب کی وجہ سے ماریسن کورٹ (ہوسٹل) میں بھی قیام رہا ہے۔ وہاں ایک نیک اور دین دار دوست ملے جو بعد میں وہاں کے وارڈن بن گئے تھے، عرصے کے بعد جب پاکستان وجود میں آیا تو وہ بھی یہاں آگئے۔ ایک جلسے میں ان کے ساتھ مجھے بھی تقریر کرنے کا موقع ملا۔ ان کو دیکھا تو سراپا، ایک خاص رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ یہی کہنا پڑا کہ:

"آپ کو کیا ہو گیا ہے!"

وہ مسکراتے رہے۔ پھر ان کے رنگ میں پوری ایک جماعت رنگ گئی۔ چند سالوں کے بعد وہ اللہ کو پیارے ہوئے اور مریدوں نے ان کی قبر کو بھی ایک تماشا بنا دیا ہے۔ اناللہ!

ایک صاحب کا نام عبدالحکیم تھا۔ ان کے کمرے کی چابی غائب ہوگئی یا غائب کردی گئی۔ پھر جب ملی تو اس چابی کے ساتھ "نظامی گنجوی" کی مثنوی "مخزن الاسرار" کا پہلا مصرع بھی ایک کاغذ پر چسپاں کردیا گیا:

ہست کلید در گنج حکیم

ان کا نام تو عبدالحلیم تھا۔ لیکن وہ پھر ''گنجے حکیم'' ہی کہلائے گئے۔

علی گڑھ کے ہوسٹلوں میں مٹھائی غائب کرنا ایک خاص تفریح تھی، کہا جاتا تھا کہ چوری کی مٹھائی سے زیادہ طاقت آتی ہے۔ یہاں میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ بھائی غلام علی خاں متھرا کے تھے، ان کے والد وہاں سے مٹھائی لاتے رہتے تھے، غلام علی مجد کو تو کھلا دیتے تھے، لیکن سب کو کھلانے سے رہے۔ ایک مرتبہ لڑکوں نے ان کی مٹھائی دیکھ لی۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ خان صاحب! مٹھائی کھانا ہے۔ میں سینئر تھا (سینئر کی وہاں عزت کی جاتی تھی)۔ میں نے لڑکوں کو بھگا دیا۔ کچھ دیر کے بعد پھر وہ لوگ آئے اور پھر وہی مطالبہ کہ مٹھائی کھانا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ غلام علی میرا ادب کرتے تھے، تو اس ادب کا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ چنانچہ، ایک وقت جب وہ اپنے کمرے سے جانے لگے تو لڑکوں نے مجھے پکڑ کر ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ انہوں نے تکلف میں تالا نہیں لگایا۔ لڑکے یہی چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھائی غلام علی کا صندوق ہوسٹل کے پیش امام کے کمرے میں رکھ دیا اور مجھے وہاں سے لے گئے۔ صندوق میں تالا لگا ہوا تھا۔ پیش امام صاحب نے فرمایا: کہ میرے پاس ریتی ہے۔ بس ریتی سے تالا کاٹا گیا۔ سب نے مٹھائی کھائی۔ پیش امام صاحب نے بڑھ بڑھ کر داد دی۔ میں پھر وہ صندوق اپنے کمرے میں لے آیا، اور ایک نیا تالا (چابی سمیت) لگا کر ان کے دروازے پر رکھ آیا۔

علی گڑھ میں ایک صاحب ''نعمان'' تھے۔ وہ اپنا نام Noman لکھتے تھے۔ انگریزی میں خوب تقریر کرتے تھے۔ طلبہ کا خیال تھا کہ جب وہ خود کو Man نہیں سمجھتے، تو پھر ہم لوگ بلاوجہ انہیں مرد کیوں سمجھیں؟

ایک صاحب حج سے واپس آئے تو انہیں خود کو 'حاجی صاحب'' کہلانے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے بہت سے الائچی دانے خرید لئے۔ وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتے تو راستے کے لڑکوں سے کہتے کہ مجھے ''حاجی صاحب'' کہو تو الائچی دانے دوں گا۔ اس طرح وہ بہت جلد ''حاجی صاحب'' کہلانے لگے۔

پاکستان بننے سے چند سال پہلے کا ایک واقعہ پہلوانی کا مشہور ہوا۔ وہاں ایک ہندو پہلوان بہت تگڑا تھا۔ مسلمانوں میں کوئی ایسا پہلوان نہیں تھا جو اس سے مقابلہ کر سکے۔ انہوں

نے ایک بات یہ طے کی کہ ایک دبلے پتلے پہلوان سے اس ہندو پہلوان کی کشتی طے کرائی جائے۔ ایسے دبلے پہلوان کا نام ''چوں چرا'' رکھا۔ اس نے اس ہندو پہلوان کو چیلنج کر دیا۔ کشتی کا دن مقرر ہوا۔ اب مسلمانوں نے چار پانچ کی تعداد میں ہر روز اس ہندو پہلوان کے یہاں جانا شروع کیا۔ ایک جماعت نے اس سے بڑی ہم دردی ظاہر کی کہ آپ اس ''چوں چرا'' پہلوان سے کشتی مقرر کرنے سے پہلے ہم سے بھی تو مشورہ لے لیتے۔ وہ بڑا خوں خوار پہلوان ہے۔ ''چوں'' کہتے ہی اکھاڑے میں گھس جاتا ہے اور ''چرا'' کہتے ہی اپنے حریف کی آنکھیں نکال لیتا ہے۔ دوسری جماعت اور پھر تیسری جماعت وغیرہ اس ہندو پہلوان کے پاس جاتی رہی اور کوئی نہ کوئی ہمدردی کی بات اس سے کہتی رہی۔ اور اس کو یقین دلا دیا کہ واقعی وہ چوں چرا پہلوان بڑا خوں خوار ہے۔ بہر حال کشتی کا دن آیا۔ اکھاڑے میں چوں چرا پہلوان مقابلے کے لیے کھڑا ہوا۔ ''چوں'' کہا تو ہندو پہلوان سہم گیا، اور ''چرا'' کہا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بس، چوں چرا پہلوان نے اسے گرا کر چت کر دیا اور کشتی جیت لی۔

عرصہ ہوا کہ راقم الحروف اپنے چند احباب کے ساتھ حج کے لئے گیا تو جدے میں ایک دن کا قیام کرنا پڑا۔ خیال تھا کہ حاجی کیمپ میں یا کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے۔ لیکن ایک کرم فرما مل گئے۔ ان کے اصرار پر ہم لوگ ان کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ از راہِ دور اندیشی انہوں نے عشاء کے بہت بعد کھانا کھلایا۔ پھر بڑی دیر کے بعد چائے کا دور شروع ہوا۔ اس موقع پر بہ کثرت کھٹل ان کے کمرے کے در و دیوار سے ہماری پذیرائی کے لیے وارد ہوئے۔ ہم لوگ ان کی خاطر تواضع بھی کرتے جاتے تھے۔ لیکن انہوں نے ہم سے بدلہ لینا نہیں چھوڑا۔ کچھ دیر کے بعد فجر کی اذان ہوگئی۔ میزبان صاحب نے اور ان کے کھٹملوں نے بہ مشکل ہمیں خیر باد کہا۔

اس عاجز کو اپنے شیخ حضرت مولانا زوار حسین صاحب علیہ الرحمہ کے ساتھ پہلی بار ۱۳۷۲ھ میں حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ مدینہ منورہ میں ایک صاحب ملے، جو رفتہ رفتہ غوث بن گئے۔ ۱۳۹۸ھ میں ان سے مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ غارِ حرا میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تین شخص ہوتے ہیں، جو دنیا کا نظام چلاتے ہیں۔ ایک تو حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ ہوتے ہیں۔ دوسرے میرے پیر ہوتے ہیں، اور تیسرا ایک

۱۳۹۹ھ میں عمرے کے لئے یہاں سے ایک ڈاکٹر گئے اور وہاں ان سے ملے تو اور شخص (یعنی وہ خود)۔ انہوں نے ان سے بھی اسی طرح کے کلمات فرمائے اور حضرت امام مہدی علیہ السلام کی تشریف آوری کی خبر سنائی۔ سعودی حکومت نے جب ایسے لوگوں پر ڈنڈا گھمایا تو وہ بھی بھاگ کر پاکستان آگئے۔ پھر ان کے مرید نے ضیاء الحق مرحوم سے سفارش کرا کر ان کو سعودی عرب واپس بھیجا۔ اور وہ بے چارے غوث صاحب اللہ کو پیارے ہوئے۔

۱۳۹۹ھ کے اواخر میں یہاں حیدرآباد میں بھی ایک صاحب نے امام مہدی علیہ السلام کی تشریف آوری کی خبر سنائی۔ وہ زیادہ زوردار تھی۔ یعنی امام مہدی علیہ السلام یہاں حیدرآباد میں صرف ان سے ملنے آئے تھے۔ مکہ معظمہ بعد میں تشریف لے گئے۔

ہمارا شہر جبل پور (سی پی) پیروں کی کثرت میں شاید کسی شہر سے پیچھے نہیں تھا۔ ان پیروں کا گزارا عموماً نذرانوں سے ہوتا تھا۔ ایک پیر کو دیکھا کہ جب کوئی شخص ان سے مصافحہ کرتا تھا تو وہ فوراً اپنا ہاتھ اس کے منہ کے قریب کر دیتے تھے تاکہ اسے چومنے میں سہولت رہے، اور دوسرے لوگ بھی اس کی پیروی کریں۔ پھر ان کے پاس ایک رجسٹر ہوتا تھا جس میں مرید کا نام، پتا اور حیثیت کے مطابق ضروری نذرانے کی رقم درج کر دی جاتی تھی۔ پیر صاحبان عموماً شہروں کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ میلاد شریف عشاء کے بعد پڑھتے تھے۔ پھر مرید کے یہاں کھانا کھاتے تھے اور نذرانہ وصول کرتے تھے۔ سال بھر وہ اسی طرح دورے کر کے اپنا گزارا کرتے تھے۔ جبل پور سے ۴۸ میل پر ریلوے اسٹیشن کٹنی ہے۔ میرے خالہ زاد بھائی عبدالواحد خاں ریلوے میں ملازم تھے۔ انہوں نے ایک رات پیر صاحب کو میلاد شریف پڑھنے کی دعوت دی۔ (حالانکہ وہ مرید نہیں تھے)۔ میلاد شریف شروع ہوئی تو تھوڑی دیر میں وہاں سے جبل پور جانے والی ریل گاڑی تیار ملی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر جبل پور روانہ ہو گئے۔ پیر صاحب کھانے اور نذرانے دونوں سے محروم رہ گئے۔ چند روز گزرے تھے کہ اتفاق سے پیر صاحب کے گھر کے سامنے سے میرا گزر ہوا۔ پیر صاحب برہم ہو کر مجھ پر برس پڑے کہ دیکھو، تمہارے خالہ زاد بھائی نے کتنا بڑا دھوکا دیا کہ کھانا بھی نہیں کھلایا اور نذرانہ بھی نہیں دیا۔ پیر صاحب شاید متوقع تھے کہ میں اپنے خالہ زاد بھائی کی طرف سے نذرانہ پیش کروں۔ لیکن ایسا

بھی نہیں ہوا۔ بڑے غضب ناک تھے۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
وہ کہتے ہوں گے کہ کیسے نالائق ہیں یہ مرید لوگ اور ان کے رشتہ دار!

چند ماہ ہوئے ایک مشہور خانقاہ کے ''گدی نشین'' تشریف لائے۔ مونچھیں ڈاڑھی صاف۔ شان دار ٹوپی تھی۔ تنگ پائچوں کا پاجامہ تھا جو ٹخنوں کو ڈھانپے ہوا تھا۔ گلے میں ایک بہت لمبا اور نارنگی رنگ کا رومال لپٹا ہوا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر اپنا تعارف کرایا کہ میں فلاں خانقاہ کا گدی نشین ہوں۔ کیا عرض کر سکتا تھا! خاموش رہا۔ حضرت سعدیؒ فرما گئے ہیں:

پسرِ نوحؑ بابداں بنشست
خاندان نبوتش گم شد
سگِ اصحاب کہف روزے چند
پئے نیکاں گرفت و مردم شد

کراچی کے ایک رسالے میں اعلان تھا کہ بعض علماء کے مواعظ ٹکٹ بھیجنے پر مفت مل سکتے ہیں۔ میں نے ٹکٹ کے لئے دس روپے کا نوٹ ایک لفافے میں رکھ کر بھیج دیا۔ مدیر صاحب کو جوش آیا اور وہ دس روپے اپنے لفافے میں رکھ کر واپس کئے اور اس طرح تحریر فرمایا کہ ''لفافے میں نوٹ رکھ کر بھیجنا شرعاً ''عقلاً'' اور قانوناً حرام ہے۔ میں نے جواب میں ان کو لکھا کہ ''آپ نے جو لفافے میں میرا نوٹ رکھ کر بھیجا ہے تو کیا وہ شرعاً، عقلاً اور قانوناً جائز ہے؟۔ مدیر صاحب خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہیں دیا۔

میرپور خاص (سندھ) کے قریب ایک گاؤں میں میرے بچوں کو ایک صاحب سیر کے لئے لے گئے۔ وہاں مغرب کا وقت ہو گیا۔ میرے پوتے حافظ منیر احمد خان سلمہٗ نے مغرب کی نماز پڑھائی۔ لیکن صلوٰۃ وسلام آواز سے نہیں پڑھا تھا، اس لیے وہاں کے لوگوں کا وضو ٹوٹ گیا۔ انہوں نے پھر سے وضو کر کے نماز ادا کی۔ شریعت سے تعلق کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ صرف صلوٰۃ وسلام سے بیڑا پار ہو جائے گا۔ خدا کرے کہ ایسا بھی ہو۔

بعض علاقوں میں یہ دستور بن گیا ہے کہ افسر اپنے ماتحتوں سے، پرنسپل اپنے اسٹاف اور استاد اپنے شاگردوں سے مختلف مقاصد کے لیے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا ہے کہ مجھے حج

پر جانا ہے یا بیٹی کی شادی کرنا ہے یا مکان بنوانا ہے۔ یہ رقمیں عموماً قرض کے طور پر وصول کی جاتی ہیں۔قرض کا نام ہو یا نہ ہو بس رقم مل جانا چاہئے۔کیونکہ واپس تو کرنا نہیں ہے۔

بڑا افسوس ہوتا ہے لیکن لوگ مجبور ہو کر رقم ادا کر دیتے ہیں، اور دل میں بد دعا دیتے ہیں۔

ہلال عید بردواج فلک ہویدا شد
کلید میکدہ گم گشتہ بود، پیدا شد

ایک مرتبہ رمضان المبارک کے اختتام پر کراچی میں ایک عظیم بزم قوالی کا اہتمام کیا گیا۔ سننے والوں اور سنانے والوں نے بڑی تیاری کی۔ ایک پیر صاحب صدر مجلس مقرر ہوئے۔ انہوں نے اس دن خود کو عمدہ سنہرے جبہ دستار سے مزین کیا۔قوالی شروع ہوئی۔ میرے ایک کرم فرما کے بھائی نے بھی کچھ تیاری کی تھی۔انہوں نے پیر صاحب کے بالکل قریب اپنی جگہ بنالی۔قوالی شروع ہوئی تو پیر صاحب کو بڑے زور کا وجد آ گیا۔ان کی پگڑی کہیں گئی اور وہ کہیں گئے۔میرے کرم فرما کے بھائی کو اور زیادہ زور کا وجد آ گیا۔انہوں نے پیر صاحب کو ایسا دبوچا کہ پیر صاحب کی چیخ نکل گئی۔پیر صاحب چیخ رہے تھے اور وہ صاحب ان کو دبوچ کر رگڑ رہے تھے۔اس دنگل نے ایسا رنگ جمایا کہ لوگ قہقہے لگانے لگے۔لیکن پھر کچھ لوگ دوڑ پڑے اور دونوں کے وجد کو کسی طرح ختم کیا۔پیر صاحب نے پھر اعلان کیا کہ کوئی بدتمیز شخص قوالی کے وقت میرے پاس نہ آئے، ورنہ اس کی خیر نہیں۔

غالباً ۱۹۷۰ء میں سندھ یونیورسٹی نے ڈاکٹر احمد بشیر مرحوم کو اور راقم الحروف کو شکار پور کالج کے معائنے کے لیے بھیجا تھا۔کالج کی عمارت غنیمت تھی۔اساتذہ اور طلبہ برائے نام تھے۔ لائبریری میں یہاں وہاں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ کالج کے پرنسپل شیخ صاحب تھے۔بہت تپاک سے ملے۔فرمانے لگے کہ میں اپنا تعارف کرادوں؟ میں نے عرض کیا کہ ضرور۔فرمانے لگے کہ میں بہت نیک آدمی ہوں، میں نے فلاں مسجد بنوائی۔فلاں عورت کا کام بنادیا۔فلاں کے لیے راشن دلوادیا۔غرض کہ ان کو اپنی تعریف کرنے سے فرصت نہیں تھی اور ہم لوگوں کو قہقہے لگانے سے فرصت نہیں تھی۔بہر حال سب کام خیر و خوبی کے ساتھ نمٹایا اور ہم لوگ رخصت ہوئے۔حیدرآباد، پھر جام شورو پہنچے۔محترم غلام نبی بھنگر صاحب نے پرنسپل صاحب

کے دو لطیفے بہت زوردار سنائے۔ انہوں نے بتایا کہ جب پرنسپل صاحب قبرستان جاتے ہیں تو وہاں پہنچ کر اہل قبور سے فرماتے ہیں ''لیٹے رہیے، لیٹے رہیے، تکلف نہ فرمائیے۔ وعلیکم السلام، وعلیکم السلام''۔

ایک اور لطیفہ یہ سنایا کہ ایک شخص نے ان کی دعوت کی تو پرنسپل صاحب نے فرمایا کہ اچھا آ جاؤں گا لیکن دیکھو، صرف دال روٹی پکانا۔ میزبان نے عرض کیا کہ بالکل ایسا ہی ہوگا۔ لیکن جب وہاں پہنچے تو دسترخوان پر بریانی، کباب، پراٹھے وغیرہ موجود تھے۔ پرنسپل صاحب نے میزبان سے فرمایا کہ میں نے تو کہا تھا کہ دال روٹی پکانا، لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟ میزبان نے کہا کہ میں نے تو دال روٹی ہی پکائی تھی۔ آپ کے آنے سے یہ بریانی وغیرہ بن گئی۔ پرنسپل صاحب نے کہا کہ ''ہاں میری وجہ سے ایسا ہی ہو جاتا ہے۔''

آخر میں عرض کروں گا کہ موجودہ دور میں پاکستان کے لوگوں کو احتیاط کی زیادہ ضرورت ہے۔ دشمنان اسلام مختلف حربے استعمال کر رہے ہیں۔ بعض مسجدوں میں امام بن کر اور بعض ٹھکانوں میں پیر بن کر کام کر رہے ہیں۔ لوگوں کو (اور بالخصوص عورتوں کو) اپنے شعبدے بازی سے متاثر کر کے ان سے وصولی کرتے ہیں اور سیاسی حالات کا جائزہ لیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو پہچاننا ضروری ہے۔ مولانا روم نے صحیح فرمایا ہے:

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نہ باید داد دست

ایسے شیطانوں کو پہچاننے کے لیے شریعت کی پابندی میں ان کا خلوص دیکھنا ضروری ہے:

خلافِ پیغمبرؐ کسے رہ گزید
کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے۔ آمین ☆

☆ متفرقات۔ ص ۹۷

تکیہ کلام

تکیہ کلام یا تکیہ کلام وہ لفظ یا الفاظ ہیں جو بعض حضرات کی زبان سے بلا ارادہ ادا ہوتے ہیں۔ بات کرتے کرتے زبان ذرا رکی یا کچھ سوچنے کی ضرورت ہوئی تو وہ الفاظ برجستہ ادا ہو جاتے ہیں۔

۱۔ راقم الحروف جب علی گڑھ کی انٹرمیڈیٹ کلاس میں تھا تو وہاں کے کالج کے وائس پرنسپل سید ولی محمد صاحب بہت نیک، بڑی شفقت والے اور بہت محنت سے پڑھانے والے استادوں میں سے تھے۔ وہ انگریزی پڑھاتے تھے، ان کی زبان ذرا رکتی تو وہ برجستہ They say کہہ کر بات آگے بڑھاتے تھے۔

۲۔ اسی زمانے میں ایک اخبار میں کسی شخص کا ''تکیہ کلام'' شائع ہوا۔ وہ شخص اپنے ہر جملے کے ساتھ ''آپ کے منہ میں'' کہنے کا عادی تھا۔ اس کی زندگی میں ایک ''سانحہ'' پیش آیا کہ اس کی ملازمہ گھر سے بھاگ گئی۔ وہ تھانے میں رپورٹ کرانے گیا۔ تھانے دار سے کہا کہ میری ملازمہ بھاگ گئی ہے آپ کے منہ میں۔ اگر مل جائے آپ کے منہ میں، تو وہ جوتے لگاؤں آپ کے منہ میں کہ وہ...... کر دے آپ کے منہ میں۔

۳۔ ایک صاحب کو "you Know" کہنے کی بیماری تھی۔ فرمانے لگے:

(You Know) I want to go for Hajj. My sub-ordinates (you know) will arrange for my Ticket. I will (you know) pray for them for earning moeny of full well.

۴۔ آج کل خواتین ہر جملے کے آخر میں ''نا'' کہنے کی عادی بن رہی ہیں۔ مثلاً مجھے

ہوٹل کا کھانا پسند ہے نا؟۔ ہر روز نیا جوڑا پہننا ضروری ہے نا۔ میں نے اپنے ناخن بڑھالئے ہیں نا (وہ پاک صاف ہوں یا نہ ہوں) کسی کو نوچ سکوں گی نا؟۔

۵۔ میں جب کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی میں پڑھاتا تھا تو میرے ایک محترم ساتھی اکثر اپنے جملے سے پہلے فرمایا کرتے تھے: ''اب سوال آن کر یہ ہے۔'' مثلاً:

اب سوال آن کر یہ ہے کہ میں بازار کب جاؤں؟ اب سوال آن کر یہ ہے کہ بازار جاؤں تو کیا خریدوں؟ میں نے بہت سے بازار دیکھے، لیکن اب سوال آن کر یہ ہے کہ ایسا بازار کہیں نہیں دیکھا۔

۶۔ بعض لوگ ہر جملے میں بولتے ہیں کہ'' آیا آپ کے خیال شریف میں؟'' مثلاً میں بازار گیا تھا، آیا آپ کے خیال شریف میں؟ آج کل گرانی بہت ہے، آیا آپ کے خیال شریف میں؟ پھر بھی لوگ خیال نہیں کرتے، آیا آپ کے خیال شریف میں۔

۷۔ بعض حضرات دعا کے طور پر فرماتے ہیں: ''اللہ آپ کو نیکی دے'' مثلاً لوگ بہت خراب ہیں، اللہ آپ کو نیکی دے۔ میں کچھ خرید کر لاتا ہوں، خدا آپ کو نیکی دے، بچوں کو کچھ نہیں دیتا کہ وہ بڑے ہوکر خود ہی کھاپی لیں گے، اللہ آپ کو نیکی دے۔ وغیرہ۔

۸۔ بعض لوگ ''کیا نام سے'' یا'' کیا نام'' بولنے کے عادی ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ کا نام کیا ہے۔ کیا نام سے، میں اب کہیں نہیں جاؤں گا، کیا نام سے، میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی کیا نام سے۔ وغیرہ۔

۹۔ ایک کرم فرما میرے پاس آتے ہیں۔ وہ ہر موقع پر بولتے ہیں: ''میں اس نتیجے پر پہنچا'' مثلاً: فلاں صاحب مجھ سے ملنے آئے تھے، میں اس نتیجے پر پہنچا۔ آج کل میں بیمار ہوں، میں اس نتیجے پر پہنچا، بچوں کے امتحان کا نتیجہ نکل آیا ہے، میں اس نتیجے پر پہنچا۔

ماشاءاللہ ان صاحب کا نام ہی ''میں اس نتیجے پر پہنچا'' ہوگیا ہے۔

۱۰۔ ہمارے شہر جبل پور میں ایک صاحب کی عادت تھی کہ سلام کے ساتھ'' جنت مقام، دوزخ حرام'' ضرور کہتے تھے۔ لڑکوں نے شرارت سے ایک قافیہ شامل کر دیا تھا۔ یعنی وعلیکم السلام، جنت مقام، دوزخ حرام، آپ کا بیٹا میرا غلام'' وہ صاحب پھر ڈنڈا لے کر لڑکوں کے پیچھے دوڑتے تھے۔

۱۱۔ دو تین شہر ایسے بھی دیکھے۔ جہاں سگے بھائی بہن آپس میں بھی بات کرتے ہیں تو بری بری گالیاں (بے خیالی میں) بکتے جاتے ہیں۔

بعض لوگ بار بار کہتے ہیں ''وہ ہے نا؟''۔ ''جو ہے سو ہے''۔ ''ہو بھیا''۔ ''ہم نے کہ دینی''۔ وغیرہ۔

خدا کرے کہ تکیہ کلام والے لوگ خدا پر تکیہ رکھیں! آمین۔☆

☆ متفرقات۔ ص ۱۰۵

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ

۱۔ غلط عربی لفظ ہے۔ اردو والوں نے ''غلطی'' بنالیا۔ لیکن فارسی اور عربی میں کہیں غلطی لفظ مستعمل نہیں۔

۲۔ راقم الحروف ۱۹۳۷ء میں کنگ ایڈورڈ کالج (امراؤتی، برار) میں پڑھاتا تھا تو وہاں کے میگزین میں میرا ایک مضمون ''ایک موازنہ'' کے نام سے شایع ہوا تھا، اس میں ''فسانہ عجائب'' اور ''سروش سخن'' کا موازنہ تھا۔ ایک صاحب سید یوسف علی شاہ مودودی صاحب نے ۱۹۴۵ء میں لفظ بہ لفظ یہی مضمون اپنے نام سے رسالہ ''امین الادب'' (لوہارو) میں شایع کرادیا۔

۳۔ جب میں اردو کالج کراچی میں پڑھاتا تھا تو بی اے کے طلبہ کے لئے علامہ اقبال کی شاعری پر کچھ حواشی لکھے تھے۔ کچھ دن کے بعد اخبار جنگ کراچی میں یہ تمام حواشی ایک صاحب نے اپنے نام سے شائع کرادیے۔

۴۔ نظیر اکبرآبادی نے (کلیات: صفحہ ۵۴۴) میں ''شروعات'' لفظ استعمال کیا ہے:

لائی ہے جب اپنا یہ شروعات اندھیری
کرتی ہے اجالے کے تئیں مات اندھیری

بعض فصحا نے لفظ ''شروعات'' کو غیر فصیح قرار دیا ہے۔ لیکن پروفیسر حامد حسن قادری صاحب نے ''داستان تاریخ اردو'' میں اسے استعمال کیا ہے۔ (مجھے اب حوالہ یاد نہیں)

۵۔ شورش کاشمیری (مدیرِ چٹان۔ لاہور) کے خلاف میرے شعبۂ اردو کے ایک استاد نے میری طرف سے ایک مضمون شائع کرادیا اور مجھے اطلاع بھی نہیں کی۔ میرے ایک

شاگرد نے مجھے خط لکھا اور دریافت کیا کہ کیا آپ نے وہ مضمون لکھا ہے؟ میں خاموش ہو گیا، کیا عرض کرتا۔

۶۔ ایک مرتبہ راقم الحروف نے اپنی سمجھ کے مطابق امیر مینائی کی ایک ترکیب ''قابل سیون'' پر اعتراض کیا تھا۔ ایک صاحب نے مجھے مولانا احسن مارہروی مرحوم کا شاگرد جانتے ہوئے کہ وہ داغ کے شاگرد تھے، مجھے ''داغی'' کہہ کر اپنا دل خوش کر لیا تھا۔ بعد میں پروفیسر حامد حسن قادری صاحب نے میری اصلاح فرمائی کہ وہ ترکیب ''قابل سوزن'' ہو گی۔

نداۓ سحر

ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان

نداۓ سحر

حضرت ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان

مختلف اسلامی موضوعات پر ریڈیو تقاریر کا قیمتی مجموعہ

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

اے۔۴/۱۷/۴، ناظم آباد نمبر ۴، کراچی۔ ۷۴۶۰۰ فون: ۶۶۸۴۷۹۰

www.zawwaracademy.org

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

Designed & Printed by IMAGINE